دیپک بُدکی فکروفن

ترتیب وتدوین

حماد حبیب اللہ

حماد حبیب اللہ

دیپک بُدکی-فکروفن

دیپک بُدکی کی تصانیف

☆ افسانوں/افسانچوں کے مجموعے:(اردو)

۱)ادھورے چہرے (تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء) ۲)چنار کے پنجے (دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء)

۳)زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۸ء) ۴)ریزہ ریزہ حیات (۲۰۱۰ء)

۵)روح کا کرب (۲۰۱۵ء) ۶)مٹھی بھر ریت [افسانچے] (۲۰۱۵ء)

۷)اب میں وہاں نہیں رہتا (۲۰۱۷ء) ۸)جڑوں کی تلاش (۲۰۱۹ء)

☆ افسانوں کے مجموعے:(ھندی)

۹)ادھورے چہرے (۲۰۰۵ء) ۱۰)چنار کے پنجے (۲۰۱۰ء)

☆ تنقید و تبصرے:

۱۱)عصری تحریریں (۲۰۰۶ء) ۱۲)عصری شعور (۲۰۰۹ء)

۱۳)عصری تقاضے (۲۰۱۳ء) ۱۴)عصری تناظر (۲۰۱۸ء)

۱۵)عصری نقوش (۲۰۱۸ء) ۱۶)ادبی مباحثے (۲۰۱۹ء)

۱۷)جموں و کشمیر کا عصری ادب (۲۰۱۹ء) ۱۸)عصری زاویے (۲۰۱۹ء)

☆ تحقیق:

۱۹)اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار (۲۰۱۶ء)

دیپک بُدکی پر لکھی گئی کتابیں

(۱) دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری (جاوید اقبال شاہ)؛ (۲) ورق ورق آئینہ- دیپک بدکی: شخصیت اور فن (پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری)؛ (۳) دیپک بُدکی- فکر و فن (حماد حبیب اللہ مانجی)

ملنے کا پتہ: (۱) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۹۱، وکیل سٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی-۱۱۰۰۰۶
(۲) میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، بٹہ مالو، بالمقابل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز، سرینگر، کشمیر-۱۹۰۰۰۹

دیپک بُدکی۔فکروفن

ترتیب وتدوین

حماد حبیب اللہ ماٹجی

میزان پبلشرز و ڈسٹربیوٹرس

بالمقابل فائر اینڈ ایمر جنسی سروسز ہیڈ کوارٹرس

بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر۔ ۱۹۰۰۰۹

نام کتاب : دیپک بُدکی۔فکروفن
ترتیب و تدوین: حماد حبیب اللہ ماٹجی
پتا : ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی؛ **موبائل**:7006256022
ای میل : hamaadhabibullah@gmail.com
قیمت : درون ملک:-/۲۵۰ روپے (دوسو پچاس روپے) ؛ بیرون ملک: دس ڈالر
اشاعت : پہلا ایڈیشن-۲۰۱۹ء
ناشر : میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، بالمقابل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈکوارٹرس، بٹہ مالو، سرینگر کشمیر-۱۹۰۰۰۹

÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷

DEEPAK BUDKI - FIKR-O-FUN

Compiled & Edited by: Hamaad Habibullah Matji

Price: Inland:Rs 250.00, Foreign: $10

Meezan Publishers & Distributors,

Opposite Fire & Emergency Services Hqrs,

Batamaloo, Srinagar, Kashmir-190009

Tel: Off: 0194-2470851 Fax:2457215

Mobile : 9419002212; 8494002212

email : meezanpublishers@rediffmail.com

فہرست

مکالمے

مضامین

تبصرے:

تجزیے

تاثرات

☆☆

پیش لفظ

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں کشمیرنژاد افسانہ نگار، سوانح نگار، تنقید وتحقیق نگار جناب دیپک بُدکی کی ادبی کاوشوں پر مختلف ادیبوں اور نقادوں کے لکھے ہوئے مضامین وتبصرے اکٹھے کر کے انھیں کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں ۔ بُدکی صاحب عالمی سطح پر اردو حلقوں میں کافی مقبول ہیں اور افسانہ نگاری میں اپنا لوہا ہر لحاظ سے منوا چکے ہیں ۔ یوں تو مجھے ان سے غائبانہ تعارف ان کی نگارشات کے ذریعے ہوتا رہتا تھا مگر ان کی تصانیف کے ناشر جناب شبیر احمد کی وساطت سے اچھی طرح تعارف ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ باتوں باتوں میں ان پر لکھے گئے مشاہیرِ ادب کے تاثرات کا ذکر ہوا اور مجھے معلوم ہوا کہ ان کے فن پر کئی مضامین اور کتابوں پر کئی ریویو رقم ہوئے ہیں جو مقامی وغیر مقامی اخبارات اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں مگر اب تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ہیں ۔ اس لیے میں نے یہ کام سرانجام دینے کی ٹھان لی اور ان سے نہ صرف اجازت مانگی بلکہ ان سے اس بارے میں کافی مدد بھی لی ۔ اس ضمن میں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ انھوں نے ہر چیز قرینے سے سنبھال کر رکھی ہے اور مجھے اس بارے میں کوئی زیادہ محنت ومشقت نہیں کرنی پڑی ۔

اس سے پہلے بھی ان پر اس نوعیت کا کام ہو چکا ہے ۔ معتبر رسالوں کے کئی گوشے اور خصوصی نمبر شائع ہو چکے ہیں جن میں ان کی شخصیت اور فن پر مختلف ادیبوں اور نقادوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(۱) ماہنامہ شاعر ممبئی ، (گوشۂ دیپک بُدکی) ، ضخامت ۱۹/صفحات ، جلد ۷۵ شمارہ ۹؛

ستمبر۲۰۰۴ء

(۲) سہ ماہی انتساب ،سرونج ،مدھیہ پردیش (گوشۂ دیپک بُدکی)، ضخامت ۹۰ر صفحات، جلد ۲۵ شمارہ ۶۳؛ سن ۲۰۰۶ء

(۳) سہ ماہی اسباق پونے ، (گوشۂ دیپک بُدکی)، ضخامت ۱۵۱رصفحات، جلد ۲۷؛ جولائی-ستمبر ۲۰۰۷ء

(۴) سہ ماہی انتساب عالمی سرونج ، (دیپک بُدکی نمبر)، ضخامت ۳۶۴رصفحات، جلد ۴ شمارہ ۳، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

مذکورہ بالا رسالوں کے علاوہ دیپک بُدکی کی حیات اور کارناموں کے حوالے سے ایک کتاب 'ورق ورق آئینہ [دیپک بُدکی-شخصیت اور فن]' کے عنوان سے منظر عام پر آچکی ہے جس کی ترتیب وتدوین پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈائریکٹر، سنٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو، جموں یونیورسٹی ، ڈاکٹر فرید پربتی ،ایسوسی ایٹ پروفیسر، اقبال انسٹی ٹیوٹ (کلچر اینڈ فلاسفی)، کشمیر یونیورسٹی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری ،شعبۂ اردو، ایم ایس یونیورسٹی بڑودہ (گجرات) نے کی ہے۔ اس کتاب کی ضخامت ۳۸۴ رصفحات ہے اور اس کو بھی میزان پبلشرز سرینگر نے اپریل ۲۰۰۹ء میں شائع کیا ہے۔اس طرح میری یہ کوشش اسی زنجیر کی ایک اور کڑی ہے۔

میں ان سب مضمون نگاروں ،تبصرہ نگاروں اور مشاہیرِ ادب کا تہہ دل سے شکر یہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے بُدکی صاحب کی تخلیقات پر پر خلوص خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اکثر و بیشتر نگارشات ایسی ہیں جن میں قلم کار نے بدکی صاحب کی متعلقہ تخلیق کا دقیقہ ریزی سے مطالعہ کیا ہے اور اس کے بعد ہی اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔

اس کتاب کو چار حصوں میں بانٹا گیا ہے ۔ پہلی فصل میں دیپک بُدکی کے انٹرویو

(مکالمے) شامل کیے گئے ہیں، دوسری میں ان کے فن سے متعلق تنقیدی مضامین شامل ہیں، تیسری فصل میں ان کی کتابوں پر رقم کیے گئے تبصرے شامل ہیں جبکہ چوتھی و آخری فصل میں بُد کی صاحب کے افسانوں سے متعلق مشاہیر اور قارئین کی آرا شامل کی گئی ہیں۔ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ مضمون یا تبصرے کے آخر میں اس رسالے یا اخبار کا حوالہ دیا جائے جس میں وہ شائع ہوا تھا۔

اس کتاب کی تدوین و ترتیب میں کئی مہربانوں نے مدد فرمائی۔ سب سے پہلے تو میں خود دیپک بُد کی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اپنی لائبریری کی کتابیں اور اخباروں و رسالوں کے تراشے دستیاب کیے جن سے مجھے کافی مدد ملی۔ دوسرے میں شبیر احمد صاحب، مالک میزان پبلشرز اور ڈسٹری بیوٹرس، بٹہ مالو سرینگر کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ کام انجام دینے کی ترغیب دی اور ہر مرحلے پر، جہاں مجھے ان کی ضرورت پڑی، رہنمائی کی۔ میں کمپوزر اور تزئین کار کا بھی شکرگزار ہوں جنھوں نے اپنی تن دہی سے اس کتاب کی کمپوزنگ کی اور اس کے سرورق کو دیدہ زیب بنایا۔

مجھے امید ہے کہ میری یہ پہلی کوشش کامیاب رہی ہوگی۔ مجھے قارئین کی آرا کا انتظار رہے گا۔

سرینگر، کشمیر-۱۹۰۰۰۹ — حماد حبیب اللہ مانجی

۷/ستمبر ۲۰۱۹ء

نظم

-احمد علی برقیؔ اعظمی

ایک معروف قلمکار ہیں دیپک بدکی
داد و تحسین کے حقدار ہیں دیپک بدکی

اُن کے فکشن میں حقیقت کی جھلک ملتی ہے
گردشِ وقت کی رفتار ہیں دیپک بدکی

اپنے جذبات کا کرتے ہیں وہ کُھل کر اظہار
وقت سے برسرِ پیکار ہیں دیپک بدکی

جس کا اظہار ہے مشترکہ ثقافت اپنی
اُس روایت کے پرستار ہیں دیپک بدکی

خودنوشت ان کی ہے جذبات کی ان کے عکاس
جس کے ہر نقش کے کردار ہیں دیپک بدکی

آج میرٹھ میں جو اعزاز ملا ہے اُن کو
اُس کے حقدار تھے حقدار ہیں دیپک بدکی

قدرداں اُن کے محاسن کا نہ کیوں ہو برقیؔ
ناظر کوچہ و بازار ہیں دیپک بدکی

☆☆☆

» فکشن نگار دیپک بدکی کو شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کی طرف سے منظر کاظمی نیشنل ایوارڈ ملنے پر منظوم تاثرات

ڈاکٹر منظر کاظمی ایوارڈ برائے فکشن ملنے پر...

-دیپک بُدکی

مجھے اس بات کی انتہائی خوشی ہو رہی ہے کہ شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ نے امسال ۱۷ویں یوم تاسیس کے موقع پر مجھے ڈاکٹر منظر کاظمی ایوارڈ برائے فکشن سے نوازا ہے۔ ادبی خدمات کے حوالے سے یہ میرا پہلا ایوارڈ ہے، اس لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میں ایوارڈ کمیٹی کا بے حد شکر گزار ہوں۔

اردو ادب میں افسانے اور ناول کا چلن بیسویں صدی کے آغاز یا اس سے تھوڑا سا پہلے شروع ہوا۔ صنف افسانہ نے بہت تیزی سے ارتقا کی منزلیں طے کر لیں اور ایک ہی صدی میں دنیا کے بہترین ادب میں اپنی جگہ بنالی جس کی مثالیں منٹو کے ٹوبہ ٹیک سنگھ، پریم چند کے کفن، کرشن چندر کے ان داتا اور سریندر پرکاش کے بجوکا سے ملتی ہیں۔ اس سفر میں کئی ادوار آئے اور اپنی چھاپ چھوڑ کر چلے گئے مثلاً اسطوری، رومانی، حقیقت پسند، ترقی پسند، فرائیڈین، جدید دور (Modernism) اور مابعد جدید دور (Post Modernism) البتہ سچ تو یہ ہے کہ ترقی پسند دور اردو فکشن کا 'سنہری دور' رہا ہے جس میں افسانوی ادب بام عروج پر پہنچ گیا۔ میرا ماننا ہے کہ ادب کی نشو ونما ایک پیڑ کی مانند ہوتی ہے جس کی جڑیں اپنی زمین، کلچر اور تہذیب میں پیوست رہتی ہیں اور جوں جوں پیڑ بڑھتا جاتا ہے وہ نئی نئی شاخیں نکالتا رہتا ہے اور پھول اور پھل دیتا رہتا ہے۔ تاہم اس کی نشو ونما کے لیے اس کی جڑوں کا اپنی زمین میں ہونا ضروری ہے۔ اردو ادب میں بھی ہمیشہ اپنی مٹی کی مہک رہی ہے گو اس نے ارتقا کے دوران مشرقی و مغربی ہر دو تہذیبوں سے اثرات قبول کیے ہیں۔

عصر حاضر میں اردو ادب ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اسے وجودی کشمکش کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ عدیم الفرصتی، ذرائع ابلاغ، سوشل میڈیا اور دیگر سیاسی مسائل کے پیش نظر اردو پڑھنے والوں خاص کر ادب پڑھنے والوں میں کمی ہوتی جارہی ہے۔ حالانکہ ترقی بورڈ اور اکادمیاں اس کے پھیلاؤ کے لیے کوشاں رہتی ہیں لیکن زمینی حقیقت کچھ اور ہی بیان کرتی ہے۔ رسالے ایک روز نکلتے ہیں اور دوسرے روز بند ہوجاتے ہیں کہ انھیں قارئین کی سرپرستی نہیں ملتی۔ قلم کار حضرات آئے دن مصیبتوں کا سامنا کرتے ہیں جن سے آپ اور میں بھی بخوبی واقف ہیں۔ ادیبوں کی کسمپرسی موجودہ دور کا ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس سنہری دور میں بھی یہ مسئلہ تھا جب کرشن چندر کی طوطی بولتا تھا۔ پریم چند، سدرشن اور اوپندر ناتھ اشک کو مالی وجوہات کی بنا پر ہندی ادب میں پناہ لینی پڑی۔ اس کے باوجود اردو ادب میں قلم کے مزدور نہ تھکے، نہ رکے اور نہ آہ وزاری کی بلکہ اب تک تندہی سے لکھتے رہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان سبک روی سے ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا مگر کچھ مسئلے ایسے ہیں جن پر قابو نہیں پایا جاسکا مثلاً غربت، بے روزگاری، بڑھتی آبادی، مہنگائی اور بھوک مری۔ آج بھی غریب لاچار کسان کبھی سوکھے کی چپیٹ میں آتا ہے اور کبھی سیلاب کی۔ موجودہ دور میں مہاجن اور ساہوکار تو نہیں ہیں مگر بنک کا قرضہ نہ چکانے کے لیے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے جبکہ سرمایہ دار بنکوں کو کروڑوں کا چونا لگا کر بھاگ جاتے ہیں۔ دوسری جانب ترقی اور گلوبلائزیشن اپنے ساتھ کچھ نئی مصیبتیں لے کر وارد ہوگئیں۔ گاؤں سے شہروں کی طرف انخلا، کنبوں کی پراگندگی، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، سماجی بھید بھاؤ، فرقہ وارانہ فسادات، طبقاتی استحصال، دہشت گردی، عدم تحفظ، کرپشن اور کنبہ پروری چند مثالیں ہیں۔ اُدھر بین الاقوامی سطح پر امریکی جارحیت اور یک قطبی دنیا نے ہلچل مچا رکھی ہے۔ ترقی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی الجھنیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ جنسی بے راہ روی اور اقدار کا تنزل ہمارے دور کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ ان سبھی مسئلوں پر موجودہ فکشن نگار اپنے خیالات کا اظہار اپنے افسانوں اور ناولوں میں کر رہے ہیں۔

اب تک میرے سات افسانوی مجموعے، ایک تحقیقی کتاب اور سات تنقیدی مضامین و تبصروں پر مبنی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ میری سوانح عمری بعنوان 'لوح حیات' حال ہی میں منظر عام پر آ چکی ہے۔ مزید ایک افسانوی مجموعہ اور ایک مضامین و تبصروں پر مبنی کتاب زیر اشاعت ہے۔ جہاں تک میرے افسانوں کا سوال ہے میں نے تقریباً ۱۳۰ر افسانے قلم بند کیے ہیں۔ ان میں جغرافیائی اور موضوعاتی تنوّع ملے گا۔ ایک طرف کشمیر کے حوالے سے افسانے ملیں گے تو دوسری طرف شمال مشرقی ریاستوں میگھالیہ، اروناچل اور تریپورا کے تناظر میں رقم کیے گئے افسانے ملیں گے۔ شمال میں دہلی جیسے میٹرو پولیٹن شہر کی کہانیاں ملیں گی تو جنوب میں بنگلورو جیسے موڈرن میٹرو کے قصے بھی ملیں گے۔ غرض میں نے جہاں بھی ملازمت کی وہاں کے معاشرے کا مشاہدہ کر کے افسانے قلمبند کیے ہیں۔ میری کہانیوں کے موضوعات میں بھی بوقلمونی ملے گی۔ میرے افسانے عام طور پر تین زمروں میں بانٹے جاسکتے ہیں۔ (۱) کشمیر سے جڑے افسانے (۲) نفسیاتی و جنسیاتی افسانے (۳) سماجی و سیاسی افسانے۔ کشمیر سے متعلق میرے بہت سارے افسانے اس مسئلے پر مرکوز ہیں جس مسئلے کا کشمیری عوام سامنا کر رہی ہے۔ اس جنت بے نظیر کو سیاسی کارستانیوں نے دوزخ بنا دیا ہے۔ ایک جانب وہ لوگ ہیں جو وہاں پر آئے دن کی دہشت گردی اور حفاظتی فوج کی کارروائیوں سے جوجھ رہے ہیں اور دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو ۱۹۹۰ء میں اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ دونوں کے مسائل الگ الگ ہیں اور ان کو سمجھنے کی بہت ضرورت ہے۔ نفسیاتی و جنسیاتی افسانے میں نے کیس اسٹڈیز کا مشاہدہ کر کے تخلیق کیے ہیں اس لیے ان میں حقائق کا اتنا ہی عمل دخل ہے جتنا تخیل کا۔ اسی طرح سماجی و سیاسی افسانے بھی گہرے مشاہدے کی دین ہیں۔ سماجی اور سیاسی مسائل پر کہیں کہیں مذہبی رنگ بھی چڑھا ہوا ہے کہ کس طرح مذہب کی آڑ میں غریب عوام کی زندگیوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ میرا سفر ابھی جاری ہے اور میری کوشش یہ رہے گی کہ جب تک سانس باقی ہے تب تک کچھ نہ کچھ تخلیق کرتا رہوں۔

آخر میں میں پروفیسر اسلم جمشید پوری اور شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کا ایک

بار پھر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی اور اپنی محبتوں سے نوازا۔

☆☆☆

٭ شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے ۱۷ ویں یوم تاسیس کے موقع پر اور ڈاکٹر منظر کاظمی ایوارڈ برائے فکشن ملنے پر دیپک بُدکی کی تقریر۔

دیپک بُد کی سے ایک مکالمہ

-سید تحسین گیلانی

(مدیر انہماک انٹرنیشنل (پاکستان) وفورم عالمی اردو فکشن)

(س ا) ادب کیا ہے؟ یہ بنیادی سوال ہے اس پر تفصیلی بات کریں تو ہم آگے بڑھیں۔

(ج ا) ادب کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ وقت کے ساتھ اس کے معنی بدلتے رہتے ہیں۔شروعات تو تفریح سے ہوئی، جستہ جستہ اس میں شجاعت، جمالیات، پند و نصائح اور سیاسی و سماجی آگاہی کے عنصر شامل ہوتے رہے۔عام طور پر خیالات کو سنجیدہ، منظم اور شایستہ طریقے سے ظاہر کرنے کو ادب کہا جاتا ہے تاکہ اس سے جمالیاتی، بصارتی و بصیرتی حظ حاصل ہو۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے اس کی جڑیں قدیم ہندستانی تہذیب و تمدن میں پیوست ہیں جس میں وقتاً فوقتاً مختلف تہذیبوں کا انجذاب ہوتا رہا اور اسی کو عام طور پر گنگا جمنی تہذیب کا نام دیا گیا ہے۔ سنسکرت، پراکرت اور مختلف علاقائی زبانوں کے ساتھ فارسی، عربی اور ترکی کی آمیزش نے اس شیریں زبان کے ادب کو آراستہ کیا۔اردو ادب کی شعری و داستانوی روایت بھی اسی ملواں تہذیب کی دین ہے۔البتہ ہندستان میں انگریزی کے رائج ہونے کے بعد صورت حال بدل گئی اور مغربی اصناف نے اردو ادب کو کافی متاثر کیا۔آگے چل کر عالمی ادب نے بھی اردو زبان و ادب پر اپنا اثر چھوڑا۔انیسویں صدی کے آخر میں اردو ادب نے چند مغربی اصناف جیسے ڈرامہ، ناول اور افسانہ کو والہانہ طور پر اپنایا۔ ڈرامہ کے لیے مشرقی ماحول راس نہ آیا کیونکہ اسلام میں مذہبی و تلمیحاتی کرداروں کو پیش کرنے کی ممانعت ہے اور یہاں تھیئٹر جانے کا وہ چلن نہیں ہے جو مغربی ممالک میں ہے۔تاہم رامائن، مہابھارت وغیرہ کو سٹیج پر پیش کرنے کا چلن ہندستان میں صدیوں سے رہا

ہے جس میں اردو زبان نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اِدھر پارسی تھئیٹر اور آغا حشر کاشمیری کی کوششیں رنگ لائیں اور اُدھر ترقی پسند دور میں اپٹا کے عوامی تھئیٹر اور پھر نکڑ ناٹکوں کے ذریعے اردو میں ناٹک اور ڈرامہ کی کچھ ترقی درج کی گئی۔ بہ ایں ہمہ یہ صنف مغربی بلندیوں کو نہیں چھو سکی۔ بعد میں فلم اور ٹیلی ویژن نے بھی ان کاوشوں کے پھلنے پھولنے پر قدغن لگا دی۔ ناول کا ابتدائی دور دھما کے دار رہا۔ مرزا ہادی رسوا، ڈپٹی نذیر احمد اور خاص طور پر پریم چند نے اردو ادب کو اپنے ناولوں سے مالا مال کر دیا۔ کرشن چندر کے یہاں بھی ناولوں کی طرف کافی رجحان ملتا ہے مگر رسالوں اور اخبارات نے ہمیشہ مختصر افسانوں کو ترجیح دی۔ فکشن نگاروں کو پرنٹ میڈیا کا یہ رویہ پسند آیا کیونکہ افسانہ نگاری میں وہ محنت، تسلسل، ارتکاز اور توجہ درکار نہیں ہوتی جو ناول نگاری کے لیے ضروری ہے۔ پھر بھی وقتاً فوقتاً معیاری ناول سامنے آتے رہے جیسے کرشن چندر کا 'شکست'، رامانند ساگر کا 'اور انسان مر گیا'، شوکت صدیقی کا 'خدا کی بستی'، عبداللہ حسین کا 'اداس نسلیں'، انتظار حسین کا 'بستی'، خدیجہ مستور کا 'آنگن'، انور سجاد کا 'خوشیوں کا باغ'، قدرت اللہ شہاب کا 'یا خدا'، بانو قدسیہ کا 'راجہ گدھ'، انیس ناگی کا 'دیوار کے پیچھے'، جوگندر پال کا 'نادید'، نند کشور وکرم کا 'انیسواں ادھیائے'، رتن سنگھ کا 'دربدری'، کشمیری لال ذاکر کا 'ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی'، پیغام آفاقی کا 'مکان'، مشرف عالم ذوقی کا 'بیان'، عبدالصمد کا 'دو گز زمین'، صلاح الدین پرویز کا 'نمرتا'، شمس الرحمٰن فاروقی کا 'کئی چاند تھے سر آسماں'، شموئل احمد کا 'مہاماری'، غضنفر کا 'دویہ بانی'، حسین الحق کا 'فرات'، رحمٰن عباس کا 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' وغیرہ۔

اس کے برعکس افسانہ نگاری نے گزشتہ صدی میں جنم بھی لیا، مختلف ارتقائی منزلیں بھی طے کر لیں، اوج کمال کو بھی پہنچ گیا اور پھر ناقدوں نے اس کی موت کا اعلان بھی کر دیا۔ یہ سفر ایک ہی ڈگر پر گامزن نہیں رہا۔ شروعاتی دور میں افسانہ رومانویت سے بھرپور رہا جس کے حامی سجاد حیدر یلدرم سکول کے پیروکار تھے۔ ان افسانوں میں افلاطونی عشق، جن و پری اور شہزادوں و شہزادیوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے ساتھ ہی اصلاحی ادب سامنے آیا جس کا مدعا ناولوں اور افسانوں

کے ذریعے اخلاقیات کا درس دینا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری، عبدالحلیم شرر وغیرہ کے یہاں ایسی تحریریں ملتی ہیں۔ اس دور میں زبان کی صنعت، بلاغت وسلاست پر زور دیا گیا۔ اِدھر پریم چند نے حقیقت پسند سکول کی بنیاد ڈالی جو اس کے بے شمار پیروکاروں نے اپنایا۔ افسانے وناول زمینی حقیقت سے جڑتے گئے جن میں تصوراتی دخل اندازی کافی حد تک محدود رہی تاہم افسانوں کو محض رپورتاژ بننے سے بچایا گیا اور گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسانوں کا بطور کردار انتخاب کیا گیا۔ ان میں اکثریت گاؤں کے کسانوں، بے زمین دیہی مزدوروں، پسماندہ کاریگروں اور لٹی پٹی عورتوں کی تھی۔ ماورائی قصوں اور واردات سے پرہیز کیا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں 'انگارے' کے شائع ہونے اور پھر ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کانفرنس کے انعقاد ہونے سے ایک نئے دور یعنی 'ترقی پسند دور' کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے سبب اظہار میں کھلے پن، جذباتیت اور خطابت کا رجحان شامل ہوا۔ افسانہ گاؤں سے نکل کر شہروں کی زندگی کی عکاسی کرنے لگا، اکثر کردار غریب اور پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے مفلوک الحال مزدور اور کاریگر تھے یا پھر گاؤں کے کسان اور بیگار دیہی مزدور اور سماج کی ٹھکرائی ہوئی بے بس عورتیں، خصوصاً طوائفیں، تھیں۔ اس دور میں انفرادیت کے بدلے اجتماعیت کو ترجیح دی گئی اور طبقاتی یا گروہی سطح پر لوگوں کو منظم کرنے کی زیریں کوشش کی گئی۔ اسلوب بدستور بیانیہ اور وضاحتی تھا، زبان عام فہم، سلیس اور بغیر کسی تصنع کے تھی۔ قارئین کو قلم کار کا نظریہ سمجھنے میں کوئی خاص مشقت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ یہ طرز انداز بہت ہی مقبول ہوا اور ابھی تک استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ ترقی پسندوں میں ایک ایسا گروپ بھی سامنے آیا جنھوں نے تحریک کے ڈانڈے مارکسی نظریے کے ساتھ براہ راست جوڑ دیے اور اس کی تبلیغ زور وشور سے کرتے رہے جس کے باعث قارئین ان کی تحریروں سے بدظن ہوگئے جس کا بھرپور فائدہ امریکی امداد پر پلنے والی مذہبی کٹر پرست لابی نے اٹھالیا۔

بیسویں صدی میں تین یہودیوں نے علمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ نام تھے آئنسٹائن، مارکس اور فرائیڈ۔ ان تینوں رجحانات کا اثر ادب پر پڑا۔ ترقی پسندی کے متوازی فرائیڈین نظریے کا کافی

اثر اردو افسانوں پر ثبت ہوا جس کی شروعات منٹو نے کی۔ اس سکول کے افسانہ نگاروں نے انسانی مسئلوں اور الجھنوں کو نفسیاتی پس منظر میں دیکھنا شروع کیا اور تحلیل نفسی کو آلۂ کار بنایا۔ فرانسیسی افسانہ نگاروں مثلاً ساد (Sade) اور مسوک (Masoch) کے نظریات کی تقلید کی گئی اور جنس و جنسی کجرویوں پر افسانے قلمبند کیے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء کے آس پاس مغربی ادب کی نقالی میں ایک نئے دور، دورِ جدیدیت (Modernism) کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے کہ جدیدیت پر کچھ کہوں، یہاں میں اس بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ مغربی لٹریچر میں جو بھی تجربات ہوئے، خالص ادبی تحریکات نہیں تھیں بلکہ آرٹ کی دنیا کا شاخسانہ تھا۔ نشاۃ الثانیہ اور صنعتی انقلاب کے بعد مصوری میں کئی طرح کے انقلابات آئے، جیسے ریئلزم (حقیقت پسندی)، سکپٹیسزم (تشکیک)، ماڈرنزم (جدیدیت)، وجودیت، ایبسٹریکٹ (تجریدیت) کیوبزم، دادازم، پوسٹ ماڈرنزم (مابعد جدیدیت) وغیرہ۔ یہ انقلابات نہ صرف فرد کی اجتہادی سوچ و فکر کا نتیجہ تھے بلکہ اجتماعی اتھل پتھل کا بھی ثمرہ تھے۔ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم نے یوروپ کو تہس نہس کر دیا تھا۔ وہاں کے مفکر، مصور اور قلم کار ایک ایسے وجودی انشقاق سے گزرے تھے کہ ان کی سوچ ہر اس سوچ کی نفی کرتی رہی جو ان کو ورثے میں ملی تھی۔ اسی تشکیکی عمل نے کئی نئے نظریات کو جنم دیا۔ اس کے برعکس مشرقی معاشرہ اپنی جڑوں میں اتنا پیوست رہا کہ عالمی انقلابات کا براہ راست اثر قبول نہیں کر پایا۔ ترقی پسند تحریک کے بعد مشرقی معاشرے خصوصاً ہندستانی معاشرے میں کوئی وجودی مسئلہ سامنے نہیں آیا۔ گو تقسیم وطن ایک بہت بڑا سانحہ سامنے آیا تھا پھر بھی برسوں کی غلامانہ ذہنیت اور تقدیر پرستی کے سبب متاثرہ لوگوں نے اس سانحہ کو جذب کر لیا اور کسی اجتماعی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ تقسیم وطن نے سرحد کی دونوں طرف 'مہجری ادب' کو جنم دیا اور کرشن چندر، انتظار حسین، منٹو، عبداللہ حسین، شوکت صدیقی، راما نند ساگر جیسے ادیب سامنے آئے۔ انھوں نے انسانی بربریت، وحشیت اور بہیمیت کو پیش کیا اور امن و آشتی پر زور دیا مگر ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی جس کو کوئی سننے والا نہ تھا۔ دونوں ممالک تب سے لشکر کشی میں مبتلا ہیں یہاں تک کہ آپس

میں چار جنگیں لڑ چکے ہیں۔

مذکورہ پس منظر میں دیکھا جائے تو جدیدیت پوری طرح سے ایک خارجی تصور تھا جو اردو ادیبوں نے اپنا لیا اور آٹھویں دہائی تک اسے نبھاتے رہے۔ اس میں وجودی کشمکش، بے بسی، بے چہرگی اور تنہائی شامل رہی۔ اجتماعیت کی جگہ انفرادیت نے لے لی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مشرق میں انسان خارجی دنیا کے بدلے داخلی دنیا کو زمانہ قدیم سے کھنگالتا رہا ہے اور یہاں کے مفکروں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ اس میں انھیں ایک اپنائیت سی محسوس ہوئی کہ جاتک کتھاؤں اور گوتم بدھ سے منسوب کہانیوں میں بھی یہی سب کچھ بیان کیا گیا تھا۔ اتنا ضرور ہے کہ اس دور میں علامتی اظہار پر زور دیا گیا، کنایات، استعارات اور تلمیحات کا خوب استعمال ہوا اور کھلے اظہار اور بیانیہ سے انحراف کیا گیا۔ اس میں دو طرح کے قلم کار سامنے آئے، ایک وہ، جو علم کا سمندر پار کر چکے تھے اور نئی راہیں کھوجنے میں سرگرداں تھے اور دوسرے وہ، جو بگڑا شاعر مرثیہ گو کی مانند بحرِ علم کو دیکھتے ہی گھبرانے لگے اور اوٹ پٹانگ علامتوں کو وضع کر کے جدید تحریریں اوکتے رہے۔ آخر الذکر ادیبوں کی اکثریت نے جدید طرزِ تحریر کو بدنما بنا دیا۔ افسانہ نگار اور قاری کے درمیان ترسیل کی خلیج نمودار ہو گئی اور کہانی چیستاں بن کر رہ گئی۔ ورنہ دیکھا جائے آج بھی دورِ جدید کے کئی کہانی کاروں جیسے بلراج مین را، سریندر پرکاش اور انتظار حسین کی بیشتر کہانیاں دل کو موہ لیتی ہیں۔ مشہور و معروف فکشن نگار قرۃ العین حیدر نے اسی دور میں ہئیت کے تجربے کیے اور شعور کی رو کو اپنا کر فکشن کے نئے افق تلاشے۔ جدیدیت سے بدگمانی کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ ہندستان میں اردو مسلمانوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ مسلمانوں کا طبقۂ اشرافیہ اپنے بچوں کو انگریزی میں تعلیم دلوانے کا خواہشمند رہا ہے تاکہ وہ زندگی میں کسی سے کم پایہ نہ رہیں۔ اس طرح اردو میں تعلیم پانے والے طلبا کی ذہنی نشو و نما اتنی نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہیے۔ نتیجتاً وہ نہ تو ایسی تحریروں سے محظوظ ہوتے ہیں جن میں علامتی اظہار ہو اور جو سوچنے پر مجبور کرے اور نہ ہی ان کا مطالعہ کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکی اور آٹھویں دہائی میں دم توڑ دیا۔ پھر ایک اور دور کا

آغاز ہوا جس میں نہ صرف کہانی کی واپسی ہوئی بلکہ بیانیہ کو از سر نو اپنایا گیا اور علامتوں اور کنایوں کو خیر باد کہا گیا۔ چنانچہ مغرب میں اسی دوران ماڈرنزم کی جگہ پوسٹ ماڈرنزم (Post Modernism) نے لی تھی اس لیے اسی حوالے سے اس دور کو 'مابعد جدید دور' کا نام دیا گیا۔ حالانکہ اس حوالے سے بحثیں چلتی رہیں کہ متن اور قلم کار کا باہم تفاعل کتنا رہنا چاہیے اور قلم کار خود کو کس حد تک تحریر میں شامل رہنا چاہیے۔ ایسے ہی چند رجحانات کو ساختیات ، پس ساختیات ، تشکیلیت اور ردِ تشکیل کا نام دیا گیا جن کی معنویت میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب میں صرف اتنی ہے کہ سیمناروں میں ان پر پرچے پڑھے جاتے ہیں۔

(س۲) کیا اردو فکشن میں نئے تجربات ممنوع ہیں؟ عموماً ہمارا فکشن نگار کلاسیکی روایت سے جڑا ہے اور وہ خود کو بس منٹو، عصمت ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ کوئی نئی سمتوں کے سراغ کا خواہاں نہیں۔ کیا یہ مثبت سوچ ہے؟

(ج۲) میں ایسا نہیں سمجھتا۔ ہر زبان کی اپنی ایک حرکیات ہوتی ہے جو اس کے کلچر سے وابستہ ہوتی ہے۔ جس رفتار سے کلچر کے اقدار بدلتے رہتے ہیں اسی رفتار سے زبان میں بھی بدلاو آتا رہتا ہے۔ اس بات سے بھی میں اتفاق نہیں کرتا کہ ہم عصمت اور منٹو سے آگے نہیں بڑھے۔ ہاں اس حد تک متفق ہوں کہ آج بھی ہم فرائیڈ کی نقالی کرنے والے جنس پرست قلم کاروں سے محظوظ ہوتے ہیں مگر اپنے چہروں پر ماسک لگا کر چھپانا پسند کرتے ہیں۔ مشرقی خواتین تو دور، کئی مغرب میں رہنے والی خواتین افسانہ نگار بھی شہوت سے بھرپور منٹویوں سے محظوظ ہوتی رہتی ہیں مگر منٹو کو تعیش پسند اور فحش نگار قرار دیتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ ہمارا افسانہ ترقی پسندی اور فرائیڈین تحریکوں سے آگے نکل کر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تقلید کرتا رہا ہے، فرق صرف اس بات کا ہے کہ یہ سب مغرب کی نقالی میں ہو رہا ہے چونکہ ہمارا معاشرہ نقالی میں مہارت رکھتا ہے، چاہے وہ سائنس کا میدان ہو یا پھر آرٹ کا میدان، اس لیے خود کوئی تحریک پیدا کر سکا نہ اس کو اپنا سکا حالانکہ مواقع کئی بار آئے جیسے تقسیم وطن، جنگ و جدل کا مسلسل ماحول وغیرہ۔

(س۳) افسانہ/ کہانی افتراق پر آپ کیا کہیں گے۔ کیا افسانہ، خام کہانی میں نہاں حکمت کی بازیافت کا نام ہے؟

(ج۳) میں ان کو مترادف الفاظ کے طور پر ہی استعمال کرتا رہا ہوں۔ ہاں یہ بات بھی ہے کہ کہانی قدیم ادب میں کتھا یا حکایت کے طور پر بھی استعمال ہوئی ہے جب کہ افسانہ اب مختصر افسانہ (Short story) کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جو مغرب کی دین ہے اور انھیں اصولوں پر پرکھا جاتا ہے۔ افسانہ ایک ایسی صنف ہے جس نے بیسویں صدی کے اوائل سے اردو قارئین کو سحر زدہ کیا ہے اور ابھی بھی کر رہا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ایک تو اردو قارئین اختصار پسند ہیں جو ان کی غزل کی رغبت سے ظاہر ہے اور دوسرے یہ کہ آج کل پرنٹ میڈیا بھی افسانے کو ہی ترجیح دے رہا ہے۔ اب تو سوشل میڈیا نے مختصر کو اور بھی مختصر کر دیا ہے۔ چند نقادوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ افسانے کی موت آ چکی ہے مگر مجھے ایسا کچھ نہیں لگتا البتہ اردو زبان و ادب کی سکڑتی مقبولیت پر فکر مند ہوں۔

(س۴) کیا اردو ادیب کو ۱۹۳۶ء والے بیانیے سے چپکا رہنا ہے یا کچھ نیا سوچنے کے بجائے پلٹ پلٹ کر واپس وہیں آنا ہے جیسا کہ ۱۹۶۰ء کے بعد ایک بار پھر یہ نعرہ لگا تھا کہ بیدی منٹو کا بیانیہ واپس لایا جائے کہ علامتی اور تجریدی اسلوب کمزور پڑ گیا ہے۔ جس پر انتظار حسین نے کہا تھا کہ اگر حقیقت نگاری کی طرف واپس آنا ہے تو افسانہ نگار کوئی اسلوب یا کوئی ایسی طرز دریافت کریں جو پہلے سے مختلف ہو۔ لیکن ایسا ہوا نہیں شاید؟

(ج۴) میں سائنس کا طالب علم رہا ہوں اور ڈارون کے نظریۂ ارتقا کا ماننے والا۔ ادب بھی ارتقائی منزلوں سے گزرتا رہتا ہے چاہے وہ اس کی اندرونی محرکات کی وجہ سے وقوع پذیر ہو یا پھر بیرونی اثرات کے سبب۔ ارتقا میں دو طرح کے ٹرینڈ ہوتے ہیں پروگریسیو (Progressive) اور ریٹروگریسو (Retrogressive)۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ تحریک یا تجربہ جو ادب میں کیا جائے ادب کو آگے ہی لیتا جائے، کچھ تجربے پیچھے بھی دھکیل سکتے ہیں، مگر ہر

تجربہ اپنی ایک چھاپ چھوڑ کر جاتا ہے اور ادب انھیں اپنی جلو میں لے کر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ نہ تو ہم پریم چند کے اسلوب پر رکے، نہ منٹو اور عصمت کے، نہ بیدی اور کرشن کے اور نہ ہی مین را اور سریندر پرکاش کے۔ البتہ ادب بھی فیشن کی طرح ہوتا ہے کبھی کبھی یہ اپنی ٹرینڈس (Trends) کو ری ڈسکور (Rediscover) کرتا ہے اور نئے طرح سے پیش کر کے مقبول ہو جاتا ہے۔ بزنس سے ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک کمپنی نے پہلے پہل جیل (Gel) ٹوتھ پیسٹ شروع کیا مگر لوگوں نے اپنی صدیوں کی عادت کو ترک کر کے اس کو اپنانے سے انکار کیا۔ پھر 'کلوز اپ' کی شکل میں وہی ٹوتھ پیسٹ دوبارہ لانچ کیا گیا اور بہت ہی مقبول ہوا کیونکہ تب تک لوگوں کو دماغ میں تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ یہی صورت حال ادب کی بھی ہے۔ مثلاً غزل اس ٹوتھ پیسٹ کی طرح ہے جو صدیوں سے ہمارے ساتھ رہی ہے اس کی جگہ جاپانی اور دیگر تجربے جیسے ہائیکو وغیرہ اپنانے میں قارئین کو مشکلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اِدھر انتظار حسین کی بات کریں تو مجھے ایسا کچھ نہیں لگتا کہ انھوں نے کوئی نیا اسلوب ایجاد کیا ہے۔ میرا یہ ماننا ہے کہ انھوں نے جدیدیت کا لبادہ اوڑھ کر فکشن میں داستاں کو ہی ری ڈسکور کیا ہے اور اسی میں کنایہ و علامتوں کا سہارا لے کر اپنا ایک انفرادی طرز انداز اپنا لیا ہے۔

(س ۵) اچھا ایک سوال جو ہمیشہ کھٹکتا ہے ضمناً ضرور پوچھوں گا۔ ادبی تحریکوں نے کس حد تک اردو کو متاثر کیا، مثبت اور منفی ہر دو طرح؟

(ج ۵) ادبی تحریکوں نے اردو ادب میں کافی رول ادا کیا ہے۔ اور یہ سب تحریکیں امپورٹڈ ہیں، تقلیدی ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ متاثر کرنے والی تحریک تھی ترقی پسند تحریک جو فطریت اور حقیقت پسندی کی زائیدہ تھی۔ چونکہ اس سے جڑے افسانہ نگار غریبوں، مزدوروں اور پسماندہ لوگوں کی باتیں کرنے لگے تھے جن کی ہندستان میں اکثریت تھی اور جو عملی طور پر نہیں تو کم از کم تصوراتی طور پر اسے نجات حاصل کرنے کے متمنی تھے، اس لیے یہ تحریک انتہائی مقبول ہوگئی۔ میں نے اپنے ایک افسانوں کے مجموعے کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ ہندستان (پاکستان سمیت)

کی غربت اور پسماندگی کی یہ حالت ہے کہ اگر آج بھی کوئی پریم چند پیدا ہو تو اسے لوگ شوق سے پڑھیں گے۔ تاہم جدیدیوں نے افسانے کو نیا اسلوب دیا، علامتوں اور استعاروں سے آراستہ کیا اور بیانیہ کو پس منظر میں ڈال کر مکالمے کو ترجیح دی۔ دیکھا جائے تو علامتوں اور استعاروں کا استعمال پس جدیدیت بھی ہوتا رہا ہے مگر وسائل یا ذرائع کے طور پر نہ کہ انجام کے طور پر جیسا جدید ادب میں ہوتا تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آگے چل کر بھی نئے تجربات ہوتے رہیں گے چاہے اندرونی محرکات کے سبب یا پھر بیرونی محرکات کے سبب اور ان کو کسوٹی پر پرکھا جاتا رہے گا۔ ان میں جو تجربہ مقبولیت سے سرفراز ہوگا اس کو ادب میں منظوری مل جائے گی۔

(س۶) پاپولر ادب اور تخلیقی ادب کو آپ کیسے الگ الگ کریں گے۔ آج کا ادیب ان میں کیسے تمیز کر پائے گا اور ان میں اصل ادب کا رستہ کون سا ہے؟

(ج۶) اگر آپ کا مطلب پاپولر ادب سے وہ ادب ہے جو ایسے ادیب لکھتے رہے جن کی نظر اپنے کھیسے پر رہی نہ کہ اپنی تخلیقی صلاحیت پر، تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تعریف کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ قاری خود ہی دونوں میں تمیز کرتا ہے کہ ایک میں قلم کار کی سیاہی کا بہاؤ صاف نظر آتا ہے اور دوسرے میں قلم کار کے پسینے کا۔ تخلیق کار اپنی تخلیق کی مقبولیت کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا۔ سنا ہے جب جیمز جوائس کی 'الیسز' کو نقاد نے یوں تنقید کی کہ تمھاری کتاب یا تو تمھیں سمجھ آئی ہوگی یا پھر مجھے باقی کسی کو نہیں تو جوائس نے جواباً عرض کیا تھا کہ اگر دنیا میں دو دانش ور اس کتاب کو سمجھ پاتے ہیں تو میں سمجھوں گا کہ مری مراد بر آئی۔ حالانکہ اس معروضے میں مبالغہ آمیزی ہے کیونکہ ہر ادیب چاہتا ہے کہ اس کی کتاب صحیح ہاتھوں میں پہنچ جائے اور صحیح آدمی اس کو پڑھیں اور اس سے استفادہ کریں۔

(س۷) میرا ذاتی خیال ہے جس سے آپ اختلاف کا حق رکھتے ہیں.... ہم آج بھی فکشن میں ۱۹۳۶ء والے اسلوب سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ حقیقت نگاری سے علامت، علامت سے تجرید، اور پھر حقیقت نگاری۔ جدید افسانہ کے نام پر ہم نے صرف دوسرے یا تیسرے درجے کا

فکشن ہی تخلیق کیا ہے...جدید افسانے کا ایک دور بھی تمام ہوا لیکن کوئی نیا اسلوب سامنے نہیں آیا جو ایک دم چونکا دینے والا ہو۔

(ج ۷) ہمارے معاشرے میں اردو کے قارئین کا اگر آپ پروفائیل دیکھیں تو آپ کو سمجھ آئے گا کہ ایسی صورت حال کیوں کر ہے جس کی جانب میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔ کبھی آپ ٹرین میں سفر کر لیں، ہندستانی نشست پر بیٹھتے ہی اپنا ٹفن بکس کھول کر پورے راستے میں کچھ نہ کچھ چباتا رہے گا جب کہ کوئی فرنگی سفر کر رہا ہو تو بیٹھتے ہی اپنی کتاب کھول کر اس کا مطالعے میں غرق ہو جائے گا۔ ادب کے تئیں یہ رویہ قلم کی روانی کے لیے مانع بن جاتا ہے۔ اردو کے قارئین ابتدا میں جن و پری کی کہانیوں میں فرار کے متمنی رہے، پھر حقیقت پسند تحریروں کی طرف مائل ہوئے کیونکہ ان تحریروں میں ان کو اپنی تصویریں نظر آنے لگیں۔ یہی وجہ تھی کہ قلم کاروں کو دورِ جدید میں ابھری ترسیلی خلیج کو پاٹنے کی فکر لگی رہی اور انھیں دوبارہ بیانیہ کا سہارا لینا پڑا۔ مگر آج کے بیانیے اور پریم چند کے بیانیے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آج قلم کار غیر شعوری طور پر علامتوں، کنایوں اور تلمیحات کا استعمال کرتا ہے تا کہ اس کے بیانیہ میں تصور کا عمل دخل ہو اور قاری غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جائے۔ جہاں تک چونکانے والی بات ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہم کسی نئے اسلوب کو دیکھ کر چونکیں۔ ہمارا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے نظریات کو اپنی صلاحیت کے حساب سے قارئین تک بخوبی پہنچا دیں اور وہ ان سے مستفید ہو جائیں۔

(س ۸) کیا کسی خالص علامتی مونولوگ میں ہم سرئیلزم، رئیلزم، اور میجک رئیلزم کو بیک وقت قید نہیں کر سکتے؟ ایسی کوئی مثال اگر آپ کے سامنے ہو؟ کچھ لوگ صرف مونولوگ کو افسانہ تسلیم ہی نہیں کرتے جب کہ کہانی تو اس بیانیے میں بھی موجود ہوتی ہے۔

(ج ۸) یہ نئی اصطلاحات جو آپ نے گنائی ہیں، ہمیں اپنی طرف متوجہ ضرور کرتی ہیں کیونکہ ہم مغرب زدہ ذہنیت کے غلام ہو چکے ہیں۔ گوتم بدھ کی وجودی کشمکش اور حکایات، کالی داس کی زندگی کا وہ موڑ جب بیوی کی بےعزتی کے سبب وہ ادیب بنا اور امر ہو گیا اور 'بادل' کو علامت بنا

کر ادب کی تخلیق کی یا پھر شکنتلا جیسی خوبصورت کہانی لکھی، ان پڑھ جلاہے کبیر کے دوہے جو سکھوں کے گرنتھ صاحب میں جگہ پائے اور پھر ڈاکو سے منقلب ہوئے تلسی داس کی رامائن جو گنگا جمنی دوآب میں زبان زد عام ہے۔ کیا ان میں آپ کو باضابطہ تحریکیں نہیں ملتی ہیں؟ جن اصطلاحوں کا آپ حوالہ دیتے ہیں ان کے تجربات ہماری تہذیب میں زمانہ قدیم سے ہوتے آرہے ہیں مگر افسوس انگریزوں کی غلامی کی وجہ سے ہم اپنی جڑوں سے کٹ کر رہ گئے اور ان کی طرف غور نہ کر سکے۔

(س۹) انگریزی ادب میں فکشن میں نت نئے تجربات کرنے کا رواج ہے جبکہ ہمارے ہاں تجربات سے اکثریت ہمیشہ خائف رہتی ہے یا اسے جدید ادب کے چونچلے کہہ کر رد کیا جاتا ہے اور سطحی یا پاپولر فکشن کی روایت کو آگے بڑھانے پر سارا زور نظر آتا ہے، اس مزاج کی کوئی خاص وجہ؟

(ج۹) مجھے لگتا ہے کہ اس سوال کا جواب میں پہلے بھی دے چکا ہوں۔ ہمارا معاشرہ ایک ٹھہرے ہوئے تالاب کی مانند ہے جو انقلاباتِ زمانہ کو رد کرتا آیا ہے یا پھر انھیں اپنے اندر جذب کرتا چلا آرہا ہے۔ پتھر مارنے سے چند ثانیوں کے لیے اس تالاب میں ہلکی لہریں اٹھتی ہیں مگر جلدی ہی وہ اوجھل ہو جاتی ہیں۔ پہلے یا دوسرے جنگ عظیم سے یہاں کوئی فرق نہیں پڑا حالانکہ ہندستانیوں کو ان جنگوں میں بطور ایندھن استعمال کیا گیا، مارکسی انقلاب کو بھی ہم نے درگزر کر دیا اور ترقی پسندوں کی سنی ان سنی کر دی کیونکہ یہ ہمارے مذہبی عقیدوں سے وارا نہیں کھا رہا تھا، پھر تقسیم وطن کی تباہی کو ہم نے جذب کر لیا اور ہم نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا کیونکہ ہمیں ایذا پسندی کی تربیت صدیوں سے دی جا چکی ہے۔ بقول مہاتما گاندھی کوئی ایک تھپڑ مارے اسے اپنی دوسرے گال پیش کرو اور دکھ درد سہتے جاؤ۔ ایسے معاشرے میں جہاں انقلابات کا فقدان ہو، جہاں سماج کے ایک بڑے حصے کو عاجز کر دیا گیا ہو اور صدیوں سے اسے استحصال برداشت کرنے کا درس دیا گیا ہو، جہاں آبادی کا نصف حصہ نرینہ عصبیت کا شکار ہو اور عورت محض لذت کی چیز بن کر رہ گئی ہو، اس سماج میں انقلابات کا کیا کام! وہاں لوگ ادب صرف تفریح کے لیے پڑھتے ہیں، سیمناروں

میں مقالے پڑھنے کے لیے رقم کرتے ہیں یا پھر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(س۱۰) میں نے اردو فکشن میں مائیکروفکشن کو متعارف کروایا اور بطور مبتدی ایک سوال سامنے رکھا کہ اگر ہم نہ صرف اسے افسانچے سے الگ کریں بلکہ انگریزی مروج مائیکروفکشن سے بھی الگ اردو میں اس کا اسلوب خود طے کریں تو وہ کیا ہوگا؟ اس حوالے سے ستیہ پال آنند، نسیم سعید، سعادت سعید، نعیم بیگ، محمد حمید شاہد، شموئل احمد، ابرار مجیب اور دیگر کئی اہل دانش کی آرا سامنے آئی ہیں آپ کی رائے بھی چاہوں گا۔

(ج۱۰) کوئی بھی نئی صنف تبھی اپنی جگہ بناتی ہے جب اس میں مروج اصناف سے ہٹ کر کوئی بات ہو۔اس سے پہلے میرے پاس مقصود الٰہی شیخ کی کتاب آئی تھی جو اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ ان کی تحریروں کو پوپ کہانی کہا جائے اور وہ ان کے موجد ٹھہرائے جائیں۔ میں نے ان کی کہانیاں پڑھیں اور جواباً اپنے کچھ افسانچے بھیجے اور ان سے استدعا کی کہ وہ مجھے سمجھا دیں کہ میرے افسانچوں اور ان کی پوپ کہانیوں میں کیا فرق ہے؟ ساتھ ہی میں نے 'پوپ'(pop) کا صحیح معنی بھی لکھ دیا یعنی یہ 'فوک'(folk) سے قریب تر ہے نہ کہ اختصار اس کی خاصیت ہے۔اسی طرح میں مائیکروفکشن پر بھی اتنا ہی وضاحت کر سکتا ہوں کہ جب تک اس کا اپنا اختصاص نہ ہو، اپنی پہچان نہ ہو اور اپنا تشخص نہ بن پائے اس کو بطور صنف اردو میں کوئی مستقل طور پر استعمال نہیں کر پائے گا۔ اس صنف کے پیرامیٹرس(Parameters) کی نشاندہی کرنا اور ان کو اردو ادیبوں سے منوانا آپ کا کام رہے گا۔

(س۱۱) طویل مکالمے کے بعد متفقہ رائے سے ہم نے مائیکروفکشن کو تین سو سے پانچ سو لفظوں تک محدود کیا ہے۔ میں ذاتی طور پر مائیکروفکشن کو اردو میں ایک ایسا گندھا ہوا متن دیکھتا ہوں جس کی ہر سطر سے کہانی پھوٹے اور اس سے بیک وقت کئی کہانیاں پھوٹیں یعنی Micro not in the meaning of small, it is like micro chip, lot of

stories in one chip. لیکن کلی حیثیت سے وہ ایک ہی کہانی لگے جسے پڑھنے کے بعد قاری کو یوں لگے جیسے وہ ہزار داستاں سے ملا ہو۔آپ کی رائے ضرور چاہوں گا۔(نوٹ تجرباتی مشقوں میں اب تک ہزار مائیکروفکشن کی مثالیں آچکی ہیں اور اردو کے معتبر ادبا اس صنف پر مکالمے میں مصروف ہیں۔)

(ج ۱۱) میں نے بہت برس قبل انگریزی میں مختصر نویسی کی ایک روایت کے بارے میں پڑھا تھا کہ ایک ادیب کی دوسطری تحریر چھپی تھی:

I (آئی)

Why? (وہائی)

مندرجہ بالا تحریر کے جواب میں کسی اور ادیب نے لکھا تھا:

You (یو)

Who? (ہؤ)

دیکھ لیا جائے تو دونوں صورتوں میں زندگی کے فلسفے کو کم سے کم الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔انگریزوں کے لیے یہ نیا ہوسکتا ہے، میری نظر سے سنسکرت میں ایسی تحریریں گزری ہیں جو الگ صنف کے طور پر استعمال نہیں کی گئیں بلکہ بیانیے میں ہی کھپ گئیں۔ جہاں تک مائیکروفکشن کا تعلق ہے یہ صنف ابھی گھٹنے گھٹنے چل رہی ہے اور اس کی مقبولیت تبھی ممکن ہوگی جب اردو کے قلم کار اس کو کھلے دل سے اپنائیں گے اور اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔ افسانچہ کی روایت کو آگے بڑھانے کے لیے کئی افسانچہ نگاروں اور ان کی بنائی ہوئی تنظیموں نے بہت محنت کی اور ان کی مدد کے لیے ماہنامہ شاعر جیسے رسالے بھی میدان میں اترے۔اسی طرح آپ کو بھی اپنی بات منوانے کے لیے پہلے تو مائیکروفکشن کی خصوصیات سے اردو کے قلم کاروں کو آگاہ کرنا ہوگا، اور پھر اس کی مقبولیت کے لیے ٹھوس قدم اٹھانے پڑیں گے۔

(س ۱۲) آپ کا علمی ادبی سفر ہمارے سامنے ہے آپ اردو فکشن میں علامت تجرید کو کس

حد تک اہم سمجھتے ہیں، ضرور بتایئے؟ اور ادب جو آرٹ سے مترشح ہے اسے کیوں کر سطحی اخباری یا ڈائجسٹی انداز سے گڈ مڈ کیا جاتا ہے۔

(ج ۱۲) میرا علمی سفر ۱۹۷۰ء میں شروع ہوا مگر ۷۸ء تا ۹۶ء تک قلمی تعطل کا شکار ہو گیا۔ غرض میں نے ۱۹۹۶ء سے مسلسل لکھنا شروع کیا۔ سائنس کا طالب علم ہونے کے سبب اور انگریزی میڈیم آف ایجوکیشن ہونے کے سبب میں نے ادب کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ اردو زبان وادب سے میری جانکاری ۱۹۶۹ء کے بعد ہی ہوئی تھی۔ میں نے زیادہ تر منٹو، پریم چند، کرشن چندر اور ایسے ہی روایتی ادیبوں سے استفادہ کیا تھا جب کہ انگریزی میں میں نے موپاساں، آئین رینڈ، ارونگ سٹون وغیرہ کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ دھیرے دھیرے میں تبصرے بھی رقم کرنے لگا جس کی بدولت میں نے تقریباً ۳۰۰ر کتابیں پڑھیں جن میں سے میں نے ۲۶۰ر پر تبصرے بھی رقم کیے۔ اس طرح میں معاصر ادب سے روشناس ہوتا رہا۔ میرے پانچ افسانوں کے مجموعے (ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات اور روح کا کرب)، ایک افسانچوں کا مجموعہ (مٹھی بھر ریت) اور تین تنقیدی مضامین وہ تبصروں کے مجموعے (عصری تحریریں، عصری شعور اور عصری تقاضے) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ میرا ایک افسانوں کا مجموعہ بہ عنوان 'اب میں وہاں نہیں رہتا' اور دو تنقید و تحقیق سے متعلق کتابیں (عصری تناظر اور اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار) زیر طبع ہیں۔ میں نے ہمیشہ بیانیہ کو ترجیح دی ہے اور اپنی بات وضاحت سے پیش کی ہے کیونکہ مجھے ان لوگوں کے دکھ درد کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے جو فرقہ واریت، نسلی اور ذات پات کے استحصال اور نفسیاتی کجرویوں کے شکار ہوتے ہیں۔ میں کوئی نصیحت یا اپدیش نہیں دیتا۔ غرض یہ کہ میں نے مقصدیت کو اپنا لیا ہے۔ مگر اتنا کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے علامتی اظہار سے کبھی انحراف نہیں کیا اور مکالمے کو بھی خوب برتا ہے۔ میری دو کہانیاں 'موت کے سوداگر' اور 'گاڑی کا انتظار' میں تو صرف مکالمے ملتے ہیں اور کہیں بھی کوئی بیانیہ نہیں ملتا۔ اسی طرح میرے افسانوں 'گھونسلا' اور 'سرحدیں' میں میں نے پرند و چرند کے توسل سے انسانی

سرشت کی نشاندہی کی ہے۔ افسانہ 'جاگو' تجریدی افسانہ ہے جو دراصل ایمرجنسی میں لکھا گیا تھا اور دوبارہ ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ افسانہ 'راکھ کا ڈھیر'، 'ایک نہتے مکان کا ریپ' چنار کے پنجے'، ادھوری کہانی، آؤ کچھ اور لکھیں، احتجاج، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، بُدھ کی مسکراہٹ، دس انچ زمین، طلسمی عینک، ترنذ، کاگ پورنیا، ڈاگ ہاؤس، اور طفیلی بیل میں بھی علامتوں اور استعاروں کو بڑے فکرانگیز طریقے سے استعمال کیا گیا ہے۔ میری کہانیوں میں جن علامتوں کا استعمال ہوا ہے کچھ کے نام یوں ہیں، کینچلی، ڈرفٹ وڈ، کالا گلاب، چنار کے پتے، کتے، سفید کراس، بلبل گدھا اور کتا، زمین کے ٹکڑے، زیبرا کراسنگ، بدھ کی مسکراہٹ، درندہ 'ترنذ'، جادوئی عینک، ڈاگ ہاؤس وغیرہ۔ ایک بات اور، اتنے افسانوں میں علامتوں کو برتنے کے باوجود میں نے بیانیہ کو نہیں چھوڑا اور اپنے افسانے کو ترسیل کے المیے کا شکار ہونے نہیں دیا۔ میرے افسانوں میں علامتیں منزل کو پانے کا ذریعہ ہیں، منزل نہیں۔

☆ آخر میں اپنے دورِ فکشن کے حوالے سے گفتگو بھی کریں، کچھ یادداشتیں اور اپنی کتابوں کا تعارف ضرور کروائیں اور اپنے نظریہ فکشن سے ہمیں بالخصوص آگاہ کریں۔

اس بارے میں میں نے پہلے ہی تفصیل سے بتادیا ہے۔ تاہم پھر سے یہاں پر اپنے دورِ فکشن کے بارے میں لکھ رہا ہوں:

چنانچہ میں انسانی سرشت کے بارے میں لکھنا پسند کرتا ہوں اور وہ بھی سیاسی و سماجی سیاق و سباق میں اس لیے میری کہانیاں حقیقت کے قریب ہوتی ہیں تاہم کسی میں فوٹوگرافی نہیں ہوتی۔ عام طور پر مجھے خود کہانی میں شریک ہونا اچھا لگتا ہے اسی لیے راوی کے طور پر خود کو پیش کرتا ہوں۔ میری کہانیاں عام طور پر میرے مشاہدات پر مبنی ہوتی ہیں مگر ان سے محض اکتساب کیا جاتا ہے جب کہ پلاٹ، کردار، سچویشن اور حرکات سب کچھ تصورات کی دین ہوتے ہیں۔ میری یہ کوشش رہتی ہے کہ میری بیشتر کہانیاں، جن کی بنت تصور پر مبنی ہوتی ہے، حقیقت کا آئینہ نظر آئیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی قاری یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا کہ یہ کہانی وقوع پذیر نہیں ہوئی ہے۔ اور اس کو میں

اپنی کامیابی سمجھتا ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں تجریدی دھند لکے اور تفہیمی ابہام کے افق نہیں تلاشتا۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہے کہ میرے پانچ افسانوں کے مجموعے چھپ چکے ہیں اور ایک زیر طبع ہے۔ ان سب میں موضوعاتی ،جغرافیائی اور کرداری تنوع ملتا ہے۔ مجھے کہیں کچھ دہرانے کی عادت نہیں ہے نہ ہی خانہ پری کرنے کے لیے لکھنے کی۔ میں فرمائشی ادب بھی نہیں تھاپتا۔ من کی آواز سنتا ہوں، من کی خوشنودی کے لیے اسے قلم بند کرتا ہوں، اور من سے ہی لکھتا ہوں۔ میرے افسانچے بھی افسانوں سے الگ نہیں ہیں گو ان میں اختصار کا خیال رکھا گیا ہے اور کیپسول کی طرح اپنے مدعا کو پیش کیا گیا ہے۔ ان افسانچوں میں تلمیحات اور انسانی عقیدوں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آبگینوں کو کہیں ٹھیس نہ لگ جائے اس لیے زیادہ تلخ زبان سے کام نہیں لیا ہے۔ ورنہ ایک ناستک کے لیے بہت کچھ ہے جو وہ لکھ سکتا ہے اور عقیدوں و روایتوں کو جھٹلا سکتا ہے۔ تاہم میری یہ کوشش رہتی ہے کہ لوگ میرے خیالات پڑھ لیں، میرے نظریۂ زندگی سے واقف ہوں مگر میری پیروی کریں اس کی کبھی میں نے کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

﴾ افسانہ نگار دیپک بُدکی سے سید تحسین گیلانی کا مکالمہ، مطبوعہ قومی تنظیم، پاکستان، اپریل ۲۰۱۷ء

کتابِ زندگی

(عارف اقبال، مدیر اردو بک ریویو، دہلی کا سوالنامہ مع جوابات)

نام: دیپک کمار بُدکی

قلمی نام: دیپک بُدکی

تاریخ پیدائش: ۱۵رفروری ۱۹۵۰ء مقام: سرینگر، ضلع: سرینگر، کشمیر، ریاست/ ملک: جموں و کشمیر (انڈیا)

(س) آپ نے کس اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی؟

(ج) گانی آٹ منز پرائمری سکول، مہاراج گنج (جبری سکول)

(س) آپ کی مادری زبان اور ذریعہ تعلیم؟

(ج) کشمیری، انگریزی

(س) آپ کے مطالعہ کے موضوعات کیا ہیں؟

(ج) سائنس، انگریزی و اردو ادب اور تاریخ

(س) اس وقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے؟

(ج) مُستنصر حسین تارڑ کا ناول 'راکھ'

(س) آپ کے پسندیدہ مصنفین (ادیب، ناول و افسانہ نگار، شاعر وغیرہ) کون ہیں؟

(ج) موپاساں Maupassant، آئین رینڈ Ayn Rand، اروِنگ سٹون Irving Stone، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر

(س) آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی؟

(ج) آئین رینڈ کی فونٹین ہیڈ Fountain Head اور اٹیلس شرگڈ Atlas Shrugged

(س) حصول تعلیم کے دوران میں آپ کو کس نصابی کتاب نے زیادہ متاثر کیا؟

(ج) بی ایڈ کے دوران 'تعلیمی نفسیات'۔

(س) آپ اردو کا کون سا اخبار/ رسالہ خریدتے ہیں؟

(ج) میں شاعر، آج کل اور ایوان اردو کا مستقل خریدار تھا مگر دو تین سال سے ڈاک کی تقسیم سے پریشان ہو کر مجھے یہ سلسلہ بند کرنا پڑا۔ اس لیے کتابوں پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

(س) آپ کے گھر کے نوجوان (teenagers) کیا اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں؟

(ج) اردو میری مادری زبان نہیں ہے، یہ میری اختیاری زبان ہے جو میں نے پوسٹ گریجویشن کے دوران اپنی مرضی سے سیکھ لی۔ گھر میں فی الحال کوئی ٹین ایجر نہیں ہے، پوتے انگریزی سکول میں انگریزی میڈیم سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

(س) آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟ میں ملحد ہوں اور نام نہاد سیکولرازم پر یقین نہیں رکھتا۔ میرا ماننا ہے کہ نصاب سے سبھی مذاہب کی تعلیمات، مذہبی شخصیات کی اسٹڈی اور مذہب پر مبنی اخلاقیات کو یکسر خارج کر دینا چاہیے اور عقلیت پسندی Rational thinking پر زور دینا چاہیے۔ صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کی پڑھائی ہونی چاہیے۔ البتہ جنھیں مذہبی علوم میں خصوصی دلچسپی ہو ان کے لیے مذہبی اسٹڈیز کا انتظام الگ ہونا چاہیے۔

(س) علم و ادب کے میدان میں نئی نسل کے تعلیمی و علمی رجحان کو آپ کس زاویہ سے دیکھتے ہیں؟

(ج) نئی نسل کا رجحان سائنس اور تکنالوجی کی طرف ہے۔ افسوس کہ ہمارا الیکٹرانک میڈیا اس کی نفی کر رہا ہے اور رجعت پسندی اور توہم پرستی کو بڑھاوا دے رہا ہے جس سے نئی نسل کا

ذہن آلودہ ہو رہا ہے۔

(س) کیا آپ اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟

(ج) ہمارے ملک میں جتنے بھی ایجوکیشن کمیشن بنائے گئے ان کی رپورٹیں الماریوں میں دھول کھا رہی ہیں۔ ان میں سب سے اہم مدلیار سیکنڈری سکول کمیشن اور کوٹھاری کمیشن تھے مگر ان پر آج تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی تعلیم میں طبقاتی تعصب جاری ہے اور امیروں کے لیے بہتر سہولیات میسر ہیں۔

(س) ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا اردو کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا ناگزیر ہے؟

(ج) اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کو کسی ایک فرقے کی ملکیت نہ سمجھا جائے اور ریاستوں میں اس کی تعلیم فراہم کی جائے۔ پیشہ ورانہ تعلیم اگر کسی زبان میں میسر نہیں ہے تو اس کی ترقی پر رکاوٹیں آتی ہیں۔ اردو میں غزلیں اور افسانے تو سبھی لکھتے ہیں مگر سائنسی اور دیگر کتابوں کی جانب اتنا دھیان نہیں دیا جاتا ہے۔ آپ خود بھی سروے کر کے دیکھ لیجیے کہ اردو میں سائنس اور تکنالوجی کے کتنے رسالے اور اخبار نکلتے ہیں اور ان کی شرح فیصد عام رسالوں و اخباروں کی نسبت کیا ہے؟ ہمیں لب خراشی سے نکل کر عملی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

(س) ملک کی اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

(ج) مجھے تو ان کا نام لینے ہی سے بخار چڑھ جاتا ہے۔ اپنے اپنوں کو ریوڑیاں بانٹتے ہیں۔ بقول کرشن چندر ناشاعر اور ایسے نثر نگار جنھوں نے صرف دیباچے لکھے ہیں وہ ان اداروں کے منتظمین ہیں۔ افسر شاہی، لال فیتہ شاہی اور اقربا پروری کی مثالیں ہیں یہ سب ادارے۔ لاکھوں کروڑوں کا فنڈ ضائع کیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں نہیں کیا جا سکتا ہے کہ سال میں جب کبھی کوئی کتاب چھپتی ہے اور اس کی ایک کاپی کسی ادارے کو بھیجی جاتی ہے تو اس کا رجسٹر میں اندراج کیا

جائے اور سال کے آخر میں اس کو انعام کے لیے جانچا جائے۔ اگر اس کی کاپیاں کئی جانچنے والوں کو بھیجنا مطلوب ہو تو ادارہ خود اس کی زیراکس کروائے۔ اس طرح اقربا پروری کچھ حد تک کم ہو جائے گی۔ ورنہ عام قلم کاروں کو ہر کام کے لیے جیب سے خرچ کرنا پڑتا ہے اور رسوخ والے ہی ان سکیموں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں اپنی بات کروں، میرے سات افسانوں کے مجموعے، پانچ تنقیدی وتبصروں کے مجموعے، ایک تحقیقی کتاب اور ایک سوانح عمری شائع ہوئی ہے، مگر آج تک کسی ادارے نے کسی سند کے قابل بھی نہیں سمجھا، انعام کی تو بات ہی نہیں جبکہ ایک ایک کتاب چھپنے پر ادیبوں کو انعامات دیے جا چکے ہیں۔ ایک اور مثال دینا چاہوں گا۔ میں نے ساہتیہ اکادمی کی لائبریری کو اپنی اہم تحقیقی کتاب (اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار) کا ایک نسخہ خریدنے کی درخواست کی تھی، جواب ملا یہاں پر کتابیں رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ حیرت اس بات کی ہوئی کہ کیا ساہتیہ اکادمی نے کتابیں خریدنا بند کر دیا ہے یا یہ پابندی صرف میرے لیے تھی۔

(س) وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟

(ج) ایسی کوئی کتاب نہیں ہے، البتہ منٹو کے کچھ افسانے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

☆مکمل پتہ : اے-102 ایس جی امپریشن، سیکٹر 4-B، نزد میوار لا انسٹی ٹیوٹ، وسندھرا، غازی آباد-201012

☆موبائیل:9868271199

☆ای میل:deepak.budki@gmail.com

اہم تصنیفات :

افسانوں کے مجموعے:

(۱) ادھورے چہرے (۲) چنار کے پنجے (۳) زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

(۴) ریزہ ریزہ حیات (۵) روح کا کرب (۶) مٹھی بھر ریت (افسانچے)

(۷) اب میں وہاں نہیں رہتا

تبصرے وتنقیدی مضامین کے مجموعے:

(۱) عصری تحریریں (۲) عصری شعور (۳) عصری تقاضے (۴) عصری تناظر

(۵) عصری نقوش

تحقیقی کتاب: اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

سوانح عمری: لوحِ حیات

☆☆☆

☜ 'کتابِ زندگی'، دیپک بُدکی سے انٹرویو، عارف اقبال، مدیر اردو بک ریویو، مطبوعہ جولائی - اگست ۲۰۱۹ء

دیپک بُد کی - انٹرویو

-عماریہ رؤف

(گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد، پاکستان)

سوال: لکھنے کی ابتداء کیوں کر ہوئی؟ ابتداء میں کن مصنفین سے متاثر ہوئے؟ ادبی ذوق کے نکھار میں کن لوگوں کا حصہ رہا؟

(ج): لکھنے کی ابتدا اتفاق سے ہوئی۔ اس کے بارے میں میں نے تفصیل سے 'ادھورے چہرے' کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔ بچپن ہی سے گھر میں تناؤ کا ماحول رہا، ماں کی رحلت ۱۹۶۲ء میں ہوئی جب میں بارہ برس کا تھا، اس کے بعد کئی ارتھیاں گھر سے اٹھیں۔ پتا جی چنانچہ شریف آدمی تھے گھر کو کنٹرول نہیں کر پاتے تھے اس لیے بچوں نے اس کا ناجائز فائدہ اٹھالیا اور آئے دن کسی نہ کسی بات پر جھگڑا ہوتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ ۲۰۰/روپے کی ماہانہ تنخواہ پاتے تھے، تین بار زبردست ایکسیڈنٹ ہوگئے اور پورے موسم سرما کے دوران گھر میں بیٹھے رہے۔ بیوہ پوپھی ان کی تیمار داری کرتی رہی۔ پھر تعلیمی محاذ پر بھی کچھ حد تک ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۶۸ء میں میرے ممیرے بھائی، اشوک دلال (دوسری پوپھی کے بطن سے) کی ناگہانی موت نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس رات کو نیند نہیں آئی، کچھ تک بندی کی اور ایک ڈرامہ 'بندھن' کے نام سے قلم بند کیا جس میں اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں کے الفاظ استعمال ہوئے کیونکہ مجھے کسی زبان پر دسترس نہیں تھی۔ اردو پانچویں کے بعد چھوڑی تھی، ہندی دسویں کے بعد جبکہ سائنس کا طالب علم ہونے

کے سبب انگریزی ذریعۂ تعلیم تھا۔ انگریزی ادب کے ساتھ کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا ۔ لکھنے کی بڑی حسرت تھی، اس لیے سوچا کوئی ایک زبان سیکھ لوں۔ جن دنوں میں ایم ایس سی اور بی ایڈ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، انھیں دنوں اورینٹل کالج میں شام کو اردو سیکھنے چلا جاتا تھا۔ وہاں سے جامعہ اردو علی گڑھ کے ادیب اور ادیب ماہر کے امتحانات پاس کیے۔ دریں اثنا ڈرامہ 'بندھن' ورق ورق بکھر گیا۔ بی ایڈ میں ایک روز ڈبیٹ میں شرکت کی، گو میرا لیکچر سامعین کو پسند آیا اور خوب تالیاں بجیں مگر انعام کسی اور کو دیا گیا۔ گھر لوٹ کر ایک افسانہ 'سلمیٰ' (جو 'ادھورے چہرے' میں 'خودکشی' کے عنوان سے شامل ہے) لکھ ڈالا اور وہ روزنامہ ہمدرد سرینگر میں شائع ہوا۔ اس طرح ۱۹۷۱ء میں میری ادبی زندگی کی شروعات ہوئی۔ مقامی اخبارات میں میرے افسانے شائع ہوتے رہے، چند ایک کشمیر سے باہر رسالوں میں بھی چھپ گئے۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۹۶ء تک میں قلمی تعطل کا شکار رہا یہاں تک کہ ۱۹۸۴ء کے آس پاس ایک روز بدحواسی میں سبھی مسودہ جات اور شائع شدہ نگارشات نذرِ آتش کرلیں۔ ۱۹۹۶ء میں ققنس پرندے کی مانند ان تخلیقات کا دوبارہ جنم ہوا اور اکثر و بیشتر میرے پہلے مجموعے 'ادھورے چہرے' میں شامل ہیں۔ اردو ادب کی تحریک مجھے اپنے پوپھا (تیسرے)، شری شام لال صراف سے ملی۔ وہ کبھی کبھی کچھ باتیں سمجھانے کے لیے اردو اشعار کا استعمال کرتے تھے۔ ان کو اقبالؔ کا یہ شعر بہت ہی پسند تھا: اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی / تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن۔ اس کے علاوہ سوامی رام تیرتھ کے کچھ اشعار سناتے تھے۔ ایک دو ہی یاد رہے: جو مست ہیں ازل سے ان کو شراب کیا / مقبول خاطروں کو بوئے کباب کیا۔

سوال: ادبی ذوق کے نکھار میں کن لوگوں کا حصہ رہا؟

(ج): ایسی کوئی شخصیت نہیں ہے جس نے مجھے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر متاثر کیا ہو۔

دراصل میری ادب سے وابستگی اپنے دم پر رہی ہے۔ ہاں سکول میں ایک استاد تھے، جناب شمبو ناتھ کاچرو، جو انگریزی پڑھاتے تھے، انھوں نے ہمیں نڈر اور بے باک بنایا۔ اردو کی کوئی فارمل ایجوکیشن تو تھی نہیں، اورئینٹل کالج تو نام کے لیے تھا، ادیب اور ادیب ماہر میں کچھ خاص پڑھایا نہیں جاتا تھا کیونکہ یہ کلاسز ان طلبہ کے لیے تھیں جو عام نصابی تعلیم حاصل کرنے میں ناکام رہتے تھے۔ بہرحال میں نے وہاں کے ہیڈ جناب جی ایم وفائی سے فن خطاطی کچھ حد تک سیکھ لی۔ میرے ایک دوست پریمی رومانی کے پتا جی، ڈاکٹر برج پریمی (مرحوم) نے 'سعادت حسن منٹو -حیات اور کارنامے' کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا تھا جس کی میں نے کتابت کی۔ اسی مقالے کے توسط سے مجھے منٹو کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا۔ اس کے بعد میں اردو کے ناول اور افسانے باضابطہ طور پر پڑھنے لگا۔ مگر میری زیادہ تر دلچسپی انگریزی کتابوں میں رہی اور کئی مغربی ادیبوں نے مجھے کافی متاثر کیا جیسے گائے دی موپاساں، ایچ جی ویلز، اروِنگ سٹون، آئین رینڈ، اوہینری، میکسم گورکی، دوستوفسکی، کافکا، خلیل جبران، رچرڈ باخ وغیرہ۔ حکایاتِ شیخ سعدی کے اردو ترجموں سے بھی استفادہ کیا۔ اردو کے افسانہ نگار جن کا میں نے دقیقہ ریزی سے مطالعہ کیا ہے یوں ہیں: منٹو، بیدی، کرشن چندر، پریم چند، عصمت چغتائی، سریندر پرکاش، جوگندر پال، عزیز احمد وغیرہ۔ اس کے علاوہ معاصرین کے افسانے بھی پڑھتا رہا جن کی پچاس سے زائد تخلیقات پر میں نے تبصرے کیے ہیں جو میری عصری سیریز تنقیدی وتبصروں کی کتابوں میں شامل ہیں۔

سوال: کہانی کی تخلیق میں کن عوامل کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں یا کہانی لکھتے ہوئے کن عوامل کا کارفرما ہونا ضروری ہے؟

(ج) کہانی لکھنے کے لیے حساس ذہن اور ہمدرد دل ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ کسی بھی

تخلیق کے لیے اسلوب بہت ہی اہم ہے۔ آپ کہانی کو قاری تک کس طرح پہنچاتے ہیں بہت ضروری ہے۔ جہاں تک کہانی کے جزئیات کا سوال ہے، یہ کہانی پر منحصر کرتا ہے کہ اس میں کردار پر مرتکز کیا جائے یا پھر پلاٹ پر، فضا کا کیا رول رہے گا اور اس میں ڈرامہ، تعلیق اور انجام کی کیا اہمیت رہے گی۔ کہیں کہیں دُم کا ڈنک (Sting in the tail) تکنیک سے بھی کام لینا پڑتا ہے حالانکہ اس کا میں زیادہ قائل نہیں ہوں۔ کہانی میں اگر کوئی سیکھ دی جائے، وہ زیریں لہر کی طرح ہونی چاہیے، واضح طور پر نہیں، دوسری صورت میں کہانی کا مزہ ہی کرکرا ہو جاتا ہے۔

سوال: کہانی لکھنے سے پہلے موضوع کے بارے میں غور وفکر کرتے ہیں؟

(ج) جی ہاں، بہت سوچنا پڑتا ہے۔ ہر گھٹنا موضوع نہیں بن سکتی۔ ہر حادثہ کہانی میں نہیں ڈھل سکتا۔ کبھی کبھی میں برسوں موضوع کو دماغ کے کولڈ سٹوریج میں ڈال کر رکھتا ہوں اور جب تک اس کے لیے صحیح پلاٹ اور ماحول نہیں ملتا اس پر قلم نہیں اٹھاتا۔ مثلاً میرے افسانے 'گھونسلا' کو لیجیے۔ یہ حادثہ ۱۹۹۰ء میں وقوع پذیر ہوا تھا، تب سے چڑیوں کی زندگی اور ان کے گھونسلا بنانے کے بارے میں مطالعہ کرتا رہا (خوش قسمتی سے میں علم حیاتیات کا طالب علم رہا ہوں)۔ پھر جا کر ۲۰۰۴ء میں یہ کہانی قلم وقرطاس کے حوالے کر دی۔ اسی طرح 'ادھوری کہانی' ۱۹۷۳ء کے آس پاس کا قصہ ہے کہ بے روزگاری کے دنوں میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوتی رہتی تھی جو ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ انسانی زندگی کے تین مرحلے ہیں، بلبل، گدھا اور کتا۔ اس کہانی کو اکیس سال بعد کہانی کا روپ دیا۔ ہاں کبھی کبھی موضوع اتنا زود حس اور ہنگامی ہوتا ہے کہ اپنی طرف وقت ضائع کیے بغیر توجہ چاہتا ہے اور افسانہ نگار کو کہانی لکھنے پر فوراً مجبور کرتا ہے۔ ایسے ہنگامی موضوعات پر بھی میں نے کئی افسانے رقم کیے

ہیں مثلاً طالب بہشت، لہو کے گرداب، اپنے اپنے زاویے، عقیدوں کے چراغ، برف کا پتلا، بیوی نہیں باندی چاہیے، خاموشیوں کی چیخ (آخری چار افسانے ابھی کتابی صورت میں نہیں آئے ہیں)

سوال: تخلیق کار کی حیثیت سے تصور وقت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ ماضی، حال یا مستقبل کسے اہم گردانتے ہیں؟

(ج) افسانے میں وقت کو بانٹنا مشکل کام ہے۔ فکشن میں 'زمان' و 'مکان' کی لامحدودیت پر کافی بحث ہوتی رہی ہے۔ 'شعور کی رو' کے تحت بہت کوشش کی گئی کہ ماضی، حال اور مستقبل کا آپس میں اس طرح انضمام کیا جائے تا کہ ایک مجموعی اور مکمل تصویر کھنچ جائے اور انسان کسی ایک زمانے کا قیدی نہ بن جائے۔ یہ تجربہ کامیاب رہا اور اب بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جدیدیت کے تحت اور بھی کئی تجربے کیے گئے۔ افسانے کو زمان و مکان سے آزاد کرنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ ادیبوں نے افسانہ صرف 'حال' میں بیان کرنے کی کوشش کی، بیان کیا کیا وہ تو بیانیہ کے خلاف تھے اس لیے ٹکڑے ٹکڑے یا پھر مکالمات کے ذریعے پیش کرتے رہے۔ چند ایک نے داستانوی سٹائل کو اپنایا اور اس میں علامتوں کا استعمال کر کے خود کو جدیدیت سے جوڑ لیا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ کہانی میں بیانیہ کی ضرورت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، اس لیے کہانی پن کا لوٹ آنا یقینی ہو گیا۔ بیانیہ اور مکالمہ ایک دوسرے کے تکمیلی جزو ہیں اور دونوں افسانے کے لیے اہم ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب کہانی ماضی کا واقعہ بیان کرتی ہو تو ظاہر ہے کہ ماضی میں ہی برتی جائے گی نہ کہ مستقبل میں۔ مستقبل کی بات ہو تو اس کو حال میں کیسے بیان کیا جا سکتا ہے؟

سوال: ای ایم فارسٹر نے کہا ہے کہ زندگی فکشن میں دو سطحوں میں پیش ہوتی ہے ایک Life in Time اور دوسرا Life in Values آپ کا نظریہ کیا ہے؟

(ج): حقیقت اور اقدار (شاید یہی مطلب تھا فارسٹر کا) کے درمیان ہمیشہ ایک سرد جنگ چلی ہے۔ زندگی جو ہے اور جیسی ہے اس کو فکشن میں جوں کا توں منعکس کرنا تو ضروری ہے۔ حقیقت پسندوں و ترقی پسندوں جیسے منٹو اور عصمت نے اس بات پر بہت زور دیا مگر دوسری جانب زندگی جیسی ہونی چاہیے اور جس کی ایک قلمکار کو حسرت رہتی ہے اس کا عینیت پسندوں جیسے پریم چند، راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں غلبہ رہا۔ یہ مسئلہ دراصل آئیڈیولوجی کا ہے کہ آپ مثالیت پسند (Idealist) ہیں یا عملیت پسند (Pragmatist)۔ ان دو کے بارے میں مغربی اور مشرقی رویے میں کافی افتراق ہے۔ مشرقی معاشرے میں اقدار پر کافی زور دیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ منٹو کے افسانے لوگ پسند تو کرتے ہیں مگر نصاب سے خارج ہیں کیونکہ ان افسانوں میں زندگی کو اس کی بھرپور عریانیت میں پیش کیا گیا ہے اور اخلاقیات سے روگردانی کی گئی ہے۔ اس کے برعکس راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کے افسانے آج بھی مقبول ہیں کیونکہ ان میں اخلاقیات پر زور دیا گیا ہے ۔ اتنا ضرور ہے کہ جب افسانے کسی منشور کے تحت لکھے جاتے ہیں وہ پروپیگنڈا بن جاتے ہیں جیسے کرشن چندر کے آخری دور کے افسانے۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں انسانی جبلت اور نفسیات کو اہم سمجھتا ہوں مگر یہ بھی مانتا ہوں کہ ایک معقول معاشرے کے لیے اقدار کا ہونا لازمی ہے اگر ایسے اقدار انفرادی حقوق اور انسانی ترقی کو پامال نہیں کرتے۔

سوال: آج قاری کی جگہ ناظر نے لے لی ہے کیا یہ صورتِ حال ادب کے لیے نقصان دہ نہیں؟

(ج): یہ تو موجودہ دور کا بہت بڑا المیہ ہے۔ ٹی وی، موبائیل اور انٹرنیٹ کے دور میں کالے حروف کی وقعت ہی ختم ہو چکی ہے۔ البتہ غور سے دیکھا جائے تو یہ تجربات

مغرب میں ہوئے اور وہاں سے مشرق میں آ گئے ۔آج بھی مغرب میں ناول اور شارٹ سٹوریز کی کتابیں ملینز (لاکھوں) میں بک جاتی ہیں، تبھی تو بکیں گی جب کوئی پڑھنے والا ہوگا۔ یہاں تو اردو میں چار پانچ سو کتابیں بک جائیں تو غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ عام طور پر کتابیں بطور تحفہ بھیجی جاتی ہیں جو بنا پڑھے الماریوں کی زینت بن جاتی ہیں ۔اس المیے کے بارے میں کرشن چندر نے اپنے افسانے 'کتاب کا کفن' میں ذکر کیا ہے۔ میں نے بھی اپنے کسی افسانے میں اس صورت حال کو یوں بیان کیا ہے کہ ٹرین میں سفر کیجیے، اگر آپ کے روبرو کوئی مغربی سیلانی بیٹھا ہوگا، وہ کوئی ناول پڑھ رہا ہوگا جبکہ ہندستانی مسافر ہر وقت کچھ چباتے ہوئے ملے گا۔ فیملی کے ساتھ سفر کر رہا ہو تو بیگم نشست پر بیٹھتے ہی اپنا ٹفن کھول کر پراٹھے اور اچار نکالے گی اور سب بچوں میں بانٹ دے گی۔ ریل کا ڈبہ اس کی خوشبو سے فوراً معطر ہو جائے گا۔ دراصل ہم لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا شوق بہت کم ہے، مجبوراً امتحان پاس کرنے کے لیے کوئی نصابی کتاب پڑھنی پڑے تو الگ بات ہے۔

سوال: کوئی ایسا مصنف جسے فارغ اوقات میں آپ پڑھنا پسند کرتے ہیں؟

(ج): اس بارے میں میں نے پہلے ہی ذکر کیا ہے کہ میرے چہیتے مصنف کون کون سے ہیں ۔ان میں منٹو کا نام سرفہرست ہے اور اس کے بعد راجندر سنگھ بیدی ہیں ۔مغربی رائٹرس میں مجھے موپاساں، آئین رینڈ اور خلیل جبران بہت پسند ہیں۔

سوال: روزمرہ کے معمولات آپ کی تحریروں پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟

(ج): میں مجلسی آدمی نہیں ہوں، مشاعروں وسیمناروں میں بہت کم جاتا ہوں۔ سینما اور کلبوں سے بھی دور ہی رہتا ہوں ۔فوج میں رہ کر بھی نہ گولف سے رغبت ہوئی اور نہ لان ٹینس سے۔ سارا وقت گھر ہی میں گزرتا ہے۔ یا تو پڑھتا رہتا ہوں یا پھر لکھتا رہتا ہوں۔ گھر میں بھی بال بچوں کو اس بات کا احساس ہے کہ میرے روزمرہ میں

مخل ہونا اچھی بات نہیں ہے، اس لیے کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا۔

سوال: آپ عالمی سطح کے افسانے کے مقابلے میں اردو افسانے کو کس مقام پر دیکھتے ہیں؟

(ج): جہاں تک اردو افسانے کا تعلق ہے ہمارے یہاں افسانوں کو انگریزی، فرانسیسی یا ہسپانوی زبانوں، جو بین الاقوامی سطح پر بہت مقبول ہیں، ترجمہ کرنے والے بہت کم ادیب ہیں اور کریں بھی تو ان میں ترجمہ نگاری کی وہ صلاحیت نہیں ہوتی ہے جس سے ترجمہ شدہ افسانہ اوریجنل سا لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانوں کا مارکیٹ ہمیشہ محدود رہا ہے۔ منٹو کا افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اور سریندر پرکاش کا افسانہ 'بجوکا' بین الاقوامی سطح پر کسی بھی معیار پر کھرا اتر سکتا ہے۔

سوال: ہم عصر افسانہ نگاروں میں آپ کا پسندیدہ مصنف کون ہے؟

(ج): گلزار، رتن سنگھ، ذکیہ مشہدی، اور مستنصر حسین تارڑ کے افسانے مجھے پسند ہیں جبکہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے عمر مجید (مرحوم)، زنفر کھوکھر اور بلراج بخشی بہت اچھے افسانے لکھتے ہیں۔

سوال: آپ کا تعلق کشمیر سے ہے۔ کشمیریوں کے مسائل اور مسئلہ کشمیر کے حوالے سے بحیثیت ادیب آپ کی رائے کیا ہے؟

(ج): کشمیر ایک ایسا الجھا ہوا مسئلہ ہے جس پر میرے لیے رائے ظاہر کرنا مشکل ہے۔ اس مسئلے پر میں نے نیشنل ڈیفنس کالج، دہلی کے لیے مقالہ لکھا تھا جس کا حوالہ میرے بائیو ڈاٹا میں ملے گا۔ دراصل اس مسئلے پر فریقین کو سوچ سمجھ کر حل ڈھونڈنا پڑے گا اگر وہ اس خطے میں امن و امان اور ترقی و خوشحالی چاہتے ہیں۔ ہندستان اور پاکستان دونوں کو باہمی ایڈجسٹ منٹ کرنی پڑے گی، تبھی بات بن سکتی ہے ورنہ اب تک ۱۹۴۸ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء اور ۱۹۹۹ء میں چار جنگیں لڑی گئیں اور نتیجہ کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔

سوال: آپ کا پسندیدہ لباس اور رنگ کونسا ہے؟

(ج): جہاں تک لباس کا سوال ہے میں گاندھی جی کی تعلیمات سے کافی متاثر ہوا ہوں گو ان سے کئی باتوں پر اختلاف بھی کرتا ہوں، ان کی تقلید میں کھدر پہننا بہت پسند کرتا ہوں۔ کھدر کا کرتا پاجامہ اکثر زیب تن کرتا ہوں۔ میں فارین (غیر ملکی) چیزوں کا استعمال نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کبھی کیمرہ نہیں خریدا یا پھر یونیورسٹی تک گھڑی بھی نہیں پہنی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ گھر میں بیوی بچے فارین چیزیں لاتے ہیں جو کچن وغیرہ میں استعمال ہوتے ہیں، اس میں میں کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ البتہ جب دفتر جانا ہوتا تھا تو کوٹ پینٹ، قمیض اور گرم سوئیٹر پہن کر جانا پڑتا تھا۔ رنگوں کے بارے میں مجھے ہلکا نیلا رنگ بہت پسند ہے کیونکہ یہ ذہن کو طراوت اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔

سوال: کھانے میں آپ کو کیا پسند ہے؟

(ج): کھانے میں مجھے بچپن ہی سے انواع واقسام کے گوشت اور جھیل ڈل کی مچھلی بہت پسند تھی۔ چنانچہ میں سرینگر میں اس علاقے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں کشمیر کے بہترین مسلم طباخ رہتے ہیں جن کو 'وازہ' کہتے ہیں اور ان کی نسبت سے اس علاقے کو 'وازہ پور' کہا جاتا ہے، اس لیے ان کے ہاتھ سے بنایا ہوا گوشت شادیوں، عشائیوں اور ہوٹلوں میں کھانے کو ملتا تھا۔ بہر حال ۱۹۹۹ء میں میں نے سگریٹ، شراب اور گوشت کھانا مکمل طور پر چھوڑ دیا اور آج تک اپنے فیصلے پر اٹل ہوں۔ واضح رہے کہ میں ملحد ہوں اس لیے یہ فیصلہ میں نے محض اپنے قوت ارادی کو پرکھنے کے لیے کیا تھا۔

سوال: سماجیات کے بارے میں اظہارِ خیال کریں؟

(ج) یہ سوال کچھ ایسا ہے کہ جواب دیتے دیتے عمریں بیت جائیں تب بھی مکمل نہیں

ہو گا۔ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں کس سماجی نظریے کو پسند کرتا ہوں تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں ایک ایسے معاشرے کا تصور کرتا ہوں جہاں انسان، چنانچہ اس کے پاس عقل ہے، نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے کی کوشش کرے بلکہ اس دنیا کے ماحول(Biosphere) کا بھی خیال رکھے اور اسے بگڑنے نہ دے۔ انگریزی میں اسے ہیومینزم (Humanism) کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں نباتات وحیوانات کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم طفیلی بن کر نہ رہ جائیں اوران میں سے کوئی ذات غائب نہ ہو۔ قدرتی وسائل کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اعتدال سے زندگی بسر کریں، اپنی فیملی محدود رکھیں اور دوسروں پر کسی طرح کے استحصال سے دور رہیں۔

سوال: آپ کے اپنے افسانوی مجموعوں میں کوئی ایک افسانہ جو آپ کے دل کے قریب یا آپ کی زندگی کا ترجمان ہو؟

(ج) ایک ماں سے اگر یہ پوچھا جائے کہ تمھارا کون سے بچہ تم کو سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے، تو وہ کیا جواب دے گی؟ یہی حال کچھ قلم کار بھی ہوتا ہے۔ اس کی ہر تخلیق اس کے دل کے قریب ہوتی ہے اوراس کو اچھی لگتی ہے۔ جہاں تک میرے افسانوں کا سوال ہے ان میں سے بیشتر افسانے میری زندگی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور بالراست میرے تجربات پر مبنی ہیں۔ خیر مقبولیت کی بات کریں تو میرا افسانہ جو سب سے زیادہ پسند کیا گیا ہے اس کا عنوان ہے 'ایک نہتے مکان کا ریپ'۔ اس کے علاوہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا'، 'گھونسلا' اور 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' بھی کافی مقبول ہو چکے ہیں۔

سوال: افسانے کی گہرائی اور دوامیت میں موضوع کو اہم سمجھتے ہیں یا اسلوب بیاں کو؟

(ج): افسانے کی دوامیت کے بارے میں کوئی فارمولہ نہیں ہے۔ دلہن وہی جو پیا من

بھائے ۔ قارئین کو جو پسند آئے اور دل کو چھو جائے وہ افسانہ امر ہو جاتا ہے ۔
افسانے کا کوئی ایک جز و ایسا نہیں ہے جس پر آدمی انگلی رکھے اور کہہ سکے دیکھیے
دنیا کے بہترین افسانوں میں یہ سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔موپاساں کا 'نیکلس'،
او ہنری کا 'گفٹ آف دی میجی'، چندر دھر شر ما گلیری کا 'اس نے کہا تھا'، سدرشن
کا 'ہار کی جیت'، منٹو کا 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، سریندر پرکاش کا 'بجوکا' ان سب افسانوں میں
کہیں کوئی خامی نظر نہیں آتی ہے اور افسانے کا ہر پہلو دل کو چھو جاتا ہے ۔ہاں یہ
حقیقت ہے کہ موضوع کے بغیر افسانے میں جان ہی نہیں آ سکتی ہے مگر یہ لکھنے والے
کا سٹائل ہے، اس کا اسلوب ہے جو افسانے کو نکھارتا ہے اور امر بنا دیتا ہے ۔

سوال: اگر آپ سے خود احتسابی پر اصرار کیا جائے تو آپ خود کو کس درجے اور کس رجحان
کا حامل افسانہ نگار قرار دیں گے؟

(ج): پہلے رجحان کی بات کروں ، میں اپنی منزل کی طرف بقول مجروح سلطان پوری
'اکیلا ہی چلا تھا' اور آج بھی خود کو اکیلا ہی پاتا ہوں ، نہ کہیں لوگ ملے اور نہ ہی کوئی
کارواں بن گیا۔ چنانچہ میرے افسانے میرے تجربات یا احساسات کی ترجمانی
کرتے ہیں اور انھیں میں زمینی حقیقت سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں اس لیے کچھ
حد تک میں حقیقت نگاری سے کام لیتا ہوں ۔تاہم میں علامتوں کا بھی خوب استعمال
کرتا ہوں وہ چاہے پرندو چرند ہوں (افسانہ گھونسلا، کاگ پورنیا)، حیوان ہوں
(ڈاگ ہاؤس، سرحدیں)، نباتات ہوں (طفیلی بیل)، مادی اشیا ہوں (زیبرا
کراسنگ) یا پھر پر اسرار ہیبتناک خیالی جانور ہوں (ترند) ۔یہاں یہ کہنا ضروری
سمجھتا ہے کہ میری علامتیں منزل تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں ، خود ہی منزل نہیں ہیں
(Means to an end,
not an end in itself) جیسا کہ جدیدیت پسند

افسانوں میں نظر آتا ہے۔

سوال: آپ کے افسانوں کے موضوعات آپ کی اصل زندگی سے کس حد تک مشابہت رکھتے ہیں؟

(ج): اس سوال کا جواب پہلے بھی دے چکا ہوں ۔ میرے افسانے یا تو میرے ذاتی تجربے کی دین ہیں یا پھر میرے تصور کا نتیجہ ہیں۔ذاتی تجربات کوافسانوی رنگ دینا یا پھر تصوراتی افسانوں کو یوں بیان کرنا کہ وہ زندگی کی اصل تصویر محسوس ہوں ، یہی میری کوشش رہتی ہے۔اس فن میں میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں وہ قارئین ہی بتا سکتے ہیں۔

سوال: اردو زبان سے رغبت کی وجہ کیا بنی یا اس زبان کو سیکھنے کا خیال کیونکر پیدا ہوا؟

(ج): اس سوال کا جواب بھی پہلے ہی دے چکا ہوں ۔ چونکہ اردو نہ میری مادری زبان ہے اور نہ ذریعہ تعلیم رہی ہے اس لیے اس زبان کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے چُننا محض اتفاق ہے ۔ پانچویں جماعت تک بنیادی اردو سے واقفیت ہو چکی تھی مگر چھٹی سے ہندی بطور اختیاری مضمون لے لیا جو دسویں تک چلتا رہا۔آگے سائنس کا طالب علم ہونے کے سبب انگریزی ذریعہ تعلیم رہا اور یہ صورت حال ایم ایس سی اور بی ایڈ تک یوں ہی چلتی رہی ۔ چنانچہ مجھے ۱۹۶۸ء میں لکھنے کا شوق چرایا اس لیے کوئی زبان سیکھنے کا ارادہ کرلیا۔اتفاق سے ایک نائٹ کالج میں جامعہ اردو علی گڑھ کے لیے طلبہ کو ادیب ، ادیب ماہر اور ادیب کامل کی تعلیم دی جاتی تھی اس لیے میں نے بھی وہاں داخلہ لیا اور کچھ حد تک اردو سیکھ لی ۔ اورئینٹل کالج میں دراصل وہ طلبہ داخلہ لیتے تھے جو عام نصابی امتحانات میں ناکام ہوتے ہیں ۔ یہاں امتحانات پاس کرکے اور ایڈیشنل انگریزی کا امتحان پاس کرکے طالب علم کو میٹرک ، انٹر یا پھر گریجویٹ کے برابر مانا جاتا ہے ۔ نہ علم الحساب کا جھنجھٹ اور نہ سائنس کا

جھمیلا۔ یہاں تعلیم بھی کچھ یوں ہی سی ہوتی ہے ۔ وہاں کے ہیڈ جناب جی ایم وفائی (مرحوم) کو نہ جانے کیا سوجھی کہ مجھے خوشخطی سکھائی جس کی وجہ سے میں نے کبھی کبھی تفریحاً چند اخباروں میں، جن کے ساتھ میں منسلک رہا، کے لیے کارٹوننگ کے علاوہ کتابت بھی کی۔ اس کالج میں جوائن کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اردو کی کچھ جانکاری حاصل کرلوں ورنہ میرا تحصیل علم سب خود اکتسابی تھا۔

سوال: کیا شاعری سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں؟

(ج): نہیں، شاعری کی قدر تو کرتا ہوں، اس سے لطف اندوز بھی ہوتا ہوں مگر میرے اندر وہ شاعرانہ مزاج نہیں ہے۔ البتہ کچھ تک بندی ضرور کی ہے جب کبھی بھی دل میں کوئی خیال پیدا ہوا۔ یہ شاعری حال ہی میں انتساب کے سپیشل نمبر میں شائع ہوئی تھی مگر اس کے باوجود میں نہ شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں اور نہ مجھے شاعری کا کچھ علم ہے۔

سوال: موسیقی سننا پسند کرتے ہیں یا نہیں؟

(ج): جی ہاں مجھے موسیقی سننا بہت پسند ہے۔ غزلیں اور قوالیاں سننا کالج ٹائم ہی سے میرا مشغلہ رہا ہے۔ غزلوں میں میرے دل پسند گلوکار بیگم اختر اور مہدی حسن ہیں اور قوالی میں صابری برادرس سے محظوظ ہوتا ہوں۔

☆☆☆

ماخذ مقالہ 'دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری کا فکری وفنی جائزہ'؛ مقالہ نگار: عماریہ رؤف، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد، پاکستان، راقمہ نے دیپک بُدکی سے ۱۲ جولائی ۲۰۱۸ء، ۶ بجے شام بذریعہ ای میل سے انٹرویو لیا تھا۔

دیپک بُد کی سے روبرو

-ریاض احمد نجار

(سینٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد)

(س۱) آپ اپنے آبا و اجداد کے بارے میں کچھ بتائیں؟

(ج۱) میں کشمیری پنڈت ہوں اور میرا آبائی وطن کشمیر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے انفرادی طور پر مذہب اور ذات سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا۔ پتا جی کا نام آنجہانی رادھا کرشن بُد کی عرف نیلہ کنٹھ بُد کی تھا۔ آفس ریکارڈ میں پہلا نام درج تھا جبکہ راشن کارڈ پر دوسرا نام درج تھا۔ ماں کا میکے کا نام کملاوتی تھا جو سسرال میں آکر بدل گیا اور سماوتی بُد کی ہوگیا۔ دادا کا نام آنجہانی رام چند بُد کی اور دادی کا نام رادھا مالی تھا۔ دادا کا ایک کزن آنجہانی واسدیو نا کتخدا ہونے کے سبب لاولد تھا اس لیے انھوں نے میرے پتا جی کو رسماً گود لیا تھا جس کے باعث راشن کارڈ میں نام یوں درج تھا۔ 'نیلہ کنٹھ ولد واسدیو'۔ واسدیو اور اس کا دوسرا بھائی تقسیم وطن کے ساتھ ہی جموں ہجرت کر گئے۔ نانا جی کا نام آنجہانی نیلہ کنٹھ نہرو اور اس کی بیوی کا نام لیلاوتی تھا۔ نانا جی بچپن ہی سے دیوی بھگت تھے اور چکریشور مندر (ہاری پربت) کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر رہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی فرار کی حد تک اس مندر اور دیوی کے لیے وقف کی تھی۔ علم نجوم میں کافی مہارت حاصل تھی اور کشمیری پنڈت ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

(س۲) آپ کا پورا نام، والد کا نام، دادا کا نام، دادی کا نام، بیوی کا نام، بچوں کا نام وغیرہ۔

(ج۲) میرا پورا نام دیپک کمار بُد کی ہے۔ سنا ہے کہ پیدا ہونے کے بعد نام کرن کے

وقت دادا نے میرا نام بال کرشن رکھا تھا مگر سکول میں ایڈمشن کے وقت دیپک کمار بدکی لکھا گیا، اس لیے دوسرا نام متروک ہوگیا۔ بعد میں قلمی نام میں 'کمار' بھی حذف کرلیا۔ والد، والدہ، دادا اور دادی کا نام اوپر درج ہے۔ بیوی کا نام بینا رینہ ہے جو شادی کے بعد بینا بُدکی ہوگیا مگر چند برس پہلے ہم ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔

(س ۳) آپ کی کتنی اولادیں ہیں؟

(ج ۳) دو لڑکے ہیں۔ بڑا، سندیپ بُدکی، جس نے کمپیوٹر میں ڈپلومہ کرکے جرنلزم میں پوسٹ گریجویشن کرلی ہے اور حال ہی میں ایک پرائیویٹ کمپنی (دی موبائل انڈین) خرید کر اس کا سی ای او بن چکا ہے۔ چھوٹا، ونیت بُدکی، جس نے کالی کٹ ریجنل انجینئرنگ کالج سے سول انجینئرنگ کی ڈگری لی، پھر انسٹی ٹیوٹ دی ایمپریسا، سپین اور کارنیل امریکا سے ایم بی اے کیا۔ ممبئی میں وہ ویڈیوکون ڈی ٹو ایچ کا چینل پارٹنر ہے اور ساتھ ہی اس نے گائیڈ وموبائیل ایپ بھی بنایا ہے۔ دونوں لڑکے شادی شدہ ہیں اور ان کے بچے بھی ہیں۔

(س ۴) آپ کی چھوٹی بہن نے مسلمان گھر میں شادی کیوں کی اور اس خاندان کا کیا نام ہے اور وہ کہاں ہیں؟ کیا وہ ابھی حیات ہیں؟

(ج ۴) عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ / کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ ہمارا گھر لبرل ہے اور کسی فرد پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ وہ کس سے شادی کرسکتا ہے یا اس کا مذہب اور ذات کیا ہونی چاہیے۔ جی ہاں، وہ میری سب سے چھوٹی بہن ہے اور سرینگر میں ترمبو خاندان میں بیاہی گئی ہے۔ میری ایک بہو راجستھانی ہے اور دوسری پنجابی۔

(س ۵) اس سے پہلے آپ کی رہائش گاہ کہاں تھی؟ (جگہ کا نام بتائیں)

(ج) میری جائے پیدائش سرینگر ہے جہاں میں نے زندگی کے بہترین دن گزارے ہیں۔ وہاں ہمارا گھر محلّہ کرالہ ٹینگ، مہاراج گنج میں واقع تھا۔ دراصل ہمارے سامنے والے محلے کو کرالہ ٹینگ کہا جاتا تھا اور عقبی محلے کو وازہ پورا۔ ہمارے آبا و اجداد کرالہ ٹینگ کو ترجیح دیتے تھے

کیونکہ انھیں لفظ 'وازہ' میں کم تری کا احساس ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سارا علاقہ وازہ پورا کے نام ہی سے مشہور ہے کیونکہ کشمیر کے بیشتر طباخ، جو وازہ وان میں مہارت رکھتے ہیں، اسی محلے میں رہتے ہیں اور سیاسی طور پر 'بکرے' کہلاتے ہیں۔ مہاراج گنج مہاراجہ کے زمانے میں ہول سیل کا اہم مرکزی مارکیٹ ہوا کرتا تھا۔

(س٦) آپ کا خاندانی پیشہ کیا تھا اور اب کیا ہے؟

(ج٦) ہم ہمیشہ شہر سرینگر میں رہتے تھے اور دیہات میں کہیں کوئی زراعتی زمین یا میوہ باغات نہیں تھے۔ دادا عدالت میں کسی وکیل کے ساتھ محرر کا کام کرتے تھے مگر پتا جی اپنے بہنوئی کے ساتھ دکان پر کام کرنے لگے جس کا نام 'سودیش آرٹس اینڈ کرافٹس' تھا۔ جب ان کے بہنوئی 'کشمیر چھوڑ دو' تحریک سے جڑ گئے تو دونوں دکانیں، ایک بنڈ پر (ریذیڈنسی روڈ، جہاں سفید گھوڑا ہے، اب نام بدل کر غنی میڈی ہوگیا ہے) اور دوسری نمائش گاہ میں (سٹال نمبر ۱۱۵) میرے پتا جی کے حوالے کردیں۔ انھوں نے ۱۹۶۱ء میں کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں ملازمت اختیار کی اس لیے دونوں دکانیں بیچ ڈالیں۔ دراصل برہمن ہونے کی وجہ سے کشمیری پنڈت تجارت کو کم رتبہ سمجھتے ہیں اور ملازمت کرنے میں فخر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ پتا جی نے بہت اچھی بزنس ترک کر کے نوکری کرلی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے مجھے کئی بار دکان پر بیٹھنے کے لیے کہا لیکن میرا رجحان اس طرف نہ دیکھ کر بدظن ہو گئے کیونکہ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دونوں دکانیں مولیوں کے بھاؤ بک گئیں۔ بعد میں نوکری کے دوران والد صاحب کو کئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایمپوریم میں دو تین سال ایکسٹینشن مل گیا۔ بعد ازاں انھوں نے جیون بیمہ کارپوریشن میں بطور ایل آئی سی ایجنٹ کام کیا اور بہت کامیاب رہے۔ یہ کام وہ مرتے دم تک کرتے رہے۔

(س۷) آپ کے نام کے ساتھ 'بُد کی' کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

(ج۷) سنا ہے کہ ماضی بعید میں ہمارا آبائی مکان دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا۔ ان دنوں بنکوں کا رواج نہیں تھا اس لیے لوگ جمع کی گئی پونجی برتنوں میں رکھ کر زمین کے کسی کونے میں چھپا لیتے

تھے۔مکان کی تعمیر کے دوران کھودتے کھودتے ایک بڑا سا برتن برآمد ہوا جس میں اس وقت کا رائج سکہ جس کو 'بُد کی' کہا جاتا تھا، رکھا گیا تھا۔خزانہ ملنے کے بعد لوگ ہمارے خاندان کو 'بُد کی والے' کہنے لگے جو تقلیب کر کے صرف 'بُد کی' رہ گیا۔

(س ۸) آپ کے اندر ادبی ذوق کیسے پیدا ہوا اور آپ کن کی تحریروں سے زیادہ متاثر رہے ہیں؟

(ج ۸) گھر میں کوئی ادبی ماحول نہیں تھا البتہ ماما جی کو ادب سے کافی دلچسپی تھی۔حالانکہ صرف انٹرمیڈیٹ پاس تھے مگر انگریزی کا خوب مطالعہ کرتے تھے اور رائٹرس خاص کر ایچ جی ویلز، الڈس ہکسلے، برٹرانڈ رسل وغیرہ کے بارے میں اکثر گفتگو کیا کرتے تھے۔ان کی ذاتی لائبریری سے کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ان کی اہلیہ استاد تھیں اور اردو میں مطالعہ کرتی تھیں۔اردو کے افسانوں کے مجموعوں اور ناولوں کے ساتھ میرا پہلا واسطہ ان کی لائبریری کے توسط ہی سے ممکن ہوا۔دونوں کرشن چندر کو بہت پسند کرتے تھے۔ان دنوں کرشن چندر کی کئی کتابیں پڑھیں جن میں سے دو افسانے (کتاب کا کفن اور چاچا مہرو) ذہن پر منقش ہو گئے۔جون ۱۹۶۸ء میں ہم عمر پھپھیرے بھائی کی اچانک موت ہوئی۔اس سے پہلے ماں، دادا اور دادی کی ارتھیاں اٹھتے دیکھی تھیں۔البتہ اس دفعہ کچھ عجیب سی کیفیت ہوئی اور اسی رات گھر آ کر کچھ لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔رات بھر نہ جانے کیا کیا لکھا۔منظور و منثور دونوں۔اسی روز ایک چھوٹا سا ڈرامہ قلم بند کیا۔جس کا عنوان 'بندھن' رکھا۔ان دنوں اردو، ہندی اور انگریزی۔کسی ایک زبان پر دسترس نہیں تھی، اس لیے تینوں زبانوں کے الفاظ استعمال کیے۔کچھ فقرے ہندی میں لکھے، کچھ اردو میں اور کچھ رومن انگریزی میں۔اس کے بعد دل میں چاہت پیدا ہوئی کہ کوئی زبان سیکھنی چاہیے۔کھوج کے بعد معلوم ہوا کہ ایم پی سکول میں شام کو اورئینٹل کالج میں اردو، فارسی اور عربی سکھائی جاتی ہے۔اس لیے وہاں جا کر ایڈمشن لیا اور جامعہ اردو علی گڑھ کے تحت ادیب اور ادیب ماہر کے امتحانات کامیاب کر لیے۔ادیب کامل اس لیے مکمل نہ کر سکا کیونکہ اس دوران میری نوکری لگ گئی اور پہلی پوسٹنگ چنڈی گڑھ

ہوئی۔

(س۹) آپ نے کہانی لکھنے کا آغاز کب اور تقریباً کتنے سال کی عمر میں کیا؟

(ج۹) سن ۱۹۷۰ء میں میں نے باضابطہ پہلا افسانہ لکھا۔ اس وقت میری عمر ۲۰ رسال کی تھی۔

(س۱۰) آپ کی لکھی ہوئی پہلی کہانی کا نام اور وہ کہاں سے شائع ہوئی؟

(ج۱۰) میری پہلی کہانی کا عنوان 'سلمیٰ' تھا۔ دراصل یہ اس کہانی کی ہیروئن کا نام تھا۔ اس وقت میں بی ایڈ کا طالب علم تھا۔ کالج میں ڈبیٹ منعقد ہوا اور میرے لکچر کو سبھی نے سراہا مگر ایوارڈ کسی اور کو دیا گیا۔ اس فیصلے سے بددل ہو کر میں نے یہ افسانہ لکھا۔ افسانے کو چھپا ہوا دیکھنے کا اتنا اشتیاق تھا کہ شتابی روزنامہ آفتاب کے صدر دروازے پر پہنچ گیا لیکن یہ طے نہیں کر پایا کہ افسانے کا کیا عنوان رکھوں۔ دفتر کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہیروئن کا نام ہی بطور عنوان رکھ لیا۔ اس افسانے کا موضوع 'مخلصی موت' (Euthanasia) ہے اور اس وقت تک شاید کسی بھی افسانہ نگار نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا تھا۔ افسانہ روزنامہ آفتاب کی بجائے روزنامہ ہمدرد میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ کچھ برس بعد میں نے اپنے سبھی افسانے نذرِ آتش کر لیے۔ لیکن بہت عرصہ بعد ان سبھی تلف شدہ افسانوں کو یادوں کے کھنڈرات سے نکال کر از سرِ نو قلم بند کر لیا۔ یہ افسانہ میرے پہلے افسانوں کے مجموعے 'ادھورے چہرے' میں بعنوان 'خودکشی' شامل ہے۔

(س۱۱) ادبی ذوق میں آپ کسے اپنا استاد مانتے ہیں؟

(ج۱۱) اردو میں میں نے کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا نہ کسی سے کوئی رہنمائی حاصل کی۔ جو کچھ سیکھا اپنے دم پر سیکھا۔ اردو میں میری کوئی فارمل تعلیم بھی نہیں ہے۔ گو ادیب اور ادیب ماہر کے لیے اورئینٹل کالج جاتا تھا مگر وہاں زیادہ کچھ سیکھنے کو نہیں ملا۔ اتنا ضرور ہے کہ وہاں میں نے خوشنویسی سیکھ لی جس کے لیے میں جی ایم وفائی مرحوم کا رہین منت ہوں۔

(س۱۲) آپ نے شمس الرحمٰن فاروقی سے مرعوب ہو کر لکھنا ترک کیا، کیوں؟

(ج۱۲) میں نے پہلے بھی عرض کی کہ مجھے اردو میں کوئی فارمل تعلیم نہیں ملی۔ گو انڈین سول سروسز امتحانات میں اردو میرا اختیاری مضمون تھا اور مجھے امتیازی نمبرات حاصل ہوئے تھے پھر بھی نہ جانے کیوں کھٹکا سا لگا رہتا تھا کہ مجھے اردو میں وہ مہارت نہیں ہے جو ہونی چاہیے۔ خوش قسمتی سے میرا پروبیشن (تربیت) یو پی سرکل، لکھنؤ میں طے پایا اور وہاں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے، جو اس وقت ڈائریکٹر پوسٹل سروسز تھے، ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ سوچا چلو ان کو اپنے افسانے دکھاؤں مگر اس طرف دھیان نہیں گیا کہ وہ تو جدیدیت کے علمبردار ہیں جبکہ میرا اسلوب حقیقت پسند اور وضاحتی ہے، پھر ان کو میرے افسانے کیونکر پسند آئیں گے۔ انھوں نے دو تین دن کے بعد افسانے لوٹا دیے اور کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ صرف ایک تجریدی افسانے 'جاگو' کے بارے میں کہا کہ اس کا آخری پیراگراف غیر ضروری ہے۔ ان دنوں مجھے اپنی تخلیقی صلاحیت پر اعتماد نہیں تھا اس لیے میں یہ سمجھ بیٹھا کہ شاید میری نگارشات کا معیار اتنا اچھا نہیں ہے کہ فاروقی صاحب ان پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے۔ انجام کار کچھ خوف سا دل میں بیٹھ گیا جس میں فاروقی صاحب کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ میرے اندر ہی احساس کم تری تھا۔

(س۱۳) جب آپ شیلانگ میں تھے، آپ نے ساری تخلیقات نذرِ آتش کر لیں، کیوں؟

(ج۱۳) تخلیق کار، وہ شاعر ہو یا فکشن نگار بہت ہی حساس ہوتا ہے۔ سو میں بھی ہوں۔ ازدواجی زندگی کی ناکامی کے باعث میں ہمیشہ ذہنی طور پر اضطراب کا شکار رہا۔ جن دنوں میں شیلانگ میں تھا، غالباً ۱۹۸۲ء کا سن تھا، میں اپنی زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ مجھے ایسا گماں ہوا کہ میرے اضطراب کی وجہ میری تخلیقی طلب ہے جو مجھے سکون سے بیٹھنے نہیں دیتی حالانکہ میں نے ۱۹۷۸ء سے لکھنا ترک کیا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ رہی سہی باقیات جو مجھے اپنے ماضی کی یاد دلاتی ہے، اس کا بھی نام ونشان مٹا دوں۔ اسی وقتی جنون کی زد میں آکر میں نے اپنی مطبوعہ وغیر مطبوعہ نگارشات نذرِ آتش کر دیں۔ دراصل جذباتی لوگ کرتے پہلے ہیں اور سوچتے

اس کے بعد ہیں۔ باقی ماندہ عمر پچھتانے کے لیے پڑی رہتی ہے۔ یہی حال میرا بھی ہوا۔ ۱۹۹۶ء تک میں اس خلش کا شکار رہا۔ پھر گھریلو حالات نے نئے سرے سے کروٹ لی اور مجھے دوبارہ ہاتھ میں قلم اٹھانے پر مجبور کرلیا۔ شکر ہے کہ میں نے تلف شدہ افسانوں کو ازسرِنو قلم بند کیا اور اس طرح اس کھوئی ہوئی دنیا کو دوبارہ تخلیق کیا۔

(س۱۴) کیا آپ کے بچے اردو پڑھتے ہیں؟

(ج۱۴) میری پوسٹنگ ہندستان کے طول وعرض میں ہوتی رہی۔ بہت ساری جگہوں پر اردو نام کی کوئی چیز بھی نہیں ملتی۔ اس لیے میرے بچوں نے سکولوں میں ہندی کو بطور اختیاری مضمون لے لیا۔ کسی کو اردو سے واقفیت نہیں ہے۔

(س۱۵) آج کا ادب تخلیق سے زندہ ہے یا تنقید سے؟

(ج۱۵) یہ دوفرعیت (dichotomy) ادب کو نقصان پہنچاتی ہے۔ تخلیقی ادب اتنا ہی ضروری ہے جتنا انتقادی ادب۔ جب ادب تخلیق ہی نہیں ہوگا، اس پر تنقید کون کرے گا؟ اردو صرف غالبؔ اور اقبالؔ کے سہارے تو نہیں زندہ رہ سکتی۔ زبان تب زندہ رہتی ہے جب ہر دور میں اس کے لکھنے والے اور پڑھنے والے بکثرت موجود ہوں۔ میرے خیال میں تخلیق مقدم ہے اور تنقید ثانی کردار ادا کرتی ہے۔

(س۱۶) آپ کی کئی کہانیوں کا ترجمہ ہندی، کشمیری، انگریزی، تیلگو اور مراٹھی میں ہوا ہے اور وہ رسالوں میں چھپ چکی ہیں۔ ان کی تفصیل بتائیں؟

(ج۱۶) تفصیل یوں ہے: میرے دو مجموعے 'ادھورے چہرے' اور 'چنار کے پنجے' ہندی میں بالترتیب ۲۰۰۵ء اور ۲۰۱۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ افسانہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' انگریزی اینتھالوجی Pigeons of the Domes(Stories on communalism) edited by Rakhshanda Jalil 2005 میں شامل ہے۔ کچھ افسانے جو دوسری زبانوں میں چھپے ہیں یوں ہیں: (۱)[ہندی] بٹی ہوئی عورت (سریتا دہلی)، کینچلی (سند پٹنہ)،

ڈرفٹ وُڈ (سرس سلیل، دہلی)، کالا گلاب (ڈاک پتریکا دہلی/سرس سلیل دہلی)، اچانک (کوشر سماچار دہلی، روپ کی شوبھا دہلی)، ایک نہتے مکان کا ریپ (کوشر سماچار دہلی)، مخبر (کوشر سماچار دہلی)، سرحدیں (جن ستہ وارشک انک ۲۰۱۰ء)، کاگ پورنیما (کوشر سماچار دہلی)؛ (۲) [انگریزی] مخبر (The Informer، کشمیر سینٹینل، شہجار آن لائن)، گھونسلا (The Nest شہجار آن لائن)، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (At the Zebra Crossing جرنلزم ٹوڈے، ۲۰۱۳ء، اڑیسہ)؛ (۳) [تیلگو] اچانک (وپلا آندھرا)، راکھ کا ڈھیر (روی وار وشال آندھرا، تیلگو دینک، وجے واڑہ)، مخبر (کے این این آن لائن، پوڈو)، گھونسلا (کے این این آن لائن، پوڈو)، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (ای ماٹا ویبز ین ۲۰۱۳ء)؛ (۴) مراٹھی: بُدھ کی مسکراہٹ (ساہتیہ سوچی ۲۰۱۲ء)؛ [کشمیری] اچانک (ہرموکھ بڈگام)، گھونسلا (واکھ دہلی)

(س ۱۷) آرٹ، پینٹنگ، کارٹون، صحافت اور باغبانی کے متعلق کچھ بتائیں۔

(ج ۱۷) آرٹ اور پینٹنگ میں مجھے بچپن ہی سے شوق تھا۔ چونکہ میرے پتا جی اپنی دکان پر وُڈ کارونگ اور پیپر ماشی بیچتے تھے، اس لیے مجھے پیپر ماشی کے کاریگروں سے مصوری سیکھنے میں بہت مدد ملی۔ ان سے میں نے پیڑ پودے، پتیاں اور پھول خاص کر چنار، انگور، گلاب، کنول وغیرہ اور پرندے مثلاً بلبل، رام چڑیا، مرغ سلیمان وغیرہ بنانا سیکھ لیا۔ یہ شوق بہت شدت اختیار کر گیا، پتا جی نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی تاہم پینٹنگ کو کیرئر بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی کیونکہ وہ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ پوسٹ گریجویشن کے دوران میرے پھوپھا جی نے مجھے اپنے ایک دوست، میر راجپوری کے پاس بھیج دیا تاکہ میں اس کے اخبار 'جہان نو' میں کارٹون بناؤں۔ پہلا کارٹون اسی اخبار کے لیے بنایا۔ البتہ وہاں زیادہ دیر نہیں ٹک سکا۔ پھر عقاب، نوجیون اور ہمارا کشمیر کے لیے بھی مختصر مدت کے لیے کارٹون بناتا رہا۔ کارٹون بنانے کے ساتھ ہی صحافت میں بھی دلچسپی بڑھی۔ اس لیے عقاب میں بطور جائنٹ ایڈیٹر کام کر لیا اور کالم و مضامین لکھتا رہا۔ جہاں تک باغبانی کا تعلق ہے، چونکہ میں ایم ایس سی (باٹنی) ہوں اس لیے مجھے باغبانی سے بے حد دلچسپی تھی۔

پھوپھا کے باغ میں گلاب لگائے مگر باضابطہ طور پر پہلی دفعہ متھرا میں آفیسرس میس کا باغ بنایا، جس کے لیے آگرہ تاج محل نرسری سے گھاس اور پودے لے آیا اور ان سے باغ کی تزئین کی۔ متھرا کینٹ میں مجھے کنٹونمنٹ کی شجرکاری کا کام بھی سونپا گیا۔ بعد میں میں نے پوسٹل سٹاف کالج (رفیع احمد قدوائی نیشنل پوسٹل اکیڈمی) اور بروڑہ پی ایم جی بنگلے میں بھی باغات لگائے۔

(س ۱۸) آپ نے کس اخبار کے لیے پہلا کارٹون بنایا؟

(ج ۱۸) جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے میں نے پہلا کارٹون روزنامہ 'جہان نو' سرینگر کے لیے بنایا جو سابقہ منسٹر جناب میر راجپوری کی ملکیت تھا۔ میرے پھوپھا آنجہانی شام لال صراف نے انھیں میرے اس شوق کے بارے میں بتایا تھا۔

(س ۱۹) آپ کا پہلا افسانہ، جو دوردرشن میں ٹیلی کاسٹ ہوا، کون سا تھا؟

(ج ۱۹) میر پہلا افسانہ جو ٹیلی کاسٹ ہوا، اس کا نام تھا 'ریزے'۔ غالباً ۱۹۷۳ کی بات ہے، میں کشمیر ایمپوریم میں ملازم تھا، ٹیلی ویژن سنٹر بالکل نزدیک تھا، وہاں میرے کئی دوست تھے اور میں اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ ان دنوں کشمیر دوردرشن سے پرڈیوسر ظفر احمد 'ایک کہانی' عنوان کے تحت کسی ایک افسانے کو ڈرامائی روپ دے کر پیش کرتے تھے۔ مظہر امام صاحب سٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ ظفر احمد چنانچہ چھٹی پر گھر چلے گئے اس لیے ان کا چارج ان کے اسسٹنٹ قیوم وڈیرہ نے لے لیا اور بات بات میں مجھ سے کہا کہ میں کسی اچھی سی کہانی کو ڈرامائی روپ دے کر لے آؤں۔ میں نے افسانہ 'ریزے' چن لیا جس میں ویسے بھی وہ ساری خصوصیات موجود تھیں جو ایک کامیاب ڈرامہ کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ دو چار روز میں میں نے اس کو ڈرامائی روپ میں مکمل کیا اور قیوم وڈیرہ کو دکھایا۔ انھوں نے مظہر امام صاحب سے منظوری لے کر کچھ ہی دنوں میں اسے پیش کیا۔ ہیرو کا رول میرے ہی ایک قابل دوست بمل مسری نے انجام دیا۔ مجھے ان کی اس صلاحیت کے بارے میں پہلے معلوم نہ تھا۔ بہر حال جب ڈرامہ ٹیلی کاسٹ ہوا میں مطمئن نہ ہو سکا۔ کچھ کمی کا احساس ہوا جس کے باعث میں نے پھر کبھی ڈرامہ کی طرف دھیان نہیں دیا۔ بہت برس پہلے بالی

ڈ ڈے لوٹے ایک آرٹسٹ، جناب حسن خان نے مجھ سے ٹیلی سیریل کے لیے ایک اور کہانی لی اور اس کی پے منٹ بھی کر لی مگر کچھ نجی حالات کے سبب وہ مجوزہ سیریل مکمل نہیں کر پائے۔

(س۲۰) آپ نے پہلا ڈرامہ 'بندھن' تحریر کیا مگر پھر ڈرامے کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوئے؟

(ج۲۰) ڈرامہ کے لیے سازگار ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک ڈرامہ کھیلنے والے اور ناظرین دونوں میں جوش و ولولہ نہ ہو ڈرامہ محض خانہ پُری کا عمل بن کر رہ جاتا ہے۔ کشمیر میں ڈرامہ کا اتنا چلن نہیں ہے۔ ڈرامہ 'بندھن' رقم کرنے کے بعد میں نے نورنگ ڈرامائک کلب اور پھر کلا کیندر ڈرامائک کلب جوائن کر لیا مگر کہیں بھی تشفی نہ ملی۔ ڈرامہ کلب جوائن کرنے کا میرا مقصد یہی تھا کہ ڈرامہ نگاری سے واقف ہو جاؤں اور خود ڈرامے لکھوں۔ دو چار ڈراموں میں بطور کردار کام بھی کیا۔ مگر بات نہیں بنی اور آخر کار ڈرامہ سے کنارہ کشی کر لی۔ اس کے بعد روزگار کی تلاش میں کافی عرصہ تک دربدر بھٹکتا پھرا اور ڈرامہ کو بھول گیا۔

(س۲۱) ادیبوں کی گروہ بندی کے متعلق آپ کا نظریہ یہ ہے کہ اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے گروہ بندی ضروری ہے، کیوں ضروری ہے؟

(ج۲۱) مجھے نہیں معلوم میں نے کہاں کیا کہا اور آپ نے کیا سمجھا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو میں جو لوگ کسی کیمپ یا گروہ کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں ان کی چاندی ہوتی ہے۔ گروہ کے بارسوخ سربراہ ان کی پیٹھ ٹھوکتے ہیں، ان کی کتابوں پر ریویو لکھ کر ان کی مارکیٹنگ کرنے میں مدد کرتے ہیں اور ناشاعر کو بھی بحیثیت شاعر پیش کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ترقی پسندوں نے اپنی ایک جماعت بنائی تھی اور پھر ایک زمانہ آیا کہ جدیدیوں نے اپنی الگ جماعت بنالی۔ موجودہ دور میں ایک طرف شمس الرحمٰن ہیں اور دوسری طرف گوپی چند نارنگ ہیں۔ دونوں اپنے اپنے خیموں کی آبیاری کرتے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ ترقی پسند دور میں سعادت حسن منٹو جیسا جیالا بھی نکلا جس نے باوجود برأت کے سب کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔ میں خود کسی گروہ کا رکن نہیں ہوں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ دس تصانیف رقم کرنے کے بعد بھی کسی نے نہ تو مجھے اعزاز کے قابل سمجھا اور نہ ہی ایوارڈ کے۔ اس کے باوجود میں تخلیقی عمل میں مصروف رہتا ہوں۔

(س ۲۲) گاندھی جی کے اصولوں سے آپ بہت متاثر تھے مگر پوری طرح سے ان سے سہمت نہیں ہیں، کیوں؟

(ج ۲۲) دراصل مجھے گاندھی جی کا تعارف اپنے پھوپھا کی بدولت ہوا جو خود ایک کٹر گاندھی وادی تھے۔ وہ گاندھی جی کی طرح سادہ زندگی اور بلند خیالی کو پسند کرتے تھے۔ میں نے کالج کے دنوں میں گاندھی جی کی کئی کتابیں نوجیون پبلکیشنز سے خرید کر پڑھیں اور بہت متاثر ہوا۔ بہت حد تک ان کے نقش قدم پر چلا۔ بعد میں جب میں عملی زندگی میں داخل ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ گاندھی جی کے اصول ذات کے لیے تو کارگر ہیں مگر اجتماعی زندگی میں ان پر عمل کرنا مشکل ہے۔ اگر آدمی ان کے اصولوں پر صحیح معنوں میں عمل کرنا چاہے تو اسے فقیر یا سنیاسی بننا پڑے گا۔

(س ۲۳) اپنی پسندیدہ خوشبو اور رنگ بتائیں؟

(ج ۲۳) خوشبو کا میں قائل نہیں۔ قدرت نے انسان کو اپنی مخصوص خوشبو عطا کی ہے پھر مصنوعی خوشبو چھڑکنے سے کیا فائدہ۔ میں بالوں میں آملہ تیل کے علاوہ کوئی پاوڈر، کریم یا عطر استعمال نہیں کرتا۔ جہاں تک رنگوں کا تعلق ہے، مجھے نیلا رنگ بہت پسند ہے کیونکہ اس میں پانی جیسی ٹھنڈک ہے، سمندر جیسی گہرائی ہے اور آسمان جیسی وسعت ہے۔

(س ۲۴) کیا آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں؟

(ج ۲۴) میں ناستک ہوں اس لیے خدا اور مذہب (چاہے کسی بھی نام سے منسوب کیجیے) پر یقین نہیں رکھتا۔ میری طبعیت کا میلان سائنس سے ہے۔ ڈارون کی انسانی ارتقا کی تھیوری سے مجھے پورا اتفاق ہے۔

(س ۲۵) کشمیر کے تعلق سے کچھ رائے دیجیے۔

(ج) کشمیر میری جنم بھومی ہے۔ گو اب میں وہاں نہیں رہتا مگر اس کو بھولنا مشکل ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے کشمیر سچ مچ جنت تھی جس میں سبھی مذہبوں اور مسلکوں کے لوگ رواداری کے ساتھ رہتے تھے۔ چالیس برس کی عمر تک نہ میں نے کہیں کوئی فرقہ وارانہ فساد دیکھا اور نہ کہیں کوئی قتل وغارت۔ ہاں کبھی کبھار سنّی وشیعہ فرقوں اور شیر وبکرا گروہوں کے بیچ کہاسنی ہوتی تھی جو پتھراؤ اور کانگڑی جنگ کے ساتھ ہی اختتام کو پہنچتی تھی۔ مگر ۱۹۹۰ء میں حالات نے جو موڑ لیا وہ بہت خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ میرا یہ ماننا ہے کہ تشدّد کسی چیز کا حل نہیں ہے۔ اس سے قومیں برباد ہو جاتی ہیں۔ ہندستان اور ساؤتھ افریقہ میں جنگ آزادی عدم تشدد سے لڑی گئی۔ کوئی وجہ نہیں کہ کشمیریوں کی امنگوں کو عدم تشدد سے انجام تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ اس وقت کشمیر ہندستان اور پاکستان کے بیچ پس رہا ہے اور کشمیری یہ طے نہیں کر پاتے کہ دوست کون ہے اور دشمن کون؟ میں بس دعا کر سکتا ہوں کہ کشمیر میں دوبارہ امن بحال ہو اور لوگ پھر سے اسی آب وتاب کے ساتھ زندگی گزاریں۔

(س ۲٦) نئی نسل کو آپ کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

(ج ۲٦) پیغام دینے کا میں قائل نہیں البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ہم پر ذرائع ابلاغ کے ذریعے کلچرل تسلط ہو رہا ہے اور ہم اپنی روایتوں کو چھوڑ کر مغرب زدہ ہو رہے ہیں۔ میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ عالمی گاؤں میں ہمیں آپسی تعامل بڑھانا چاہیے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنی ثقافت کو نہ بھولیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ ہمیں فرسودہ روایات کو ترک کرنا چاہیے تا کہ وہ ہماری ترقی میں رکاوٹ نہ پیدا کر سکیں۔ ایک پیڑ کی مانند ہماری جڑیں اپنی زمین میں پیوست ہونی چاہئیں مگر ہماری شاخیں آسمان کی جانب بڑھتی رہنا چاہئیں۔

☆☆☆

ایم فل مقالے 'دیپک بدکی کی افسانہ نگاری، روح کا کرب اور ریزہ ریزہ حیات کے حوالے سے' کے لیے لیا گیا انٹرویو؛ مقالہ نگار ریاض احمد نجار

ایک ملاقات - دیپک بُد کی کے ساتھ

- ڈاکٹر اشرف آثاری، کشمیر

کشمیر اور کشمیریوں نے اردو زبان وادب کو بہت کچھ دیا ہے اور دے رہے ہیں۔ جہاں اردو شاعری میں علامہ اقبالؔ کا تعلق اسی سرزمین کشمیر سے تھا وہاں کرشن چندر، منٹو، میرا جی سے لے کر موجودہ دور میں پروفیسر حامدی کاشمیری، حکیم منظور، شہ زور کاشمیری جیسے نابغۂ روزگار کشمیر کے سخنوروں کو کون نہیں جانتا جنھوں نے ہر مرحلے پر اردو زبان وادب کی ترقی و ترویج کے لیے کام کیا اور کر رہے ہیں۔ ادب کی مثالی خدمت کے لیے انھیں اور ان جیسے ہی لاتعداد تخلیق کاروں کو ہر دور میں یاد کیا جاتا ہے اور ان کے جذبے اور عمل کو سراہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اردو زبان کے وجود میں آنے کے وقت سے ہی جاری ہے اور غالباً رہتی دنیا تک جاری بھی رہے گا۔

اردو شاعری اس وقت میرا موضوع نہیں ہے۔ جہاں تک اردو فکشن کا تعلق ہے اس میں بھی کئی سربرآوردہ قلم کار پیدا ہوئے ہیں اور آج بھی ہمارے درمیان فخرِ اردو زبان وادب پروفیسر حامدی کاشمیری جیسے قلم کار موجود ہیں۔

اگر اردو افسانہ کی بات کریں تو اس میدان میں بھی کئی شہسوار اسی خطۂ ارضی سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ جن میں بطور خاص سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، قدرت اللہ شہاب، کشمیری لعل ذاکر، پروفیسر حامدی کاشمیری، نور شاہ، موہن یاور، پشکر ناتھ، پروفیسر مخمور حسین بدخشی جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ اور ان کے بعد آنے والے ویریندر پٹواری، دیپک بُد کی، حسن ساہو، وحشی سعید، عمر مجید، دیپک کنول، شمس الدین شمیم، راجہ نیاز بونیاری، انیس ہمدانی، زاہد مختار، مشتاق مہدی، غلام نبی شاہد جیسے فن کار شامل ہیں۔ اس کارواں میں لاتعداد لوگ شامل تھے، شامل رہے اور شامل ہوں

گے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔

دیپک بُدکی اردو ادب میں فکشن نگاری کے توسل سے ایک اہم نام ہے۔ اسی سرزمین سے ان کا تعلق رہا ہے۔ ڈوگرہ دور میں کشمیر کے اہم تجارتی مرکز مہاراج گنج سے ان کا تعلق ہے۔ یہ علاقہ ادبی اور علمی سرگرمیوں کے لحاظ سے بھی ایک زرخیز علاقہ تھا۔ کشمیری زبان کے معروف گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ مفکر پروفیسر رحمان راہی اور پروفیسر حامدی کاشمیری کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔

دیپک بدکی کا تعلق اسی مردم خیز علاقے سے ہے جو کشمیر کی تواریخ میں وقوع پذیر ہونے والے ہر چھوٹے بڑے سیاسی اور سماجی انقلاب وتبدیلی کے گواہ دریائے جہلم یا وتستا کے کنارے پر آباد ہے اور جس کے ایک کنارے پر حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کی خانقاہ میں ہر صبح درود واذکار کی روح پرور محفلیں سجتی اور سنورتی ہیں اور اسی کی عقب میں مہا کالی کے مندر میں گھنٹیاں اور شنکھ بجتے رہتے ہیں، ایک کنارے پر بڑے بڑے پتھروں سے بنائی گئی قدیم خوبصورت پتھر مسجد دعوت نظارہ دے رہی ہے تو دوسرے کنارے پر رام کول مندر کا کلس نظر آتا ہے، ایک کنارے پر کشمیر کے ایک نامور خداترس بڑے بادشاہ زین العابدین بڈشاہ کا مقبرہ دیدہ عبرت بنا ہوا ہے تو اس سے کچھ ہی دوری پر ریشی پیر کی خانقاہ ملتی ہے۔

ہاں اسی علاقے میں ایک کشمیری پنڈت کے گھر میں اپنی تین بہنوں کے اکلوتے بھائی دیپک بُدکی نے آنکھ کھولی۔ والد محترم کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں ملازم تھے۔ تعلیم مکمل کر کے زندگی کی تگ ودو شروع ہوگئی۔ آنجہانی والد کو اپنے اکلوتے بیٹے دیپک کے توسل سے کافی پریشانی لاحق تھی۔ اس کے علاوہ بھی اسے اپنی تین بیٹیوں کے مستقبل کی فکر تھی۔ جوں توں کر کے بیٹا برسر روزگار ہوگیا۔ والد نے اسے اپنی ہی محکمے کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں منیجر بنتا ہوا دیکھا۔ درس و تدریس کے ساتھ بھی کچھ مختصر وقت کے لیے وابستہ رہے کہ بالآخر انڈین پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف محکمے میں آفیسر اور بعد میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے تک پہنچ گئے۔

؎ نوکِ قلم سے اب تو ٹپکنے لگا لہو　　　حالاتِ زندگی کو کہاں تک کریں رقم

حالاتِ زندگی کو رقم کرنے کا نہ یہاں موقع ہے نہ مقصد، صرف مختصر سا تعارف پیش کرنا مقصود تھا۔

دیپک بُدکی نے گو کہ اردو زبان اور اردو فکشن کے کاکل سجانے سنوارنے کا منصب ساٹھ کی دہائی کے آس پاس ہی ہاتھ میں لیا لیکن باقاعدہ ان کی افسانہ نگاری ستر کی دہائی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ جب انھوں نے بطور افسانہ نگار کشمیر میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تو ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ان سے بزرگ افسانہ نگار پروفیسر حامدی کاشمیری، نور شاہ، عبدالغنی شیخ لداخی، مخمور حسین بدخشی، حسن ساہو پہلے ہی میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ دیگر معاصر افسانہ نگاروں میں عمر مجید مرحوم، وحشی سعید، جان محمد آزاد، ڈاکٹر اشرف آثاری، زاہد مختار، دیپک کنول، شیخ بشیر احمد، رشید راہگیر لداخی، واجدہ تبسم اور دیگر لاتعداد افسانہ نگار موجود تھے اور بعد میں آنے والوں میں ناصر ضمیر، ایثار کشمیری، نیلوفر ناز نحوی وغیرہ بھی اس کارواں میں شامل ہو گئے جو اب تک لکھ رہے ہیں اور رسائل و جرائد میں چھپ بھی رہے ہیں۔

دیپک بُدکی کشمیر سے باہر اپنی ملازمت کے سلسلے میں مقیم رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اب غازی آباد یو پی میں مقیم ہیں۔ حال ہی میں وہ کشمیر تشریف لائے تھے۔ ان کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر یہاں کے ادبی ادارے متحرک ہو گئے اور انھیں اپنے ہاں مدعو کرتے رہے۔ ریڈیو کشمیر سرینگر کے پروگرام میں ان کی شرکت رہی، جہاں انھوں نے دیگر شرکاء کے ساتھ اپنی زندگی اور اپنے فن کے متعلق بات کی اور پروگرام کے پروڈیوسر ستیش وِمل اور دیگر لوگوں کے سوالات کے جوابات دیے۔ نگینہ انٹرنیشنل نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ اس مختصر سی نشست میں نور شاہ اور ڈاکٹر اشرف آثاری میزبانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کے علاوہ معروف صحافی وجیہہ احمد اندرابی، مشتاق کینی، زبیر قریشی اور رشید راہگیر لداخی بھی ابتدا سے موجود رہے اور بعد میں اختتامی لمحات میں شیخ بشیر احمد بھی شامل ہو گئے۔

نگینہ انٹرنیشنل کے چیف ایڈیٹر وحشی سعید دہلی میں مقیم تھے، انھوں نے ریسٹورنٹ کے منیجر جناب الطاف صاحب سے اچھی خاصی خاطر و مدارت کروائی۔ دوسرے دن وجیہہ احمد اندرابی نے اپنے اردو ہفت روزہ 'جبروت' کے ادب نامے میں 'دیپک بُدکی کشمیر میں' کے عنوان سے ایک مفصل اور فکر انگیز استقبالی ایڈیٹوریل بھی چھپوایا۔

نور شاہ اور احقر نے پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا کہ دیپک بُدکی کے ساتھ دوران گفتگو نگینہ انٹرنیشنل کے اگلے شمارے کے لیے ایک ادبی انٹرویو بھی ترتیب دیا جائے گا۔ جس طرح اس سے قبل 'بیسویں صدی' دہلی کی مدیرہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی صاحبہ کے دورہ کشمیر پر لیا گیا انٹرویو قارئین نگینہ تک پہنچا دیا گیا۔ اور اسے پسند کیا گیا۔

چائے ناشتے سے فراغت کے بعد انٹرویو کا سلسلہ سنجیدہ انداز میں شروع ہو گیا۔ اس ادبی بحث و مباحثے کی ابتدا بھی احقر نے ہی دیپک بدکی صاحب سے اس سوال سے شروع کی۔

اشرف آثاری: دیپک بُدکی صاحب کشمیر میں اردو فکشن نگاری اور اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

دیپک بُدکی: میں بہت حد تک مطمئن ہوں۔ میرے خیال میں کشمیر اردو زبان و ادب کے ایک بہت بڑے مرکز کی طرح ابھر رہا ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیز میں اردو طلبہ کی اچھی خاصی تعداد داخلہ لیتی ہے۔ اخبار اور رسائل کی تعداد تسلی بخش ہے۔ اور اردو کتابوں کی اشاعت بھی اچھی خاصی ہو رہی ہے۔ اردو پڑھنے اور بولنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ شاید اس لحاظ سے بھی کہ یہ تینوں خطوں، جموں، کشمیر اور لداخ کے رابطے کی زبان ہے۔

اشرف آثاری: میں آپ کی بات سے مطمئن ہوں۔ یہاں کے قدیم دانش گاہ میں اردو کلاسز میں پے منٹ سیٹس (Payment seats) پر بھی داخلہ ہوا تھا۔ اس سب کے باوجود بھی ملک کی دیگر یونیورسٹیز میں اردو مضمون میں خاصی تعداد میں طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جو ایک اچھا اور صحت مند قدم اور تسلی بخش بات ہے۔

نورشاہ :بُدکی صاحب ترقی پسند دور کے بعد جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ادوار آئے ۔جدیدیت کے زیر اثر لکھے گئے افسانوں میں 'تجریدیت' 'لایعنیت' والا معاملہ تھا یا پھر کہانی پن کی گمشدگی اور قاری و کردار کی موت ۔ان ادوار سے اردو افسانہ اب نکل آیا ہے، آپ اسے آج کہاں پا رہے ہیں؟

دیپک بُدکی : افسانہ شاید اردو شاعری میں غزل کی طرح ہی ایک پسندیدہ صنف اردو ادب ہے ۔اس بات کے باوجود کہ شمس الرحمٰن فاروقی ابتدا میں اس کے مخالف اور اردو ناول کے دلدادہ تھے، افسانہ ہر دور میں مقبول رہا۔کم یا زیادہ مقبول!....البتہ بیچ میں افسانہ اپنی اصل ڈگر سے ہٹ گیا تھا لیکن آج یہ اپنی اصل حالت پر لوٹ آیا ہے ۔جہاں تک آج کے اردو افسانے کا تعلق ہے، میں مطمئن ہوں کہ کئی اچھے لکھنے والے موجود ہیں جنھوں نے شاہکار افسانے تحریر کیے ہیں اور یہ عمل جاری ہے۔

اشرف آثاری: بُدکی صاحب کیا وجہ ہے کہ ترقی پسندی کے بعد جدیدیت کے دور سے ہوتے ہوئے آپ یہاں تک پہنچے لیکن آپ کا اپنا اسٹائل تبدیل نہیں ہوا؟ یا پھر نورشاہ کی بات کرتے ہیں، نورشاہ بھی لگ بھگ نصف صدی سے اردو افسانوی ادب کے کاکل سنوارنے سجانے میں لگے ہوئے ہیں لیکن ان کا اسٹائل بھی تبدیل نہیں ہوا۔ان کے تخلیق کردہ افسانوں میں ان کی انفرادیت برقرار رہتی ہے ۔حقیقت نگاری سے علامت نگاری کی طرف نہ یہ کبھی گئے اور نہ ہی تجریدیت یا لایعنیت کی ہوا انھیں اپنے ساتھ اٹھا کر لے گئی ۔حالانکہ اس نہج کے تخلیق کاروں کے ساتھ ان کے روابط بھی رہے ہیں۔

دیپک بُدکی : اردو میں ایسے افسانہ نگاروں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے کہ بقول کسے جو کھڑکی کھول کر تازہ اور خوشگوار ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز تو ہوئے لیکن تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اُڑ نہیں گئے ۔آپ نے نورشاہ کی بات کی ، نورشاہ کا اسٹائل بھی تبدیل ہوگیا لیکن ان کی تبدیلی اس طرح کی تبدیلی نہیں تھی ۔

وجیہہ احمد اندرابی: دیپک بُدکی صاحب، ملک کی مختلف یونیورسٹیز میں آپ کی شخصیت اورفن پر کام ہوا ہے، کئی ریسرچ اسکالروں نے آپ پر ایم فل یا پی ایچ ڈی کیا ہے اور شاید کر بھی رہے ہوں گے، کیا آپ کو نہیں لگ رہا ہے کہ مقامی دانش گاہوں میں 'گھر کی مرغی دال برابر' والا معاملہ ہے۔ مقامی ادیبوں، قلم کاروں اور شاعروں کو یہاں اس طرح کی پذیرائی نہیں ملتی جب کہ دوسری جگہوں پر انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔

دیپک بُدکی: میری شخصیت اور فن پر کام کرنے والے اگر چہ زیادہ طالب علم مقامی ہیں لیکن انھوں نے یہ کام غیر ریاستی یونیورسٹیوں کے توسل سے کرلیا ہے اور کر رہے ہیں، یہی حقیقت ہے۔

رشید راگبیر لداخی: آپ کی اکثر کہانیوں کے واقعات و کردار کشمیر کے مقامی واقعات و کردار ہیں۔ کشمیر کے باہر بود و باش اختیار کر کے آپ کو کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ اُن سے بچھڑ چکے ہیں اور آج بھی آپ کا تخلیقی عمل جاری ہے۔ آپ ایسا محسوس تو نہیں کر رہے ہیں کہ آپ آج جہاں بیٹھے ہیں، بود و باش اختیار کیے ہوئے ہیں یا سانس لے رہے ہیں، یا جس ماحول کو آپ اپنا چکے ہیں آپ اسی کا حصہ ہیں جو آپ کے ماضی پر حاوی ہو چکا ہے؟

دیپک بُدکی: جی نہیں۔ کشمیری دنیا میں جہاں پر بھی بود و باش اختیار کیے ہوئے ہوگا یا رہ رہا ہوگا، اپنے ماضی سے جڑا ہوا رہتا ہے۔ اور اپنے لوگوں سے گھرا ہوا بھی۔ ملازمت کے سلسلے میں، کشمیر سے باہر رہا اور وہاں جو اچھے اور معیاری افسانے تخلیق ہوئے ان میں سے اکثر میرے ماضی سے جڑے ہوئے تھے اور ان کے کردار و واقعات خالصتاً کشمیری ہی تھے، بلکہ میری آپ بیتی کہہ دیجیے۔

شیخ بشیر احمد: آپ اپنے مادر وطن سے تعلق رکھنے والے اردو افسانہ نگاروں سے واقف ہیں، کیا ان کی تحریریں اردو کے مختلف معیاری ملکی رسائل و جرائد کے توسل سے آپ تک پہنچتی ہیں یا نہیں؟

دیپک بُدکی: میں سبھی رسائل وجرائد نہیں پڑھ پاتا البتہ موصول شدہ کتابوں کے انبار میرے آس پاس لگے رہتے ہیں۔اس لیے مجھے یہاں کے نئے ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں کے متعلق زیادہ جانکاری نہیں ہے۔البتہ جن کے افسانوی مجموعے میرے زیرِ مطالعہ رہے ہیں یا جن کو میں نے دیکھا ہے یا جن کے ساتھ میرے تعلقات و مراسم رہے ہیں یا پھر جنھیں میں قبل بھی پڑھ چکا ہوں ان میں سے اکثر کے ساتھ میرے روابط بدستور ہیں۔ میں نے جموں و کشمیر کے کئی افسانہ نگاروں پر مضامین یا ان کی کتابوں پر تبصرے رقم کیے ہیں جو میری تنقیدی کتابوں میں شامل ہیں۔

مشتاق کینی: بُدکی صاحب آپ کا علم و ادب کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے،علم سے میری مراد درس و تدریس ،ادب اور افسانہ نگاری ہے۔قلیل مدت کے لیے ہی سہی آپ ایک مدرس بھی رہے ہیں کیا ان دونوں کا ایک ہی مقصد یعنی 'اصلاح' ہے۔

دیپک بُدکی:دونوں کا مقصد الگ الگ اور ہمہ رخی ہے۔

اشرف آثاری:قطع کلامی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔دراصل اس سوال یا پھر اس جیسے ہی سوال کا جواب معروف اردو افسانہ نگار انتظار حسین نے اس طرح دیا ہے۔جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے افسانوی ادب کا کوئی اصلاحی پہلو بھی ہے؟ تو جواب میں کہنے لگے کہ کچھ لوگ گلاب کا پودا اس لیے لگاتے ہیں کہ انھیں گل قند درکار ہوتا ہے۔گلاب کے پھول کے اور بھی مصرف ہوسکتے ہیں۔

وجیہہ احمد اندرابی: واقعی کوئی اس کو جوڑے میں سجالیتا ہے،کوئی اسے عرق گلاب کشید کر لیتا ہے یا پھر میر تقی میرؔ جیسے شاعر اسے محبوب کے لب و رخسار سے تشبیہ دیتا ہے وغیرہ۔

نور شاہ: کافی دنوں کے بعد اس محلے میں،ان گلیوں میں جہاں آپ کا بچپن گزرا ہے، چلتے ہوئے چھوٹے بڑے اور بزرگ مرد و خواتین ہمسایوں کے آشنا چہروں کو دیکھتے ہوئے ،ان کے ساتھ بے لوث خلوص و محبت سے ہاتھ ملاتے یا بات کرتے ہوئے آپ کیسا محسوس کرتے ہیں۔

دیپک بُدکی: بہت اچھا لگتا ہے کہ بچپن دوبارہ لوٹ آیا ہے۔تمام بھولی بسری یادیں

پردۂ سیمیں پر رقص کرنے لگتی ہیں ۔ ایک ایک بات یاد آجاتی ہے ۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں سب لوگ اپنے ہی لوگ نظر آتے ہیں جیسے ایک ہی کنبے کے افراد ہوں ۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنے اور اور دکھ درد بانٹنے والے اور اس جیسی ہی دوسری تمام تر اخلاقی خوبیوں سے متوصف جو خوبیاں کشمیریوں کے خمیر میں رچی بسی ہوئی ہیں ۔ اجنبی جگہ پر یہ سب کہاں .....!! اس سب کے لیے وہاں آنکھیں ترستی ہیں ۔ سب لوگ اپنے اپنے دائروں میں سمٹ کر رہ گئے ہیں، ابریشم کے کیڑوں کی طرح کویے یا پھر موتی کی طرح سیپ کے خول میں قید ہو چکے ہیں ۔ غالباً یہ بھی اس مشینی دور کی خاصیتیں ہے جو پہلے یورپ میں نازل ہو گئیں اور اب ایشیائی ممالک بھی ان کے گھیرے میں آچکے ہیں ۔

رشید راہگیر لداخی: بُد کی صاحب، علامتی افسانوں کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں ۔

دیپک بُد کی: علامتی کہانیاں نور شاہ نے بھی لکھیں، اور دیپک بُد کی نے بھی ۔ لیکن یہ وہ علامتی کہانیاں نہیں ہیں جو ایک سیدھے سادے اردو افسانے کے قاری کو الجھا دیتی ہیں ۔ میں اس علامت نگاری کا قائل ہوں جو افسانے کے حسن کو دوبالا کر دے مگر اسے لایعنیت کی طرف نہ لے جائے ۔

شیخ بشیر احمد: کشمیری زبان آپ کی مادری زبان ہے، آپ سائنس کے طالب علم رہ چکے ہیں اور اردو زبان، جس میں آپ نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، آپ نے بعد میں پڑھی اور سیکھی ہے ۔ کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنی مادری زبان میں ہی سوچتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

دیپک بُد کی: میں بڑی معذرت کے ساتھ کہتا ہوں کہ حالانکہ کشمیری زبان واقعی میری مادری زبان ہے اور یہ زبان بہت ہی اچھی اور میٹھی زبان ہے، لیکن میں نے اپنے خیالات کے لیے اردو ہی کا انتخاب کیا ہے گو کہ انگریزی، جو میرا ذریعۂ تعلیم رہا ہے، میں بھی کچھ لکھا ہے ۔ میں ان لوگوں میں شامل نہیں ہوں جو کشمیری زبان لکھنے اور پڑھنے سے معذور ہیں گو کہ اس کا رسم الخط فارسی

یا اردو جیسا ہی ہے، مگر میں اس زبان کے لٹریچر کی جانب راغب نہ ہوسکا اور اس میں مہارت حاصل نہ کرسکا۔

وجیہہ احمد اندرابی: کشمیر سے باہر رہ کر آپ کس طرح کشمیر سے جڑے رہتے ہیں؟ یہاں کے حالات و واقعات کے ساتھ یا پھر دیگر ادبی و ثقافتی کارروائیوں (activities) کے ساتھ، خاص طور پر اپنے احباب کے ساتھ۔

دیپک بُدکی: انٹرنیٹ نے دنیا کے ایک کونے کو دنیا کے دوسرے کونے سے جوڑ رکھا ہے۔ دنیا میں رونما ہونے والے ہر چھوٹے بڑے واقعے کی تفصیل انجام پذیر ہوتے ہی انٹرنیٹ پر خبر یا ویڈیو کی صورت میں آجاتی ہے۔ عزیز و اقارب سے رابطہ بھی موبائیل وغیرہ کی وجہ سے آسان ہوگیا ہے۔ اس لیے دوری کا احساس نہیں ہوتا اور ہر معاملے پر نظر رہتی ہے۔ اتنا ہی نہیں، دوستوں کی تازہ تخلیقات بھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن جو بات اور جو لطف ملنے ملانے، روبرو بیٹھنے اور ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹنے میں ہے، اسے رفتہ رفتہ ہم مکمل طور پر محروم ہونے لگے ہیں۔ اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔

اشرف آثاری: بُدکی صاحب، کشمیری پنڈت گھرانوں میں جو مخصوص قسم کی تہذیبی، تمدنی، وراثتی اور ثقافتی قدریں تھیں، کچھ مخصوص قسم کے رسومات، رہن سہن کے طور طریق اور روایات وغیرہ تھیں، کشمیر سے باہر رہنے والے پنڈت آج بھی ان کی پاسداری کر رہے ہیں یا نہیں؟ دوسرا یہ کہ نئی جنریشن کشمیری زبان، مخصوص قسم کے لباس، عادات واطوار وغیرہ سے کس حد تک قریب ہیں؟

دیپک بُدکی: جو بزرگ لوگ یہاں رہ چکے ہیں، زندگی کا اہم حصہ یہاں گزار چکے ہیں، وہ اپنے ماضی کو نہیں بھولے ہیں نہ اپنی مادری زبان کو۔ شاید بھلا بھی نہیں سکتے! البتہ جن بچوں کی پیدائش کشمیر سے باہر ہوئی ہے، وہ وہاں کے مقامی رنگ میں رنگ چکے ہیں۔ کشمیر ان کے لیے خواب بنا ہوا ہے۔

اشرف آثاری: غازی آباد میں، جہاں آپ ریٹائرمنٹ کے بعد کئی برسوں سے مقیم ہیں، میرے استاد محترم عشرت کرتپوری مرحوم بھٹہ ابو خان محلے میں رہتے تھے، میرا وہاں آنا جانا لگا رہتا تھا، اچھی خاصی ادبی فضا تھی، وہاں کئی لوگ رہا کرتے تھے۔ عشرت کرتپوری، ادیب لکھنوی، ماسٹر علی محمد، ڈاکٹر ریاض غازی آبادی، ذکی طارق، جمیل ہاپوڑی، سرور حسین خاں سرور، جمال ہاشمی، شمس غازی آبادی، حکیم شباب وغیرہ۔ چودھری سینما کے مالک نے ایک ہال ادبی نشستوں کے لیے مخصوص رکھا تھا، خود بھی بہت اچھے ادب نواز تھے۔ استاذی عشرت کرتپوری کے دولت کدہ پر اکثر ادبی مجلسیں جما کرتی تھیں۔ پاس پڑوس سے بھی لوگ آتے جاتے تھے۔ دہلی سے نصرت گوالیاری، سکندرآباد سے ڈاکٹر فطرت انصاری اور میرٹھ سے اصغر جڑوروی وغیرہ شریک ہوجاتے تھے۔ عشرت کرتپوری کے انتقال کے بعد کچھ پتہ نہیں آج وہاں کا کیا حال ہے؟

دیپک بُدکی: اس ضمن میں مجھے خاص علمیت نہیں البتہ ذکی طارق صاحب کے ساتھ میرے اچھے تعلقات ہیں۔ وہ میرے پاس آتے رہتے ہیں اور ادبی موضوعات پر ان کے ساتھ بات چیت ہوتی رہتی ہے۔

نورشاہ: آج آپ ہمارے مہمان ہوئے۔ کل آپ ریڈیو کشمیر کے ایک خاص پروگرام کے لیے مہمان تھے اور پھر کل آپ رائٹرس گلڈ میں مدعو ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے یہاں کے ادبی حلقوں میں جو پذیرائی آپ کی ہورہی ہے آپ اسے مطمئن ہیں۔

دیپک بُدکی: پوری طرح سے مطمئن ہوں۔ جموں سے لے کر کشمیر تک دوست احباب نے میری خوب پذیرائی کی، میں آپ سب کا شکرگزار ہوں۔ سب جانکار لوگ ملنے کے لیے آرہے ہیں اور اپنے خلوص سے بھی نوازرہے ہیں۔

وجیہہ احمد اندرابی: یہاں کی اردو صحافت اور اردو اخبارات کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا۔

دیپک بُدکی: اردو اخبارات کی ابتدا ہی سے یہاں بہتات رہی ہے۔ کچھ اچھے اچھے

اخبارات یہاں سے شائع ہوتے رہے ہیں اور آج بھی شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن بھی چھپتے رہے ہیں۔ یہاں کے اکثر ادیب و شاعر انھیں سے ادبی دنیا میں متعارف ہوئے ہیں اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جا رہی ہے۔ یہ اردو زبان و ادب کے لیے فالِ نیک بھی ہے اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے خوشگوار قدم بھی۔

ڈاکٹر اشرف آثاری: دیپک بُدکی صاحب، میں نگینہ انٹرنیشنل کی طرف سے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی تشریف آوری سے نوازا اور ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ کشمیر کے دورے پر تشریف لانے والے ہر ملکی اور غیر ملکی اردو قلم کار کا استقبال کرنے کے لیے ہم ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اس کارِ خیر میں نگینہ کے چیف ایڈیٹر وحشی سعید صاحب اور مینجنگ ایڈیٹر جناب ظہور ترنبو صاحب ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ نگینہ کے سینئر اراکین مجلس مشاورت جناب نور شاہ، جناب مظفر ایرج اور اپنی طرف سے بھی آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کے ساتھ ہمکلام ہونے والے سینئر صحافی محترم وجیہ احمد اندرابی، جناب مشتاق کینی، جناب شیخ بشیر احمد، اور جناب رشید راگیر لداخی کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ یہاں تشریف آور ہو گئے۔

دیپک بُدکی: آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے خلوص اور محبت سے نوازا۔

؎ یار زندہ صحبت باقی ....والسلام۔

☆☆☆

﴾ مکالمہ بعنوان 'دیپک بُدکی کا دورۂ کشمیر'، مکالمے میں ڈاکٹر اشرف آثاری، نور شاہ، وجیہ احمد اندرابی، رشید راہ گیر لداخی، شیخ بشیر احمد اور مشتاق کینی نے شرکت کی؛ مطبوعہ نگینہ انٹرنیشنل، جلد ۴۹، شمارہ ۱، جنوری تا جون ۲۰۱۷، ص ۸۹-۸۲۔

ایک کشمیری ہندو کی کتھا کہانی

-زاہدہ حنا (کراچی، پاکستان)

ایک ایسے زمانے میں جب صبح وشام کشمیر کا نام ٹیلی ویژن، ریڈیو اور بیانات میں سنائی دیتا ہے کسی کشمیری ہندو کی خود نوشت ہاتھ آجائے تو جی چاہتا ہے کہ اسے فوراً پڑھ لیا جائے۔ یہ عاطف حیات تھے جو میرے لیے انڈین پوسٹل سروس کے ریٹائرڈ افسر جناب دیپک بُدکی کی خود نوشت 'لوحِ حیات' لے کر آئے۔ یہ کتاب بُدکی صاحب نے انھیں غازی آباد سے بھیجی تھی۔ وہ عاطف سے مل چکے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان کی کتاب عاطف کے ذریعے مجھ تک پہنچ سکتی ہے۔ اسی لیے انھوں نے اس کی ایک جلد مجھے بھجوائی۔ ایک دلچسپ اور کھری کھری باتیں کرتی ہوئی کتاب۔

میں نے اس سے پہلے کسی بھی ہندو کا شجرہ نسب نہیں دیکھا تھا لیکن 'لوحِ حیات' میں دیپک جی کئی پشتوں کا احوال لکھتے نظر آتے ہیں۔ وہ کشمیری پنڈتوں کے ایک غریب متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس جنت بے نظیر میں جنم لینا ان کے لیے فخر کی بات تھی۔ البتہ جنم ایسے موسم میں ہوا جب یہ وادی اپنے اوپر دوزخ کی سفید ردا اوڑھے رہتی ہے۔ برف گھٹنوں تک زمین کو ڈھک لیتی ہے، فریادیوں کی مانند قطار در قطار کھڑے، سرد آہیں بھرتے ہوئے بے برگ سفیدے کے پیڑ آسمان کو تکتے رہتے ہیں، چار سو فضا میں تند و تیز ہوائیں خوف و ہراس پھیلاتی ہیں اور غریب کشمیری اپنے گھروں کے اندر لاحول پڑھتے ہیں۔

متوسط طبقے کے پنڈت گھرانے میں پیدا ہونے والے دیپک نے زندگی کے بہت سے نشیب وفراز دیکھے۔ اردو اتنی عمدہ سیکھی کہ اردو کے مستند ادیب ہو گئے۔ کشمیر کی کچھ کھٹی میٹھی یادیں

لکھتے ہوئے فارسی کا ایک شعر یاد کرتے ہیں:

اگر فردوس بر روئے زمیں است

ہمیں است وہمیں است وہمیں است

یہ شعر شالیمار باغ کی بالائی مہتابی پر کنندہ ہے اور اس کے بارے میں عام خیال ہے کہ اسے امیر خسرو نے کہا ہے۔ انھوں نے یہ شعر اس کشمیر کے بارے میں کہا ہے جہاں دیپک نے جنم لیا۔ البتہ کچھ لوگ اسے شہنشاہ جہانگیر سے منسوب کرتے ہیں۔ افسوس کہ جغرافیائی لحاظ سے کلیدی مقام ہونے کے سبب یہ ریاست ہمیشہ ہی بنائے فساد رہی ہے۔ چنانچہ ریاست جموں و کشمیر کثیر النسل، کثیر التہذیب، کثیر المذہب اور کثیر الزبان ہے۔

کشمیر کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں یہاں ہندو، بدھ، مسلم، سکھ، اور ڈوگرہ حکمرانوں نے حکومت کی جن میں کچھ ایسے بھی تھے جن کی عظمتوں کو آج تک یاد کیا جاتا ہے مثلاً اشوکا، للتادتیہ، اونتی ورمن، زین العابدین، اکبر وغیرہ۔ اس کے برعکس کچھ ایسے بھی ہیں جن کی حرص و ہوس اور مذہبی جنونیت کی کہانیاں سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں مثلاً مہر کولا، سکندر بُت شکن، جبار خان۔ بدقسمتی سے فطرت اور حکمران دونوں کشمیری رعایا کے لیے ایذا رساں اور جفا کرنے والے رہے ہیں۔ ماضی میں عقوبت، بھاری ٹیکس، کم مزدوری اور گلگت و بونجی جیسے علاقوں میں بے گار کرنا کشمیریوں کا نصیب بن چکا تھا۔

کشمیر میں اسلام تیغ و تلوار کے ساتھ ساتھ تبلیغ و ترغیب سے پھیل گیا۔ جس کے باعث مخلوط اور گنگا جمنی تہذیب نے نمو پائی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے 'ریش وار' (ریشیوں اور صوفیوں کی آماجگاہ) کہا جاتا ہے۔ یہاں صدہا سال سے مختلف مذہبوں کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں حالانکہ کئی حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کے لیے اس مخلوط کلچر کو شمشیر و سناں کے ذریعے تہس نہس کرنے کی کوشش کی۔ بہرحال تقسیم ہند نے اس ریاست کی تقدیر میں ایسے کانٹے بوئے جو اس کے وجود کو تب سے خوں چکاں کر رہے ہیں۔ بقول رزمی مظفر نگری:

؎ یہ وقت بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

بیسویں صدی کی شروعات ہی سے ساری دنیا میں قومی جذبے نے سر اٹھالیا۔ اس لیے ہر حساس قوم آزادی کے لیے کوشاں رہی۔ جموں و کشمیر کے عوام بھی اسی جذبے کے تحت ڈوگرہ حکومت کے خلاف کمربستہ ہوگئے اور 1931 میں اس کی سمت کا تعین باضابطہ طور پر شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے کیا۔ بدقسمتی سے تقسیم ہند کے وقت جموں و کشمیر کے مہاراجہ نے مصلحتاً فیصلہ کرنے میں تاخیر کی اور بعد میں جب فیصلہ کیا اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔

پاکستانی قبائل 22 اکتوبر 1947 کو کشمیر کی وادی میں گھس کر بارہ مولہ پر قابض ہو گئے اور پھر سری نگر کی جانب پیش قدمی کرنے لگے۔ ایسی حالت میں مہاراجہ ہری سنگھ کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ فوراً الحاق کرے اور ہندوستانی فوج سے مدد مانگے۔ نتیجتاً 26 اکتوبر 1947 کو دستاویز الحاق پر دستخط ہوئے۔ دوسرے ہی روز ہندوستان کی فوج نے دنیا کی سب سے تیز لام بندی کا مظاہرہ کر کے اپنی فوجیں بذریعہ طیارہ سرینگر بھیج دیں اور برق رفتاری سے حالات پر قابو پالیا۔

پاکستانی فوج کو دھکیل تو دیا گیا لیکن ابھی بھی کشمیر کا ایک بہت بڑا حصہ (پاکستانی کشمیر اور گلگت و بلتستان) ان کے پاس ہی تھا کہ یکم جنوری 1949ء کو جنگ بندی کا اعلان ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو چونکہ امن پسند رہنما تھے، اقوام متحدہ میں گوہار لگانے چلے گئے۔ وہاں پر پاکستان نے الحاق اور لشکر کشی پر سوال اٹھائے اور ان کی پشت پناہی مغربی ممالک نے کی کیونکہ بطور حکمت عملی انھیں جموں و کشمیر میں خاصی دلچسپی تھی تاکہ وہ کمیونسٹ بلاک کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو روک سکیں۔

سرد جنگ کا زمانہ تھا اس لیے سرمایہ دار بلاک کا مدعا یہ تھا کہ وہ اس علاقے سے سوویت یونین اور چین کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھ سکیں۔ اِدھر پاکستان امریکی بلاک کا رکن بن گیا اور اُدھر

ہندوستان سوویت روس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ جواہر لال نہرو نے مہاراجہ ہری سنگھ کو نظر انداز کر کے شیخ محمد عبداللہ کو جموں وکشمیر کا سربراہ تسلیم کرلیا۔ دونوں کے بیچ کچھ غیر رسمی وعدے ہوئے اور بعد میں شیخ عبداللہ کی سربراہی میں عوامی حکومت برسر اقتدار آئی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان کھٹاس پیدا ہوئی اور آپسی رشتے بگڑ گئے۔ 1953 میں سیاست نے ایسی کروٹ لی کہ کشمیر کا مسئلہ ایک ناسور بن گیا۔ شیخ محمد عبداللہ نے جواہر لال نہرو کو اپنا وعدہ یاد دلایا اور جموں وکشمیر میں رائے شماری کرانے کا مطالبہ کیا۔ حالانکہ وہ اس بات کو جانتا تھا کہ ریاست کا ایک بہت بڑا حصہ پاکستان کے قبضے میں ہے اور اس کے بغیر یہ کارروائی ناممکن ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کو قید کیا گیا اور عنان حکومت بخشی غلام محمد کو سونپ دی گئی۔ گذشتہ 71 برس سے اقوام متحدہ نے اس مسئلے کو حل کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا، یہ معاملہ تب سے یوں ہی سلگ رہا ہے۔

دیپک مختلف مسلمان سیاست دانوں کے بارے میں لکھتے ہیں اور یہ کہنے سے نہیں چوکتے کہ اگر تمام کشمیری سیاست دان ریاست کے حقوق سے مخلص ہوں تو بات وہاں تک نہیں پہنچ سکتی جہاں آج پہنچ چکی ہے۔

وہ اپنی ابتدائی ملازمت کے بارے میں بتاتے ہیں جب وہ 22 برس کی عمر میں دلی کے مشہور اشوکا ہوٹل کے ایمپوریم میں کام کر رہے تھے۔ ایک روز سونیا گاندھی شوروم میں آئیں۔ میں انھیں جانتا نہیں تھا، غیر ملکی عورت لگ رہی تھیں۔ اس وقت میں شوروم میں اکیلا ہی تھا۔ میں نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ کچھ ہی دیر میں اندرا گاندھی کی خادمہ جس کو میں پہچانتا تھا، دوڑتی ہوئی چلی آئی اور مجھے باہر بلا کر کہنے لگی۔ یہ بہو جی ہیں، جو بھی سامان خریدیں گی اس کے پیسے نہیں مانگنا۔ سامان اور بل گھر بھجوا دینا۔ میرا سر چکرا گیا۔ سوچنے لگا کہیں کوئی نازیبا حرکت تو سرزد نہیں ہوئی۔ جلدی سے چہرے کو سنجیدہ بنالیا۔ اتنی دیر میں سونیا جی نے گلاسوں کے اوپر رکھنے والے پیپر ماشی کے دس ڈھکن (Coasters) چن کر میری میز پر رکھ دیے اور یہ کہہ کر

چلی گئیں کہ انھیں گھر بھجوادیں۔ان کا رویہ اور بات کرنے کا ڈھنگ دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ بہت ہی متین اور بردبار عورت نظر آتی تھیں۔ میں جب بھی ان کے بارے میں بات کرتا ہوں تو میرے منہ سے تعریفی کلمات ہی نکلتے ہیں۔

دیپک جی نے فوج میں ملازمت کی، پوسٹل سروسز بورڈ کے ممبر بنے۔افسانے لکھے، تنقیدی مضامین تحریر کیے۔زندگی کے پیچ وخم سے گزرے۔ایک نیک نہاد، غیر متعصب اور دل دار انسان، آخری دنوں میں انھوں نے وہی کام کیا جو ادب کا چسکا رکھنے والے بیشتر لوگ کرتے ہیں۔ یعنی خودنوشت لکھی۔316 صفحوں کی کتاب کے آخری صفحے پر لکھتے ہیں:

> ''میرا ماننا ہے کہ وہ کشمیر جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا واپس ملنا مشکل ہے۔اب تو وہاں کی زمین میں بارودی سرنگوں کی کاشت ہوتی ہے۔فضا میں بارود کی بدبو سرایت کرچکی ہے اور پانی میں تیزاب گھل گیا ہے۔ریش واری کی شاعری میں اب وہ روحانیت نہیں ہے جو انسان کو اپنے وجود سے ہمکلام ہونے پر مجبور کرتی تھی۔''

بقول عمیق حنفی:

میں ہوا ہوں، کہاں وطن میرا
دشت میرا نہ یہ چمن میرا

☆☆☆

٭مضمون 'ایک کشمیری ہندو کی کتھا کہانی'، دیپک بُدکی کی سوانح عمری 'لوحِ حیات' پر زاہدہ حنا کے تاثرات۔مطبوعہ روزنامہ ایکسپریس، پاکستان Daily Express[Urdu Newspaper] Pakistan) مورخہ 15 ستمبر 2019

دیپک بُدکی کی فنّی جہات

-ڈاکٹر شمع افروز زیدی

''دنیا کی بھیڑ میں اپنی شناخت قائم کرنا بہت مشکل کام ہے اس لیے ہر وہ شخص جو
اپنی پہچان بنانا چاہتا ہے، کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہوتا ہے کوئی بھی کام، چاہے وہ بُرا
ہو یا بھلا، مگر دوسروں سے ہٹ کر۔ شناخت بنانے میں عمریں گزر جاتی ہیں۔''

مندرجہ بالا سطور دیپک بُدکی کے افسانے ''ٹک شاپ'' کی ہیں جو ان کے افسانوی مجموعے ''چنار کے پنجے'' صفحہ ۲۴ سے اخذ کی گئی ہیں۔ اس میں ذرا سی ترمیم کرتے ہوئے میں کہوں گی کہ افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں شناخت قائم کرنا واقعی آسان نہیں لیکن ۸۰ کی دہائی کے بعد اردو کے افسانوی افق پر ابھرنے والے کہانی کار دیپک بُدکی نے شہرت کا سفر اپنے فن کی توانائی کے بل بوتے پر طے کیا ہے۔ ان کے بطون میں جستجو، تلاش اور عام ڈگر سے ہٹ کر کچھ کرنے کا حوصلہ تھا تب ہی کہانیوں کے متنوع موضوعات کے سبب ان کی کہانیاں قارئین کے بڑے حلقے میں مقبول ہوئیں۔ ان کے فن کو سراہا گیا کیونکہ وہ اپنی کہانیوں میں کچھ نہ کچھ نیا پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے کارناموں کی طویل فہرست میں ''ادھورے چہرے''، ''چنار کے پنجے''، ''زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی''، ''ریزہ ریزہ حیات''، ''روح کا کرب''، ''مٹھی بھر ریت'' اور ''اب میں وہاں نہیں رہتا'' (افسانوی مجموعے) شامل ہیں۔ سات افسانوی مجموعوں کے خالق کشمیری پنڈت گھرانے کے اس سپوت نے تنقید وتبصروں کے تعلق سے ''عصری تحریریں''، ''عصری شعور''، ''عصری تقاضے''، ''عصری نقوش''، ''عصری زاویے''، جموں وکشمیر کا عصری ادب'' اور ''ادبی مباحث'' جیسی اہم کتابیں اردو ادب کو دے کر قارئین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد واقعتاً ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا معترف ہونا پڑتا ہے۔ لکھنے پڑھنے میں انھوں نے ایک عمر گزار دی، بے پناہ ریاضت کے بعد جب تجربوں کی بھٹی

سے کندن بن کر نکلے تو تحقیق کے میدان میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ ''اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار'' ان کی صلاحیتوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ یہ ان کی ایسی ثمر یاب تصنیف ہے جو برسوں کی محنت کے بعد منصہ ٔشہور پر آئی جس سے اردو ادب کے قاری کو یقیناً فیض حاصل ہوگا اور طلباء کے لیے تو یہ کتاب کسی تحفے سے کم نہیں۔

ادب کے حوالے سے اس بات کا ذکر ضروری سمجھتی ہوں کہ تنقید لکھنا بجائے خود ایک تخلیقی عمل سے کم نہیں۔ تنقید ادب کو سمجھنے میں آکسیجن کا درجہ رکھتی ہے لیکن دورِ حاضر کی تنقید تیرے میرے، ہمارے آپ کے درمیان ہونے لگی ہے یوں صحت مند تنقید کا قحط الرجال محسوس ہوتا ہے۔ دیپک بُدکی نے مذکورہ کتب میں نہ صرف تنقیدی بصیرت سے کام لیا ہے بلکہ مشمولات پڑھ کر ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شرط ہے ان کی تحریروں کو سنجیدگی سے پڑھنے کی۔ بُدکی کا ایک اور اہم کارنامہ ۳۲۴ صفحات پر مشتمل ''لوحِ حیات'' ہے اس میں انھوں نے اپنی پیدائش سے لے کر ریٹائر منٹ تک رونما ہونے والے تلخ و شیریں تجربات و واقعات سمونے کے علاوہ اس دور کی سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی جھلکیاں، حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے اس عہد کی تاریخ بھی رقم کر دی ہے۔ مثلاً ۱۹۶۲ء میں ہند چین کی جنگ، ۵/اگست ۱۹۶۰ء میں ایوب خان اور لال بہادر شاستری کے درمیان تاشقند سمجھوتہ، ۳/دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۱۶/دسمبر ۱۹۷۱ء تک جنگ کے نتیجے میں مغربی پاکستان سے بنگلہ دیش کا سقوط اور اس کے علاوہ ایسے کتنے ہی واقعات جو اُن کی یادوں کے دریچوں میں محفوظ تھے سب کے سب ''لوحِ حیات'' میں اس طرح بیان کیے ہیں کہ قاری بھی ساتھ ساتھ چلتا ہوا ان کے بے تکلف اور بے ساختہ انداز بیان کا معترف ہو جاتا ہے۔ اس میں آنسو بھی ہیں اور قہقہے بھی، سرخوشی بھی اور سوگواری بھی، حسن و عشق کے قصے بھی ہیں اور موسموں کی دلکشی و دلفریبی بھی۔ اس میں ممی کی سخت مزاجی اور پاپا کی نرم روی کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ بُدکی نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ممی اور پاپا کے مزاجوں کی عکاسی بہت خوبی سے کی ہے۔ والد کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''پتا جی کی تعریف کرتے وقت لغت میں درج الفاظ کم پڑتے ہیں۔ نیک، حلیم، شریف، خوش گفتار اور بچوں پر اپنی جان چھڑکنے والے۔ ایسے پتا جی خوش نصیبوں کو

ہی ملتے ہیں۔ساری عمر انھیں کبھی غصہ ہوتے نہیں دیکھا۔ یہ ان کا ہی کلیجہ تھا کہ ماں
کا سارا غصہ پی جاتے تھے...... یہی رویہ انھوں نے اپنے بچوں کے ساتھ بھی روا
رکھا۔ منہ سے فرمائش نکلی نہیں کہ چیز حاضر ہو جاتی تھی۔''

(لوحِ حیات: صفحہ ۶۴۔۶۵)

ماں کا ذکر بھی بڑی محبت سے کرتے ہیں کہ ماں سے بچوں کی قربت قدرتی امر ہے لیکن ماں
کا ذکر کرتے ہوئے سچائی کا دامن نہیں چھوڑتے ملاحظہ کیجیے:

''میری ماں بہت ہی خوبصورت تھیں، قد آور، بھورے بال، دمکتا چہرہ اور نسوانیت
کا پیکر۔ افسوس کہ حسنِ بے نظیر کو ان کی بد مزاجی نے درہم برہم کر دیا تھا۔ عجیب سی
شخصیت تھی ان کی۔ تضاد کا مرکب، صاف ستھری، شفاف، نڈر اور بے باک، جو
من میں آتا تھا کہہ دیتیں خواہ اس سے کسی کا دل آزردہ ہی کیوں نہ ہو جاتا۔ بات
بات پر غصہ کرتیں، غصّے میں چلاّتیں اور جلی کٹی سناتیں۔ پل میں وہ کسی کو بھی اپنی
محبتوں سے سرشار کرتیں۔ پھر کچھ ان بن ہو جاتی تو دوسرے ہی پل اس کی تکا بوٹی
کر لیتیں۔ (لوح حیات: صفحہ ۵۶)

بچپن کی شرارتوں، بہنوں سے الفت، محبت اور یگانگت کے ساتھ ہی دیپک بدکی اپنی پھوپی
کی محبتوں میں بھی شرابور ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

''میری بدنصیبی تھی کہ ماں کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا مگر اس کمی کو پورا
کرنے کے لیے کچھ عرصہ بعد نیک سیرت، کم گو، ایثار کن اور خلیق پھوپی نے جو
بچپن ہی میں بیوگی سے دو چار ہو گئی تھیں ہمارے گھر کی کمان سنبھال لی۔ پھوپی کیا
تھیں ممتا کا بے مثال پیکر تھیں۔'' (لوحِ حیات: صفحہ ۷۰)

غرض یہ 'لوحِ حیات' مصنف کی زندگی کا نچوڑ ہے۔ جگہ بہ جگہ میرا کشمیر میرا کشمیر کہنا ان کی
کشمیر سے بے انتہا محبت کی دلیل ہے۔ کشمیر ان کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہا ہے اور کیوں نہ شامل
ہو اپنی مٹی سے کسے پیار نہیں ہوتا۔ اس خودنوشت میں کشمیر سے جدا ہونے کا دکھ بھی ہے اور وہاں
کے مرغزاروں، باغات، چشموں، شالا مار، نشاط باغ، پری محل، گل مرگ، سون مرگ، پہلگام،

چار چنار اور کشمیر کے چپے چپے سے جڑی یادیں ہی مصنف کا اثاثہ ہیں جس سے دامن چھڑانا آسان نہیں۔ انھوں نے ''لوحِ حیات'' میں کشمیر کے رہن سہن، رسم و رواج کا بھی ذکر کر کے قارئین کو آگاہی دی ہے۔ دیپک بدکی کے افسانوں کا دائرہ بھی وسیع ہے۔ وہ کہانیوں کے ذریعے انسانی زندگی کے گوناگوں واقعات و حادثات خوبی سے اجاگر کرتے ہوئے قاری کو ذہنی طور پر اس طرح سیر کراتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ قدم قدم چلتا ہے اور یہ ایسی خوبی ہے جو بدکی کے نام کا اعلانیہ بن کر ابھرتی ہے۔

قصے کہانی سے انسان کی دلچسپی اس وقت سے ہے جب وہ دنیا میں وارد ہوا اور ماں کی لوری سے اس کے کان آشنا ہوئے۔ یوں شعوری منزلیں طے کرنے کے ساتھ وہ روزی روٹی کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا، وجود پر تھکن کا غلبہ طاری ہونے کے بعد دل بہلانے اور دن بھر کی تھکن کو تحلیل کرنے کی غرض سے دیگر ہم نفسوں کے درمیان بیٹھ کر کچھ وقت خوش گپیوں میں گزارنا چاہتا، اس طرح اسے کچھ دیر کے لیے دنیاوی کلفتوں سے نجات بھی مل جاتی۔ دراصل ادب زندگی سے عبارت ہے اور زندگی کے مختلف شیڈس ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں سماجی ناانصافی اور نابرابری کے اس بڑے دائرے میں عورت اور مرد دونوں ہی مظلوم ہوتے ہیں (کوئی کم کوئی زیادہ) دیپک بدکی کا خصوصں یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کی نفسیات سچ اور حقیقت کی ترازو میں اس طرح تولتے ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ افسانہ لکھنا بدکی کے لیے سانس کی آمد و رفت کا نام ہے۔ وہ اپنے ہر افسانے میں کسی نہ کسی نوعیت کا تجربہ سمو دیتے ہیں۔ ان کی اصل خوبی کہانی پن، کردار نگاری، تاثر نگاری اور ماحولیاتی سحر بیانی ہے اسی سبب ان کے افسانے قاری کے ذہن کو برقی جھٹکے کی صورت میں جھنجوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ یوں وہ کہانی کار اور قاری کے درمیان رشتے کو استحکام بخشتے ہوئے پُل کا کام انجام دیتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری عہدوں پر فائز رہ کر فرائضِ منصبی بخوبی نبھاتے ہوئے ادب کو اتنا وقت کیسے دے سکے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان کے وجود میں ضرور کسی ''جن'' کا بسیرا ہے یا پھر انھوں نے کسی مؤکل کو قبضے میں کر رکھا ہے کہ مؤکل کا کام ہی انسان کو ہر دم بے چین رکھنا ہے چنانچہ دیپک بدکی مؤکل سے فرار حاصل کرنے کے لیے خود کو کاغذ قلم کی پناہ میں محصور کر لیتے ہیں۔ پھر ان کے قلم سے کتنی ہی زندہ کہانیاں نکل کر اردو کے

افسانوی ادب کا حصہ بن جاتی ہیں۔

''ادھوری کہانی'' میں دیپک بدکی قدیم وجدید کا فرق ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''زمانہ کتنا بدل گیا... میرا بیٹا اپنی ماں سے دو ہزار روپے مانگ رہا تھا... دو ہزار اتنی بڑی رقم میں نے پہلی بار تب دیکھی تھی جب میں انڈین بنک میں کیشیئر لگ چکا تھا۔

''تمھیں اتنی ساری رقم کس لیے چاہیے؟'' اس کی ماں نے استفسار کیا۔

''سونو کا برتھ ڈے ہے۔ گفٹ دینا ہے۔''

''یہ سونو کون ہے؟''

''ممی، تم بھی اب بہت سارے سوال کرنے لگی ہو۔ سونو از مائی فرینڈ۔''

''پچھلے اسٹیشن پر شفالی تھی، اس سے پچھلے...... پریتی اور اب یہ سونو کہاں سے آ گئی؟''

''اوہ ممی شی از مائی اونلی لو۔'' (زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی صفحہ ۲۱)

ماں بیٹے کے ڈائیلاگ سن کر مصنف کو بچپن میں دی ہوئی دادا جی کی اٹھنّی یاد آ جاتی ہے جو دادا جی نے اچھا رزلٹ لانے کے صلے میں دی تھی اور وہ اٹھنّی پا کر اتنا خوش ہوا تھا جیسے دادا جی نے اٹھنّی نہیں اشرفی دی ہو۔

دیپک بدکی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ خود افسانے میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتے ہیں اور ان کی موجودگی افسانے کی کامیابی کی ضامن بن جاتی ہے۔ وہ صرف افسانہ نہیں لکھتے بلکہ اس کی سمت ورفتار پر بھی گہری نظر رکھتے ہوئے واقعات کو اندرون میں جذب کر کے کہانی کو کاغذ پر یوں اتارتے ہیں کہ اس میں سماجی شعور حقیقت کا رنگ لے کر پوری قوت کے ساتھ آشکار ہو جاتا ہے۔ ''اب میں وہاں نہیں رہتا'' میں مصنف قاری کو یادوں کے ایسے جزیروں میں لے جاتا ہے جو فی زمانہ ناپید ہو گئے ہیں اس میں بدکی نے قدیم دور کی ترجمانی فنکارانہ ڈھنگ سے کی ہے۔ ابتدا سے ہی قاری کو ذہنی طور پر ساتھ لے کر چلتے ہیں مثلاً ایک زمانہ تھا ڈاکیہ کی آواز پر اہلِ خانہ کے کان لگے رہتے تھے پھر سب لوگ باری باری خوشی کی کیفیت سے سرشار ذوق وشوق سے خط پڑھتے تھے لیکن! اس بڑی سی 'لیکن' کے بعد مصنف کہتا ہے دورِ جدید کی ایجادات نے قاری سے

یہ خوشی بھی چھین لی ہے اور قاری مصنف کے اس خیال کی تائید کرتا ہے واقعی واٹس اپ، میسنجر، فیس بک اور موبائل کی مصروفیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ گھر بیٹھے ہی تمام کام آناً فاناً انجام پا جاتے ہیں۔ افسانے کی سطر سطر قاری کے ذہن میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی اسے خوش بھی کرتی ہے اور آزردہ بھی، لکھوری اینٹوں سے بنے چار منزلہ مکان کے ذکر نے قاری ہونے کے ناطے مجھے بھی اداس کر دیا اور میں ماضی میں پہنچ کر مائکے کے خوبصورت کشادہ گھر آنگن، اونچی محرابوں اور صدر دروازے کی بلندی کے تصور میں ایسا کھوئی کہ خود بخود آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ یہ کہانی پچاس سال سے اوپر کی عمر والے ہر قاری کی واردات ہے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ کہانی زندگی کے وسیع کینوس کا احاطہ کرتی ہے۔ لگتا ہے مصنف نے اس سانحے کو جھیلا ہے اور یہ جھیلنا اس کی موجودگی کی علامت ہے جو افسانے کو نہ صرف پُر اثر بلکہ زندہ بنا دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''کیسے بتاؤں کہ میں کہاں رہتا ہوں؟ مجھے میرے بال بچوں نے بانٹ لیا ہے کبھی بڑے بیٹے کے پاس تین چار مہینے گزار لیتا ہوں کبھی منجھلے بیٹے کے پاس اور کبھی چھوٹے کے پاس ایک عجیب سا اَن کہا سمجھوتا ہو گیا ہے ان کے درمیان۔ یہی تین چار مہینے کا!۔'' (اب میں وہاں نہیں رہتا: صفحہ ۵۵)

دیپک بدکی کے افسانوں میں زیست سانس لیتی، چلتی پھرتی محسوس ہوتی ہے۔ اس نے اپنے دور میں تبدیل اور منہدم ہوتی قدروں کو دیکھا محسوس کیا پھر افسانوں کے قالب میں ڈھال دیا۔ محکمہ ڈاک سے وابستہ پوسٹ ماسٹر جنرل جیسے اعلیٰ منصب پر فائز دیپک بدکی نے بے شمار تجربے کیے جہاں جہاں پوسٹنگ ہوئی وہاں وہاں سے کہانی اٹھانا نہ بھولے۔ ہرکارہ، آگ کا دریا، ڈاک بابو اور فرض شناس کہانیاں انڈین پوسٹل سروسز کے مختلف زاویوں کو پیش کرتی ہوئی حقیقت سے روشناس بھی کراتی ہیں۔

یوں لگتا ہے دیپک بدکی کے افسانوں کے کردار ان کی حقیقی زندگی سے وابستہ ہیں اور یہ وابستگی کہانی کو ابدیت عطا کرتی ہے۔ بدکی نے کہانیوں میں زندگی کے تجربے اتنی کامیابی سے سموئے ہیں جو ہر قاری کو اپنے تجربے لگتے ہیں۔ ''ایک نہتے مکان کا ریپ''، ''مخبر''، ''چنار کے نیچے'' میں مصنف صرف حادثات و واقعات کا گوشوارہ ہی مرتب نہیں کرتا بلکہ سچے ادیب کی طرح

ان جذبات کو بھی گرفت میں لیتا ہے جس سے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں۔ ان کہانیوں کے پس پردہ کشمیریوں کی دھڑکنیں شامل ہیں، یہ وہ آنسو ہیں جو ہر کشمیری کی آنکھ سے ٹپکے ہیں۔

دراصل کوئی بھی کام ریاضت اور جنون کے بغیر تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ بدکی کی ریاضت، محنت اور جنون نے ان کی کہانیوں کو افراتفری سے بچالیا ہے۔ واقعات بظاہر معمولی نظر آتے ہیں لیکن مصنف کی وسعت نظر کی وجہ سے کہانی کا ہر لفظ قاری کے ذہن میں اتھل پتھل مچا دیتا ہے اور دل ایک بے نام سی کیفیت اور اداسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ بہاؤ کی اس کیفیت نے بدکی کی کئی کہانیوں کو ایسا جاندار بنا دیا ہے کہ قرأت کرتے ہوئے صرف آہٹوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کہانی کیا کہہ رہی ہے۔

دیپک بدکی کے کئی افسانوں کا موضوع جنس ہے۔ قدیم دور میں ہمارے ادیبوں نے فکشن میں جنس کو موضوع بنا کر افسانے لکھے۔ فکشن میں جنس کو موضوع بنانا قابلِ اعتراض اس لیے بھی نہیں کہ یہ زندگی کا اٹوٹ حصہ ہے البتہ اسے پیش کرنے یا برتنے میں رویہ کیسا ہے اس پر غور کرنا ضروری ہے۔ اگر جنس کا بیان تلذذ یا ذہنی تعیش کے لیے کیا جائے تو قابلِ مذمت ہے۔ بدکی کی کہانیوں کے اندرون میں جھانکیں اور سوچیں تو یہ عریانی افسانے کی ایسی ضرورت ہے جس سے غور و فکر کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے ''گونگے سناٹے'' میں ایسے معاشرے اور ایسی برائی کی عکاسی کی ہے جسے جڑ سے اکھاڑنے کی ضرورت ہے۔ دیپک بدکی کی کہانیوں کے کردار افسانے کے تانے بانے میں منسلک ہو کر اس طرح ہمہ گیر، اثر انگیز اور خود کفیل ہو جاتے ہیں جن سے مصنف کی تخلیقیت کی وسعتوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ان کا قلم متحرک اور تازہ ہے۔ یقین ہے وہ مستقبل میں مزید تازہ مضامین اور افسانے اردو ادب کو عطا کریں گے۔

☆☆☆

مضمون دیپک بدکی کی فنی جہات' ڈاکٹر شمع افروز زیدی، 47-I-، رحمانی اسٹریٹ، مرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵: موبائل: 9871612334: مطبوعہ روزنامہ 'قومی تنظیم'، پٹنہ، (زبان و ادب ایڈیشن) ۴/ ستمبر ۲۰۱۹ء

دیپک بُدکی کی خودنوشت

-'لوحِ حیات'-

-ڈاکٹر ذکی طارق

دیپک بُدکی اردو افسانے کا ایک معتبر اور معروف نام ہے۔تنقید اور تحقیق میں بھی موصوف درک رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ افسانے کے سات مجموعوں کے ساتھ ساتھ سات تنقیدی کتابوں،جن کو ہم تاثراتی تنقید کے پیرائے میں رکھ سکتے ہیں، کے علاوہ 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' جیسی اہم تحقیقی تصنیف تخلیق کر اردو ادب کی انسائیکلو پیڈیا میں نام درج کرا کر تازہ تخلیق 'لوحِ حیات' کے ذریعے قاری کے ذہن پر دستک دی ہے۔لوحِ حیات ان کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خودنوشت یا سوانح عمری کیا ہے اور مصنف یا کوئی دوسرا فرد اس کو تحریر کرنے کی زحمت کیوں گوارا کرتا ہے؟ اگر ہم خودنوشت یا سوانح عمری کیا ہے پر غور کریں تو یورپ کے معروف دانشور اور ادیب ڈاکٹر جانسن نے اس کی تعریف ان الفاظ میں پیش کی ہے:

> ''ان کامیابیوں سے نظر بچا کر گزرنا جو انسان کی زندگی کو عظیم ترین بناتی ہیں اور اپنے خیالات کو گھریلو زاروں تک پہنچانا اور روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو سامنے لانا ہی سوانح نگاری کا فن ہے۔''

معروف نقاد اور ادیب پروفیسر وہاج الدین علوی اپنی تصنیف 'اردو خودنوشت -فن و تجزیہ' میں فرماتے ہیں:

> ''سوانح حیات ادب کی وہ صنف ہے جو کسی خاص فرد کی زندگی کا عکس پیدائش سے

موت تک پیش کرتی ہے۔اس کی تمام تر کامیابیوں اور ناکامیوں نیز اس کی زندگی کے اہم واقعات اور نفسیاتی کیفیت کو دلچسپ انداز میں اجاگر کرتی ہے۔"

مندرجہ بالا تعریفوں کی روشنی میں اگر ہم 'لوح حیات' کا مطالعہ کریں تو ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے دانشوران نے اس صنف کو تحریر کرنے کے جو اصول وضع کیے ہیں، 'لوح حیات' ان پر کھری اترتی ہے۔ کیوں کہ دیپک بُدکی نے ایک طرف جہاں اپنی خودنوشت لکھنے کا جواز بتایا ہے وہیں انھوں نے اپنے عہد کی نیرنگیوں، روزگار کے آلام کی ہنگامہ خیزیوں، اپنے اوپر گزری صعوبتوں، پریشانیوں، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ اپنے خاندانی جھگڑوں، والد و والدہ کا مزاجی تضاد، بیوی سے مستقل چپقلش، خواتین کے ساتھ گزارے حسین اور نرگسی لمحات کو بھی مِن وعن پیش کر کے قاری کو بھی اپنا شریک بنا کر یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ نشاط آفرینی کا مطلب ہوس پرستی نہیں ہے۔ اپنی پیدائش کا احوال بیان کرتے ہوئے جس بے باکی اور سچائی کا اظہار انھوں نے کیا ہے وہ شاید ہی کوئی کر پائے۔ دراصل خودنوشت کا بنیادی وصف سچائی اور بے باکی ہی ہے جس کا نمونہ پیش خدمت ہے:

> "میرا جنم ۱۵ر فروری ۱۹۵۰ کو سرینگر کے پائین علاقے وازہ پورہ، کرالہ ٹینگ، مہاراج گنج میں ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں ہوا تھا۔ ولادت گھر ہی میں ہوئی تھی۔" (ص ۱۴)

اپنی خودنوشت تحریر کرنے کا جواز بتاتے ہوئے وہ دنیا میں اپنے وجود کو بھی بڑی سچائی کے ساتھ شاعرانہ اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔

> "میں یہ روداد صرف اپنی دلجوئی اور بسر اوقات کے لیے رقم کر رہا ہوں۔ میں نہ روزنامچہ لکھنے کا عادی ہوں اور نہ ہی سوانح کے لیے نوٹس بناتا ہوں، بس یادداشتوں کے سہارے یہ کام انجام تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں ایک حادثے کی پیداوار ہوں۔ میں اپنے والدین کی ہیجانی شہوت اور لمحاتی مسرت کا نتیجہ ہوں جس میں میری رضامندی کا کوئی دخل نہیں" (ص ۱۶)

خاندانی حسب نسب پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی عرفیت (سرنیم) کا جواز بتایا گیا ہے۔
اس باب میں اپنی والدہ کی موت کی اطلاع کے ساتھ ساتھ پنڈت شام لال صراف، جو کہ دیپک بدکی کے پھوپھا تھے اور جموں وکشمیر کی کابینہ میں وزیر اور بعد میں پارلیمنٹ کے ممبر رہ چکے تھے، ان کی نوازشات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی شخصیت کو ان کا رہین منت ٹھہرانا جہاں دیپک بدکی کی ایماندارانہ سوچ کو ظاہر کرتی ہے وہیں وجود میں آنے کا ذکر ان کی مفکرانہ سوچ کا اظہار یہ ہے۔

دوسرے باب 'کشمیر کچھ کھٹی میٹھی یادیں' میں کشمیر کی مختصر تاریخ رقم کی گئی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم وطن کے بعد سیاسی حالات کا جو جائزہ دیپک بُدکی نے لیا ہے وہ ایک ایسی سچی دستاویز بن گئی ہے جس کا مطالعہ ہمارے سیاسی رہنماؤں اور افسر شاہی کو بھی کرنا چاہیے تا کہ وہ ایمان داری کے ساتھ کشمیری باشندوں کے جذبات سے واقف ہوسکیں اور ماضی میں کی گئی اُن ریشہ دوانیوں کا بھی ان کو علم ہو سکے جو اُس عہد کے سیاسی رہنماؤں اور افسران نے اپنے مفادات کی خاطر عمل میں لائے تھے۔ تیسرے باب 'مٹھی بھر لوگ' میں جہاں مصنف اپنے آپ کو کشمیری کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے وہیں کشمیر کے تین خطوں، کشمیر، جموں اور لداخ، جو بود و باش، ثقافت اور زبان کے تعلق سے اپنا علیٰحدہ وجود رکھتے ہیں، کا ذکر کرتے ہوئے کشمیری پنڈتوں کی ریاست سے ہجرت کے مختلف عوامل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء کی ہجرت سے قبل بھی کشمیری پنڈت کس طرح ظالم حکمرانوں کے سبب ہجرت کرتے رہے ہیں اس پر بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ ماضی میں ہندو مسلم میل جول، بڈشاہ کی قومی یکجہتی کے سلسلے میں کوششیں اور بعد کے سیاست دانوں کی چالبازیوں کے سبب کشمیر کی تباہی کا منظر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس منظر کشی کے ساتھ ساتھ کشمیری پنڈتوں کی جفاکشی، ذہانت، علم سے رغبت، بیوپاری جھمیلوں سے دوری ساتھ ہی ان کے رسم و رواج کا ذکر بھی قاری کی جانکاری کے لیے خاصے کی چیز ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کشمیری پنڈتوں کے رسم و رواج اور تیوہار منانے کا طریقہ دوسرے ہندوؤں سے قدرے ہٹ کر ہے۔ مثلاً یگنیو پویت (جنیؤ ڈالنے کی رسم) اور شادی کے روز

پورے دن پوجا اور ہون کیا جاتا ہے۔ کشمیر کے موسم کے مدنظر شادیاں دن ہی میں ہوتی ہیں اور دولہے کو آتے جاتے وقت ایک مخصوص رنگولی (ویوگ) پر کھڑا کیا جاتا ہے اور اس کی آرتی اتاری جاتی ہے۔ جہیز کی بدعت عام ہے اور کئی لڑکیاں جہیز نہ دے پانے کی وجہ سے شادی نہیں کر پاتی ہیں۔ کشمیری پنڈتوں کا سب سے بڑا تیوہار شوراتری ہے جس میں شیو اور پاروتی کی شادی کی رسمیں نبھائی جاتی ہیں۔ یہ تیوہار تقریباً پندرہ دن منایا جاتا ہے، گھر کی صفائی اور لیپا پوتی کی جاتی ہے کیونکہ اس کے ساتھ ہی موسم سرما کا خاتمہ ہوتا ہے اور بہار کی آمد ہوتی ہے۔ ان دنوں کوڑیوں کا ایک نرالا کھیل کھیلا جاتا ہے جس کا رواج غالباً کشمیر سے باہر کہیں نظر نہیں آتا ہے۔''

(ص ۴۰)

اگلے باب 'بچپن جو کہیں کھو گیا' میں دیپک بُدکی نے تفصیل کے ساتھ اپنے بچپن کا جہاں ذکر کیا ہے وہیں اپنے محلے کے باشندوں، ان کے مزاج، ان کے کھان پان پر بھی گفتگو کی ہے۔ اسی باب میں 'شیر' اور 'بکرے' کے سیاسی تنازعے کا بڑے لطیف پیرائے میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب میں ابتدائی اسکول کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ بھی قابل مطالعہ ہے۔

''سکول کیا تھا ایک جھر جھر بھوت بنگلہ تھا جو باہر سے ایسا لگتا تھا کہ اگر زوردار زلزلے کا جھٹکا آ جائے تو دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گا۔ پرانی لکھوری اینٹوں کا بنا ہوا مکان، گھاس پھوس کی چھت جس پر مٹی بچھی ہوئی تھی اور سبزہ اُگا ہوا تھا، ٹوٹی پھوٹی کھڑکیاں و دروازے اور دیواروں سے پلستر جگہ جگہ سے اترا ہوا جس کو بچے مزید کھرچ کر کھا لیتے تھے۔ اینٹیں بھی کہیں کہیں اکھڑی ہوئی تھیں جن میں چڑیوں، میناؤں اور کبوتروں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ دائیں بائیں کہیں کوئی سبزہ نظر نہیں آتا تھا۔ سکول بلڈنگ کے سامنے ایک بڑا سا صحن تھا جس میں ہم بچے ریسس کے وقت کھیلا کرتے تھے۔ کھیلتے کم اور دھول زیادہ اڑایا کرتے تھے۔ سکول میں میز تھی نہ کرسیاں۔ ہم لوگ گلی سڑی ٹاٹ پر بیٹھا کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ہیڈ ماسٹر کا نام محمد یٰسین صاحب تھا'' (ص ۵۰)

اسکول کے ماحول پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ اس صداقت کو بھی زیرِ قلم لائے ہیں کہ اسکول میں کس طرح طلبہ آپس میں مغلّظات بکتے تھے اور سگریٹ نوشی، منشیات اور جنسی کجرویوں میں ملوث رہتے تھے لیکن ان کے والد کی نصیحت ان کے کام آئی۔ اسی باب میں والدین کے ذریعے تعمیر کیے جانے والے مکان کا ذکر بھی ہے۔ وہ اپنی والدہ کی تندمزاجی اور ان کی موت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے غصے کو گھر کے دیگر افراد میں بھی وراثت میں آنا بتاتے ہیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد بدکی صاحب کا پسندیدہ کھیل تو چھوٹ ہی گیا البتہ ان کا دوسرا شوق مصوری کافی عرصے تک برقرار رہا۔ شفیق اور رحمدل والد کی محبتوں نے ان کی پرورش اور ان کی شخصیت کو پروان چڑھانے میں جو جانفشانی دکھائی ہے بدکی صاحب نے والد کی اس فکر مندی اور ہنر مندی کی داد دی ہے۔ علاوہ ازیں والدہ کی موت کے بعد اپنی عزیز بیوہ پھوپھی 'جگری'، جنھوں نے ان کی پرورش کی، دیپک بُدکی نے بے پناہ عقیدتوں کے ساتھ ان کا ذکرِ خیر کیا ہے۔ پانچواں باب 'میرے محسن، میرے رہنما' کے عنوان سے کشمیر کے گاندھیائی رہنما پنڈت شام لال صراف، جو کہ بدکی صاحب کے حقیقی پھوپھا تھے، کے بارے میں قائم کیا گیا ہے۔ اس باب میں صراف صاحب کی زندگی کے غیر سیاسی و سیاسی سفر کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جس کے ذریعے صراف صاحب کی عظمت، سیاسی بصیرت اور دیانت داری پر روشنی پڑتی ہے کہ کس طرح وہ عوام تو عوام گھر کے افراد کے لیے بھی اپنے اصولوں کو توڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چھٹے باب 'عہد جوانی رو رو کاٹا!' میں مصنف نے اسکول سے فراغت کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا ہے، اس کا سن شعور بالغ ہونے لگا ہے، اپنے پرائے کی تمیز، اچھے کاموں کو قبول کرنا، بری عادتوں سے دور رہنا اور واقعات و حادثات کا فرق سمجھ میں آنے لگا ہے۔ اپنے قابل استاد بشیر احمد کی سادگی اور ان کے پڑھانے کے انداز کو بدکی نے جس طرح سراہا ہے وہ ان کی اپنے استاد کے تئیں عقیدت مندی کا غماز ہے۔ وہ اپنے ذوق مطالعہ کے حوالے سے جہاں کالج کی تعلیم کا ذکر کرتے ہیں وہیں کرشن چندر کے ناولوں کے ساتھ ساتھ جنسی کتابوں کے مطالعے کے ذکر سے بھی گریز نہیں کرتے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ کا اپنے طلبا کے

ساتھ جو جارحانہ رویہ تھا اس کا تذکرہ بھی نوک قلم پر آ گیا ہے۔ سب سے اہم بات کشمیری برہمن اساتذہ کا سرد اور مخالفانہ رویہ ہے جس کے مقابل بشیر صاحب اور جاوید صاحب کی ایک برہمن طالب علم کے لیے گرم جوشی اور خلوص و محبت ہندوستان کی اس تہذیب کو مزید استحکام بخشتا ہے جو اس ملک کی روایت رہی ہے۔ کشمیری پنڈتوں کے بارے میں بُد کی صاحب نے اپنا ذاتی نظریہ ان الفاظ میں رقم کیا ہے:

''...ایک کشمیری پنڈت کو دوسرا کشمیری پنڈت ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ دوسرے پنڈت کو اپنا بھائی نہیں اپنا حریف سمجھتا ہے۔'' (ص ۴۷)

سوانح نگار مزید تحریر کرتا ہے:

''ایک ہندو اور وہ بھی کشمیری پنڈت نے مجھے برباد کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی جب کہ ایک مسلمان نے میری زندگی سنواری۔'' (ص ۹۷)

اسی باب میں ایم ایس سی کی اعلیٰ تعلیم، بی ایڈ کی تربیت اور اردو زبان کی تعلیم کے ساتھ کشمیر ایمپوریم کے چنڈی گڑھ برانچ میں تقرری، کشمیر کے مختلف اخبارات کے لیے کارٹون بنانا، کوچنگ سینٹر میں طلبا کو پڑھانا، ایک پڑوسی استاد کے ساتھ امتحان کی کاپیاں جانچنا اور ماہنامہ شمع کے 'بغیر عنوان' کہانیوں کے عنوان تلاش کرنا وغیرہ کے ناکام تجربوں اور کامیابیوں کے ذکر سے ان کی طالب علمانہ زندگی کی جدو جہد کا اندازہ ہوتا ہے۔

'سیاہی کی ایک بوند' اس معنی میں دلچسپ ہے کہ یہاں دیپک بُدکی کے ذہن میں وہ انکھوا پھوٹتا ہے جو مستقبل میں ان کو ایک بڑا ادیب اور معتبر افسانہ نگار بنا رہا ہوتا ہے اگرچہ اس باب کی ابتدا وہ اپنے عزیزوں کی موت اور اس کے خوف کے ذکر سے کرتے ہیں۔ والد اور پھوپھی کی نرم مزاجی اور گھریلو پریشانیوں کا بھی سرسری تذکرہ کرتے ہوئے اپنے پھپیرے بھائی کی ناگہانی موت کے تاثرات کو ایک ڈرامے کی شکل میں صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا اس باب کی زینت ہے۔ یہ اقتباس دیکھیں۔

> ''رات کو گھر لوٹا تو ایک عجیب سی بے یقینی اور بے ثباتی نے گھیر لیا۔ہم عمر راز داں کے اچانک بچھڑنے نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔لاشعوری طور پر کاغذ اور قلم کی طلب ہوئی۔اپنے مجروح جذبات کو قرطاس پر انڈیلنے کی زبردست چاہت ہوئی جس کی پیش بندی بہت پہلے کشمکش زیست نے کر لی تھی۔میرے پاس ایک ڈائری تھی جس میں خوبصورت منی ایچر تصویریں تھیں،اسی کے خالی صفحات پر تک بندی کر کے کچھ لکھنے کی کوشش کرتا رہا۔پھر رات بھر ایک ہی نشست میں پورا ڈرامہ 'بندھن' کے عنوان سے لکھ مارا۔وہ شاید میں نہیں بلکہ میرے غم کی انتہا تھی جو بوند بوند میرے قلم کی سیاہی بن کر کاغذ پر ٹپک رہی تھی۔ (ص ۱۰۷)

مندرجہ بالا اقتباس ایک ناتجربہ کار اور پہلی بار کاغذ قلم پکڑنے والے اس نوعمر نوجوان کی داستان بیان کرنے میں کامیاب ہے اور اس بات کی دلیل بھی ہے کہ گزرے وقت کے ساتھ ساتھ ڈرامہ 'بندھن' اور 'سلمیٰ' افسانہ لکھنے والے نوجوان کے قلم کی سیاہی آگے چل کر قاری کو ذہنی مسرت ہی نہیں بلکہ زندگی کی قدروں کو سمجھنے میں بھی معاون و مددگار ہو رہی ہے۔اس کے علاوہ اس باب میں ادبی پرچوں میں شائع کہانیوں ، ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں میں شرکت ، کشمیری صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات اور ان کے ساتھ گزارے وقت کی تفصیل درج ہے۔ ہفتہ وار 'عقاب' میں بحیثیت نائب مدیر کام کرنا اور اخبار کے عید اور محرم نمبر نکالنا، اسی اخبار میں شیخ عبداللہ کے خلاف مضمون لکھنا اور سی آئی ڈی کی برقی نگاہوں میں آجانا، عقاب سے علیٰحدگی اور ریاستی وزیروں کے عشقیہ معاملات وہ دلچسپ واقعات ہیں جو قاری کے معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔اسی دوران سِول سروس میں سلیکشن کے سبب بطور ٹرینگ مسوری جانے اور فیلڈ تربیت کے دوران یو پی کے مختلف شہروں میں اردو صحافیوں اور ادیبوں سے ملاقات کرنے کے ساتھ لکھنؤ پوسٹنگ کا ایک واقعہ اس طرح تحریر کیا گیا ہے۔

> ''انڈین پوسٹل سروس جوائن کرنے کے بعد میرے ساتھ لکھنؤ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے اپنی قابلیت پر شک ہونے لگا۔میں جب سرکل آفس میں پروبیشنر

تھا، اس وقت شمس الرحمٰن فاروقی صاحب ڈائریکٹر تھے۔ ایک روز میں نے ان کے تاثرات جاننے کے لیے اپنے افسانے پیش کیے۔ فاروقی صاحب چونکہ جدید تحریک کے بنیادگزاروں میں سے تھے اس لیے بیانیہ واظہاریہ افسانے پسند نہیں کرتے تھے، جس کا مجھے علم نہیں تھا، انھوں نے دو تین روز کے بعد میرے افسانے لوٹاتے ہوئے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا مگر ان کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ انھیں میرے افسانے پسند نہیں آئے تھے۔ میرے اصرار پر انھوں نے صرف اتنا کہا۔'' ہاں ٹھیک ہے۔ ان میں ایک افسانے 'جاگو' کا آخری پیرا گراف غیر ضروری لگتا ہے۔'' میں نے ان کی سرد روی کا غلط مطلب نکالا اور سوچا شاید میرے افسانے معیاری نہیں ہیں۔ اس لیے انھوں نے کھل کر اپنی رائے ظاہر نہیں کی۔ اس بارے میں میں نے کسی انٹرویو میں کہا تھا کہ انھوں نے ناک بھوں چڑھائی تھی جو میری غلطی تھی کیونکہ انھوں نے کسی ردِعمل کا اظہار کیا ہی نہیں تھا۔ اس مبالغہ آمیزی کے لیے میں معافی کا خواستگار ہوں۔'' (ص۱۲۳)

اس مبالغہ آرائی پر ندامت اور پشیمانی کے سبب معافی کا خواستگار ہو کر بُدکی صاحب ایک نہایت ذمے دار اور محتاط شخصیت ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ آٹھواں باب 'جہد زیست' بُدکی کی مسلسل جد و جہد، مختلف نوکریوں کے لیے تگ و دو اور وہاں کام کرتے ہوئے مختلف النوع تجربات و واقعات کو قلم بند کرتے ہوئے کشمیر ایمپوریم کی اشوکا ہوٹل دہلی برانچ کا ایک رومانٹک واقعہ نذر قارئین کیا گیا ہے۔

''اشوکا ہوٹل برانچ میں بھی منافع خوری کی بدعت جاری تھی اور وہاں بھی میں نے بالائی آمدنی کمانے سے انکار کر دیا۔ اس طرح -/۲۵۰ روپے کی ماہانہ آمدنی کے ساتھ مشکل سے گزارا کرتا رہا۔ بہر حال اشوکا ہوٹل میں نوکری کا اپنا ہی مزہ تھا۔ میری عمر بائیس سال تھی، ابھی دنیا دیکھی نہیں تھی اور عریاں عورتیں صرف تصویروں میں دیکھی تھیں۔ یہاں تو شوروم کے سامنے سوئمنگ پول تھا جہاں خوبصورت مرمریں دوشیزائیں سوئمنگ سوٹ پہن کر نہاتی اور ستاتی تھیں۔ ایسے نظارے

پہلی بار دیکھنے کو مل رہے تھے۔ جس روز میں محض نئی پوسٹنگ کا مقام پتہ کرنے کے واسطے گیا تھا، سنگ مرمر جیسی ایک یورپی دوشیزہ سوئمنگ پول سے سیدھے اوپر چڑھ کر شوروم کے اندر داخل ہوئی۔ اس کے بدن پر بس ایک بڑا سا تولیا تھا اور بدن کی گولائیاں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ وہ شوکیس میں ٹنگے کرتوں کو ٹٹولنے لگی۔ پھر اپنی پسند کا ایک کرتا اٹھا کر ٹرائی روم میں چلی گئی۔ پردہ ادھورا ہی کھینچ لیا اور کرتا پہننے لگی۔ اوپر سے کرتا گلے کے نیچے اتر رہا تھا نیچے سے تولیا کھسک رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے وہ بالکل برہنہ ہو گئی اور میری آنکھیں یہ منظر دیکھ کر چندھیا ئیں۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھنے لگا کہ ایسی خوبصورت جگہ پر پوسٹنگ مل رہی ہے۔

(ص ۱۲۹)

محولا بالا عبارت میں جو منظر کشی کی گئی ہے اس میں تصنع بالکل نہیں ہے۔ بُدکی کے دل نے جو محسوس کیا ہے اسے قاری کی لطف اندوزی کے لیے تحریر کر دیا گیا ہے۔ واقعے کو بیان کرتے ہوئے زبان کی سادگی، الفاظ کی نشست و برخاست اور واقعے کو پیش کرنے کا انداز نوجوان دلوں کو بھڑکانے میں ہی نہیں بلکہ بوڑھے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے بھی کافی ہے۔ اس واقعے کے علاوہ دلیپ کمار، شتروگن سنہا، فلم دستک کی ہیروئن ریحانہ سلطان اور سونیا گاندھی سے ملاقاتیں اور ان سے ہونے والے تاثرات کا ذکر تو کرتے ہی ہیں وہیں بڑی ایمان داری کے ساتھ اپنا پہلا عشق، اس کی ناکامی نیز ایمپوریم کے سامان کی خرید و فروخت میں خرد برد کے ساتھ سینی گال کے گاہک ابوبکر کبیکی سے دوستی کا تفصیلی ذکر، اس کے ذریعے تحفتاً سوٹ دیا جانا، اسی سوٹ کو پہن کر آئی اے ایس کا انٹرویو دینا، دہلی کے قیام کے دوران اپنے اعزا، دوستوں کے ساتھ قیام اور مٹر گشتی، اسکول کی نوکری اور درس و تدریس کے طریقۂ کار پر ایک طالب علم کے سوال اٹھائے جانے پر اسکول سے استعفیٰ دینا ان کی صاف گوئی اور نیک نیتی کا آئینہ دار ہے۔ اس باب میں درج مختلف واقعات سے ان کی حوصلہ مندی کا پتہ چلتا ہے۔

'شادی خانہ بربادی' میں دیپک بُدکی نے اپنی شادی کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے

اہلیہ کی بے مروتی کے سبب ذہنی انتشار اور ردِ عمل کے بعد زندگی میں جو جمود پیدا ہوا اور جس کے باعث دیپک بُدکی کی زندگی ہی نہیں بلکہ پورے گھرانے کی زندگی تباہی کے دہانے پر آ گئی، کا دلسوز ذکر کیا ہے۔ دسویں باب 'نیا پیشہ نئی چنوتیاں' کا آغاز وہ اپنی شادی کی تاریخ سے ہی نہیں بلکہ دو روز بعد سول سروس کی ٹریننگ میں شامل ہو کر اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے کی کوشش سے کرتے ہیں۔ مسوری میں تربیت کے دوران ان کے دل میں مصوری کا جذبہ دوبارہ جاں گزیں ہوا اور دل میں دبی چنگاری کو دوبارہ شعلۂ جوالہ بننے کا موقع مل گیا۔ بعد میں فیلڈ ٹریننگ کے دوران انھیں یوپی کے مختلف اضلاع میں کام کرنے کا موقع فراہم ہوا جہاں پر مختلف شاعروں اور ادیبوں سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ تربیت مکمل ہونے کے بعد پہلی پوسٹنگ سرینگر میں ہوئی، گھر کے تمام افراد خوش ہوئے لیکن اہلیہ نے بغیر کسی جواز کے مکان کی پہلی منزل سے چھلانگ لگا کر گھر کی تمام خوشیوں اور اہل خانہ کی مسرتوں پر پانی پھیر دیا۔ ظاہر ہے اس واقعے کا اثر دیپک بُدکی کے ذہن پر کیا پڑا ہوگا وہ ہر ذی شعور شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ ایک یہی واقعہ نہیں اہلیہ کی جانب سے مسلسل آزار پہنچانا اور دیپک بُدکی کو ذہنی کوفت میں مبتلا رکھنا اہلیہ کا شیوہ بن چکا تھا۔ اس سلسلے میں بُدکی صاحب فرماتے ہیں:

> ''گھریلو تفرقات نے میرے سوچنے کی طاقت سلب کر دی تھی۔ شیلانگ میں ایک مرتبہ نہ جانے کیا سوجھی کہ اپنے تمام تر مسودے مع ان رسالوں کے جن میں میری نگارشات شائع ہوئی تھیں نذر آتش کر لیے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید قلم کار ہونے کی وجہ سے میں زود حس ہو رہا ہوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے فکر مند اور پریشاں رہتا ہوں جو گھریلو چپقلش کو مہمیز کرتی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اس تخلیقی مادہ کو یک لخت دفن کر لوں۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ اس طرح میں نے اپنا سارا تخلیقی سرمایہ آگ کے حوالے کر دیا۔ اس حوالے سے نریش کمار شاد کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:
>
> ؎ بھول جا اے شاد اپنی شاعری کو بھول جا / کر کلرکی، کھا ڈبل روٹی، خوشی سے پھول جا

> اس وقت جو کچھ بھی میں نے کیا سب وقتی جنون کے تحت ہوا لیکن بعد میں بہت پچھتانا پڑا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ اب جو یاد آتا ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ وہ 'جہان نو'، 'نوجیون' اور 'ہمارا کشمیر' کے کارٹون، وہ 'عقاب' کی فائلیں جن میں میرے مضامین، افسانے اور کارٹون شائع ہوئے تھے، وہ آفتاب کے صفحات جن پر میرے افسانے میرے فکر وخیال کی ترجمانی کر رہے تھے، وہ 'رفتار جموں'، 'تعمیر ہریانہ' اور 'تعمیر سرینگر' کے شمارے جن میں میری کہانیاں محفوظ تھیں اور وہ ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے جو ابھی تک تشنۂ اشاعت تھے، سب خاکستر ہو گئے۔ اس طرح میری پہلے دور کی تخلیقی دنیا راکھ ہو گئی۔'' (ص ۲۱۳-۲۱۴)

اسی باب میں نوکری کے دوران آنے والی پریشانیاں، محکمے کے افسران کے درمیان سیاسی رسہ کشی، دیانت داری اور مکاری کے درمیان ہونے والے فیصلے اور ایمانداری پر جھوٹ کا غلبہ جہاں قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے وہیں ایم ایل ہنڈو جیسے ایمان دار شخص کا ذکر قابل تعریف ہی نہیں بلکہ قابل اتباع ہے۔

گیارہویں باب کا عنوان 'فوج کے ساتھ چند سال' ہے۔ دیپک بُدکی کی تقلیب ماہیت ہو کر اب کرنل بُدکی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ فوجی ماحول، فوجی افسراوران کی قانون شکنی، اہلیہ کی اسکول میں تقرری، عشقیہ معاملات وجنسی محرکات، اسٹاک ایکسچینج میں دلچسپی، شمال مشرقی ہند کا جغرافیائی تذکرہ اور وہاں کے باشندوں کے رہن سہن اور بود و باش کا بیان اس باب کی زینت ہے۔ ساتھ ہی والد کے انتقال کے سبب فوج سے واپسی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ 'زندگی کا ایک تاریک باب' میں جہاں بنکاک ٹریننگ کا ذکر ہے وہیں مکان کی تعمیر کے دوران کشمیری دہشت گردوں کے ہاتھوں ہندوستانی نظام کو للکارتے ہوئے شورش اور تخریب کاری کا بیان اور پنڈتوں کو وادی چھوڑنے کا حکم انتظامیہ کے مفلوج ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ حکم نامے کے مطابق خوف ودہشت کے سبب کشمیری پنڈت جموں کی جانب رخ کرتے ہیں۔ ان تمام دلدوز واقعات اور یہاں کے سیاسی لیڈروں بشمول فاروق عبداللہ، جی ایم شاہ اور گورنر جگ موہن کی کارکردگیوں کا بڑی بے

باکی اور جرأت مندانہ طریقے سے تجزیہ کیا گیا ہے جو دیپک بُدکی کی سیاسی بصیرت اور دانشمندی کی نشاندہی کرتا ہے۔اس دور کے گورنر جگ موہن کے سیاسی فیصلوں پر بُدکی صاحب کا تجزیہ دیکھیے:

''جگ موہن کے دور میں کئی ایسی وارداتیں ہوئیں جو روکی جاسکتی تھیں۔اگر اس نے چارج لیتے ہی سبھی افسروں کی کانفرنس بلا کران کو ہوشیار رہنے کی تلقین کی ہوتی اوران کی حفاظت کے لیے سیکورٹی کے پختہ انتظامات کیے ہوتے تو شاید کھیڑا اور مشیرالحق کی موت واقع نہ ہوتی۔اس نے لسہ کول کو یوم جمہوریہ کے موقع پر ٹی وی پر ہندوستانی جھنڈا لہرانے کی رسم کو پبلسٹی دینے کی تاکید تو کرلی مگراس کی حفاظت کے اقدام نہیں کروائے اور وہ ملی ٹنٹوں کی گولیوں کا شکار ہوگیا۔مرکزی دفاتر جو جموں چلے گئے اور پھر جو لوگ واپس سرینگر دفتروں میں کام کرنے کے لیے بلائے گئے ان کے لیے یکساں قوائد وضوابط نہیں بنائے گئے جن کی وجہ سے کئی کورٹ کیسز آئے دن دائر ہونے لگے۔یہی حال مائیگرنٹوں کا تھا جن کے لیے کوئی واضح قانون نہیں بنایا گیا۔یہ بات صحیح ہے کہ گورنر جگ موہن نے حتی المقدور کوشش کی کہ کشمیر میں لگی آگ کو کنٹرول کیا جائے اور شاید اگر وہ نہ ہوتے تو کشمیری پنڈتوں کی حالت بدتر ہوتی مگر بحثیت ایک ایڈمنسٹریٹر کے وہ ایک 'نرسنگ آرڈرلی' بننے آیا تھا جس میں وہ ناکام رہا اس لیے بدنام ہوکر برطرف کیا گیا۔

حبیب جالب فرماتے ہیں:

؎ وہ چمن جسے ہم نے خون دل سے سینچا تھا/اس پہ حق جتاتی ہیں آج بجلیاں اپنا

ملی ٹینسی کے بارے میں جیسا میں نے پہلے بھی کہا ہے ریاستی اور مرکزی سرکاروں کا ردعمل صحیح نہیں تھا۔مرکزی دفاتر اور افسروں کی کوئی کارڈنیشن نہیں تھی۔ جو لوگ شہید ہوئے ان کو گورنمنٹ نے معاوضہ دینے کے لیے کوئی یکساں قانون نہیں بنایا،کسی کے لواحقین کو ایک لاکھ دیا گیا اور کسی کے لواحقین کو سات لاکھ دیے گئے۔لواحقین کو نوکریاں دینے میں بھی یکساں قانون نہیں بنائے گئے۔کہیں کہیں تو ان لوگوں کو بھی نوکریاں دی گئیں جن کے والد یا بھائی بندو دہشت گردی میں ملوث

تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں، افسر شاہی نے ان حالات کا سب
سے زیادہ فائدہ اٹھالیا۔ (ص ۲۲۳-۲۲۲)

ان تمام حالات کا اثر سرکاری دفاتر اور سرکاری کاموں پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ پوسٹل سروسز پر بھی دہشت گردی کا اثر دکھائی دینے لگا۔ وادی میں کرفیو اور ہڑتالوں کی وجہ سے دفاتر میں کام بڑی مشکل سے ہو رہا تھا۔ ہندو ملازمین دفاتر سے غائب تھے، مسلم ملازمین سے کسی طرح وادی میں کام چلایا جا رہا تھا۔ یہ بدکی صاحب کی سوجھ بوجھ اور افسرانہ دانشمندی کا نتیجہ تھا جس کی تفصیل اس باب میں دی گئی ہے۔ مصنف نے اقتصادی اور معاشرتی زبوں حالی اور افسروں کے لائحہ عمل پر بھی سوال قائم کیے ہیں۔ ان کے اس برملا اظہار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں کشمیری عوام کے ساتھ ساتھ اپنی فرض شناسی اور محکمے کے تئیں ذمے داری کا مکمل احساس تھا۔

'نیشنل ڈیفنس کالج کی چند یادیں' کے تحت تربیت کے دوران وہاں گزارے گئے خوشگوار ایام اور مختلف ممالک کے دورے نیز وہاں کی جغرافیائی، تاریخی، سماجی اور اقتصادی حالات کی مختصر معلومات دی گئی ہیں۔ مزید سابق وزیر نٹور سنگھ اور من موہن سنگھ کی تقاریر پر گفتگو کرتے ہوئے بڑے لطیف طنز کیے گئے ہیں جو بدکی صاحب کی ذہنی اور سیاسی بلوغت کا نتیجہ ہے۔ یہاں بدکی صاحب کے ذریعے من موہن سنگھ، جو بعد میں وزیر اعظم بن گئے، سے کیے گئے سوال کا پس منظر دیکھیے۔

> ''سر، کرپشن شروع ہوتا ہے آپ سیاست دانوں سے۔ سارا معاشرہ ہی کرپٹ ہے پھر آپ کس کس کو کیفر کردار تک پہنچائیں گے؟'' انھوں نے متانت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''دیکھیے کرپشن کو ختم کرنے کے لیے میرے پاس دو آپشن ہیں۔ ایک یہ کہ میں ان لوگوں سے لڑوں جو کرپشن کو تقویت پہنچاتے ہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ میں اکیلا ہوں اور وہ کثرت میں، ایسے تناظر میں ممکن ہے کہ وہ مجھے ہی اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان کے درمیان میں رہ کر ان کے پر کترتا رہوں اور آہستہ آہستہ ان کی بیخ کنی کروں۔

میں نے دوسرا آپشن اختیار کیا ہے۔'' مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس بات کو گرہ باندھ کر رکھ لیا اور خود اس پر عمل کرنے لگا۔ مگر منموہن سنگھ صاحب اپنے قول پر کتنا چلے اور کامیاب ہوئے، وہ تب پتا چلا جب وہ ملک کے وزیر اعظم بنے اور ان کی آنکھوں کے سامنے گھوٹالے پر گھوٹالے ہوتے رہے۔ وہ خاموش بُت کی طرح انھیں دیکھتے رہے اور اپنی کرسی بچاتے رہے۔ دیوتا بھی کبھی کبھار جبلی خواہشات کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔'' (ص ۲۴۴)

چودھواں باب 'ڈاک جیون بیمہ- ایک یادگار دور' کے طور پر 'لوحِ حیات' میں شامل کیا گیا ہے جس میں ڈاک جیون بیمہ اور انشورنس اسکیموں کے اصول وضوابط، دیہی عوام کے لیے محکمے کو بیمہ کرنے کی اجازت ملنا، متعلقہ افسران کے خوشامدانہ مزاج اور افسر شاہی کی سرد روی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو دیپک بُدکی نے جس محنت اور بہادری کے ساتھ ملی ٹینسی کے دور میں اپنی کارکردگی کا مضبوط مظاہرہ کیا تھا اور پھر ڈاک جیون بیمہ کی دیہی اسکیم کے ذریعے محکمے کے لیے کروڑوں کا مارکیٹ کھولا تھا، اس کے پیشِ نظر انھیں انعام واکرام سے نوازنا چاہیے تھے لیکن اس کے برعکس خوشامدی افسر، ان کے اس کام سے اپنی سبکی محسوس کر رہے تھے اس لیے انھوں نے بُدکی کا نام آگے بڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

پندرھویں باب 'ذکرِ خوباں' میں انھوں نے پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے معاشقوں کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ لذتِ وصل کو شاعرانہ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ جوش کے معاشقے یاد آنے لگتے ہیں اور ایک غلو سا لگتا ہے لیکن یہ دنیا ہے جہاں عورت مرد کو بگاڑنے اور سنوارنے میں پیش پیش رہتی ہے۔ ان کی اہلیہ جہاں ان کو ذہنی اذیت پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی وہیں دوسری خواتین شربتِ وصل پلانے کے ساتھ ساتھ ان کو ذہنی اور جسمانی سکون بھی پہنچا رہی تھیں جو ایک باشعور مردِ کامل کے لیے ضروری ہے۔

'تدریسی تجربہ- ایک دیرینہ خواب' 'لوحِ حیات' کا سولھواں باب ہے جس میں دیپک

بُد کی اپنے دیرینہ خواب کو پایۂ تکمیل تک پہنچتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ان کی ابتدا ہی سے یہ کوشش تھی کہ وہ درس وتدریس کے پیشے سے جڑ جائیں جس کے لیے تعلیم سے فراغت پا کر انھوں نے بی ایڈ کی تعلیم بھی حاصل کی اور دہلی کے قیام کے دوران اس پیشے کو اختیار کرنے کی کوشش بھی کی لیکن کوئی نہ کوئی رخنہ آڑے آتا رہا اور بالآخر تقرری انڈین پوسٹل سروس میں پا گئے۔ یہاں مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے پوسٹل لائف انشورنس میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے کہ ان کو پوسٹل اسٹاف کالج غازی آباد جو کہ پوسٹل سروسز میں کام کرنے والے افسران کا تربیتی تعلیمی ادارہ ہے، میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔اس تقرری سے بُد کی صاحب خوش تھے کہ اسکول میں نہ سہی پوسٹل تعلیمی ادارے میں ہی کام کرنے کا موقع ملا۔اِدارے کے ڈائریکٹر ایک نیک دل انسان کے ایس بھٹ تھے جنھوں نے بُد کی سے تفصیلی گفتگو کے بعد ان کو آئی پی ایس کی تعلیمی تربیت کے ساتھ ہی کالج کی ایڈمنسٹریشن کا چارج بھی دے دیا جہاں پر انھوں نے پوری سوجھ بوجھ اور محنت سے افسران کو تربیت یافتہ کیا اور کالج کے تعمیراتی کاموں کو بھی پورے انہماک کے ساتھ انجام دیا۔ کالج کی شجر کاری، پارکوں کی ہریالی آج بھی اس امر کی گواہی دیتی نظر آتی ہے۔ بھٹ صاحب کے بعد کالج میں جو ڈائریکٹر آئے انھوں نے بُد کی کی صلاحیتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک اپنا الگ گروپ تیار کر لیا اور بد کی صاحب کو زک پہنچانے لگے۔ مگر قدرت کا انصاف دیکھیے کہ بعد میں وہ خود ہی کرپشن کے الزام میں موردِ الزام ٹھہرے اور آگے ترقی نہ پا سکے۔ ماضی کا کیا دھرا ان کے سامنے تھا۔اُدھر دیپک بُد کی کی اہلیہ مسلسل درپۂ آزار تھیں۔ان کی کوششیں تھیں کہ کسی نہ کسی طرح شوہر کو کوئی نقصان پہنچاؤں چنانچہ بات اب گھر سے نکل کر تھانہ پولیس ہوتے ہوئے محکمے کے اعلیٰ افسران تک پہنچ گئی۔اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ بُد کی کا ٹرانسفر پہلے منی پور اور پھر اگرتلا کر دیا گیا۔خودنوشت کے اس باب میں بھی وہی افسروں کی عیاری، بیوی کی ضد اور ناعاقبت اندیشی کے سبب بُد کی کو جو ذہنی اذیت ہوئی اس کا اندازہ قاری کو اچھی طرح ہو جاتا ہے۔اگلے باب 'نارتھ ایسٹ–خستہ حال و زبوں زار' میں تریپوری قبائل اور مہاجر بنگالیوں کے مزاج اور بود و باش کے حوالے سے گفتگو کو آگے بڑھایا گیا

ہے۔ نارتھ ایسٹ خاص کر تر پورا میں اس دور میں دہشت گردی کا بول بالا تھا۔ یہاں قیام کے دوران انھوں نے اپنے پرانے شوق بنگالی زبان سیکھنے کا عمل بھی جاری رکھا۔ دیپک بُدکی کی بیوی اس وقت غازی آباد کے سرکاری مکان میں ہی رہ رہی تھیں، بچے بھی اب تناؤ کا شکار ہو رہے تھے، چنانچہ دونوں بچوں کو اگرتلا لاکر مزید تعلیم کے لیے داخل کرادیا گیا۔ لیکن یہاں بھی دفتری سیاست، اور ملازمین یونینوں کی دخل اندازی کے سبب بیشتر کام ٹھپ پڑے ہوئے تھے۔ بُدکی نے دھیرے دھیرے یہاں کے حالات کو سمجھا اور اپنے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے عام ملازمین کے حق میں وہ فیصلے لاگو کیے جن کے لیے برسہابرس سے وہ پریشان تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونین کے لیڈر بھی ان کے قائل ہو گئے اور سرکاری کاموں میں ان کا تعاون کرنے لگے۔

'طوافِ لالہ زار' اس کتاب کا اٹھارواں باب ہے۔ آسام کی دھرتی سے نکل کر واپس کشمیر کی اس مٹی میں پہنچ گئے ہیں جہاں ان کا بچپن بیتا ہے۔ دہشت گردی میں پہلی سی شدّت تو نہیں ہے لیکن پھر بھی کہیں نہ کہیں سے کوئی بری خبر ضرور آجاتی ہے۔ سرکاری ملازمین اور افسران دہشت گردی کا پورا فائدہ اٹھا کر اپنے بھتے اور پرکس (Perks) میں اضافہ کرانے میں جٹے ہوئے ہیں۔ محکمے میں اونچی ذات کے لوگ اپنے سے کم تر لوگوں کے ساتھ کس طرح کا رویہ رکھتے ہیں، سائیں داس کے کیس سے پوری طرح عیاں ہے۔ اس باب میں کرگل کی جنگ اور جنگ کے دوران پوسٹل محکمے کی کارکردگی کے خصوصی ذکر کے ساتھ، باغِ مہتاب کے اپنے مکان کا کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کرنے، اہلیہ سے طلاق اور لداخ کے دورے کے سبب مرضِ قلب میں مبتلا ہونے کا بیان ملتا ہے۔

یہاں ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ جس قلمی جمود کا دیپک بُدکی شکار ہو گئے تھے اس جمود کو توڑتے ہوئے وہ ۱۹۹۶ء میں قلم اور کاغذ کی طرف نہ صرف رجوع کرتے ہیں بلکہ اپنے افسانوں کا مجموعہ 'ادھورے چہرے' منظر عام پر لے آتے ہیں جس کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوتی ہے۔ بعد میں وہ اس کتاب کا ہندی ترجمہ کرا کر شائع کرانے میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ اگلے

باب 'ادب ایک نئی شروعات' کے تحت بُدکی صاحب اپنی ادبی فتوحات، مصنفین سے ملاقاتیں، چند مشاعروں میں شرکت، برصغیر کے مختلف رسائل میں اپنی نگارشات کی اشاعت کے ساتھ اختتام پر وہ فہرست بھی درج کرتے ہیں جس کے ذریعے ان پر کیے گئے تحقیقی اور تنقیدی کاموں کا بیورا ملتا ہے۔

بیسواں باب 'جب گجرات دہک اٹھا' اس معنی میں دلچسپ ہے کہ کشمیر سے نکل کر اب انھیں گجرات میں تقرری دی گئی ہے اور یہ تقرری بُدکی کے ایک شکایتی خط بنام وزیراعظم اٹل بہاری باجپئی کی مداخلت کے طفیل میں ہوئی ہے۔ بُدکی صاحب نے گجرات کے لا اینڈ آرڈر، وہاں کی سڑکوں، بجلی اور پانی کی فراہمی، صنعتی ترقی، عوام کی جفاکشی اور سادگی کا ذکر کرتے ہوئے صنعت کاروں کی اس چالاکی کا ذکر بھی کیا ہے کہ کس طرح وہ سرکار سے صنعتی سستے پلاٹ لے کر مہنگے داموں فراخت کردیتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب نریندر مودی ریاست کے وزیر اعلیٰ تھے جنھوں نے بیواؤں کی پینشن ڈاک گھر کے سپرد کردی جس کے سبب پنشن صحیح ہاتھوں میں جانے لگی۔ اس سکیم کی کامیابی کو دیکھ کر گجرات بجلی بورڈ نے بھی بجلی بلوں کو ڈاک خانوں میں جمع کرنے کے لیے احکامات جاری کیے۔ گجرات کی مادی ترقی سے بُدکی صاحب جہاں خوش نظر آتے ہیں وہیں وہ تعلیمی نظام سے بدظن بھی ہیں۔ اپنی تعیناتی کے دوران گجرات کے دو بڑے سانحات کے بھی وہ چشم دید گواہ ہیں، پہلا سانحہ جو گودھرا میں ریل کے ڈبے میں آگ زنی کے سبب پورے گجرات میں فساد کی شکل میں پھیل گیا جس کا من وعن بیان کر کے بُدکی نے اس قلم کی لاج رکھی ہے جو ایک بےخوف اور نڈر مصنف کا شیوہ ہوا کرتی ہے۔ اس سے متعلق ان کی تحریر دیکھیے:

> ''گجرات کے فسادات انسانیت کے ماتھے پر کلنک ہیں، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کشمیر کے ہندوؤں اور دہلی کے سکھوں پر کیے گئے مظالم کو کیا نام دیا جائے؟ کیا وہ انسانیت کُش فعل نہیں تھے؟ چند سیاسی پارٹیاں گجرات کے دنگوں کو اچھالتی رہیں جبکہ مخالف پارٹیاں دہلی اور کشمیر کے فرقہ وارانہ

فسادات کا رونا روتی رہیں۔ کوئی پارٹی خود کو سیکولر کہہ رہی ہے اور کوئی قوم پرست۔
سچ تو یہ ہے اقتدار کی ہوس میں دونوں نے انسانیت کا خون کیا ہے۔ گجرات کے دل
دہلانے والے مناظر دیکھ کر میں اپنا اور اپنی برادری کا غم بھول گیا۔'' (ص ۳۰۵)

دوسرا سانحہ ۲۶/جنوری ۲۰۰۱ کا ہے جب زلزلے سے گجرات کے کئی شہروں میں عمارتیں تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئی تھیں لیکن متاثرہ عوام کی جس طرح گجرات نژاد صنعت کاروں نے مدد کی اس کی تعریف بدکی صاحب نے کی ہے۔ اس عظیم سانحے سے اس قدر جلد واپس ابھرنا گجراتیوں کی ذہانت، ان کی جفاکشی، محنت اور آپسی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اگلا باب 'پرتگالیوں کی آخری گڑھی' ہے۔ گجرات کے بعد بُدکی صاحب کا اگلا مستقر گوا ہے۔ جہاں انھوں نے قلیل مدت میں محکمہ جاتی کاموں کو بام عروج تک پہنچایا وہیں گوا کے باشندوں کے رہن سہن اور زندہ دلی کو بھی سراہا ہے۔ وہ اس سانحہ کو بھی نہیں بھولتے جس نے ان کے ضمیر پر دستک دی ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک درجہ فہرست ذات ملازم اعلیٰ ذات کے افسر کی زیادتیوں کا شکار ہو چکا تھا، بدکی نے اس کی مدد بھی کرنا چاہی لیکن وہ اس قدر بد دل ہو چکا تھا کہ اس نے خودکشی کر لی۔ بقول بُدکی ''یہ دوسرا موقع تھا جہاں ایک درجہ فہرست ذات کے ملازم نے اپنے ذہنی انتشار کا مظاہرہ کر کے میرے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا تھا۔'' بُدکی صاحب کی ضمیر کی یہ بیداری ان کی شرافت نفسی اور غریبوں سے ہمدردی کا ثبوت ہے۔

بائیسویں باب کو 'مراجعت ارضِ چمن سے' کا عنوان دیا گیا ہے جس میں بحیثیت چیف پوسٹ ماسٹر جنرل جموں و کشمیر سرکل کی تقرری کے دوران کی روداد شامل کی گئی ہے۔ دہشت گردی کے حالات میں اگر چہ کہ سدھار نظر آ رہا ہے، سیاح آ جا رہے ہیں لیکن ملی ٹنٹ آنکھ گڑائے بیٹھے ہیں کہ کس طرح دوبارہ ماحول خراب کیا جائے۔ بُدکی صاحب نے اپنی دلی کیفیت اور درد کو اس طرح بیان کیا ہے:

''اس بار یہاں مارچ ۲۰۰۹ء تک چار سال گزارنے کا موقع ملا۔ وہ جگہ جہاں میری

پیدائش ہوئی تھی، پلا بڑھا تھا، سکول، کالج اور یونیورسٹی گیا تھا، اب میرے لیے شجر ممنوعہ بن چکا تھا۔ فی الحقیقت سیکورٹی کے سائے تلے قیدیوں کی طرح جینا پڑ رہا تھا۔" (ص ۳۱۴)

ایک حساس اور باشعور انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔ وہ صرف اپنے درد کو الفاظ کا جامہ پہنا سکتا ہے۔ بُدکی نے بھی اس درد کو ساجھا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے بھی ان کو ذہنی سکون نہیں ملا اور وادی میں دہشت گردوں کا مسلسل احتجاج ان کو ایک آنکھ نہ بھایا کیونکہ بُدکی یہاں ایک ذمے دار افسر کے ساتھ ساتھ وادی کے باشندے بھی ہیں جس کو انھوں نے اپنے بچپن سے امن کے گہوارے کے روپ میں نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس کی ترقی کے خواب بھی اپنی آنکھوں میں پروئے تھے۔ چنانچہ شورش کے دوران ایک رات چھاتی میں شدید درد ان کی وطنی محبت اور انسانی ہمدردی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اگلا باب 'اوجِ سفرِ حیات' میں سِول سروس کی ابتدا سے ریٹائرمنٹ ۲۰۱۰ء تک کی مختصر روداد جہاں قلم بند کی ہے وہیں آخری باب 'سفر ابھی جاری ہے' میں کچھ سوالات خود ہی قائم کر کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے جو ذاتی زندگی کے حوالے سے بھی ہیں اور اپنے دفتری ماحول کے حوالے سے بھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد غازی آباد کے قیام پر سوانح کا اختتام ہوتا ہے۔

'لوحِ حیات' کے تفصیلی مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اس خودنوشت میں فنی اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ جن واقعات کو اس سوانح کا حصہ بنایا گیا ہے وہ دیپک بُدکی کی اُفتادِ طبع کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے احوال کو یادوں کے سہارے سمیٹنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ جس طرح انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کو آئینہ بنایا ہے اس سے بُدکی کی شخصیت سے ہمدردی پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ دیپک بُدکی نے خوش پوشاکی اور خوش خوراکی کے ساتھ ایک بھرپور اور ایماندارانہ زندگی گزاری ہے۔ نوکری کے دوران انھوں نے اپنے اصولوں سے کبھی سمجھوتا نہیں کیا اور ہر جگہ اپنی کارکردگی کے نقوش ثبت کیے ہیں۔

خودنوشت میں بول چال کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ واقعات کے بیانیے میں بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور قاری کی دلچسپی بڑھتی رہتی ہے۔ دیپک بُدکی چونکہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں اس لیے ان کی تحریر میں افسانے کا اسلوب در آیا ہے۔ مختلف علاقوں کے جغرافیائی تذکروں، وہاں کے مختلف تیوہاروں اور میلوں نیز کلبوں وغیرہ کی سرمستیاں اس سوانح کو جہاں دلچسپ موڑ دیتی ہیں وہیں معاشقوں کے تذکروں میں جو شاعرانہ اسلوب استعمال کیا گیا ہے وہ بے حد شگفتہ اور خوبصورت بھی ہے اور نثر پر ان کی دسترس کا ثبوت بھی۔ اس سوانح کے مطالعے کے بعد میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بُدکی صاحب کو گھریلو زندگی میں تو آسودگی نہیں مل پائی البتہ اپنے شخصی کردار کو عوامی عدالت میں پیش کر یقیناً ذہنی آسودگی محسوس ہوئی ہوگی۔ پوری خودنوشت سے ایک ایماندار، نڈر، بے باک اور حق گو شخصیت کا پرتو قاری کے سامنے آجاتا ہے جو ان کے تخیل کی ثروت مندی اور ادبی دیانت داری کی واضح دلیل ہے۔

☆☆☆

مضمون 'دیپک بُدکی کی خودنوشت۔لوحِ حیات'، مضمون نگار ڈاکٹر ذکی طارق، ۵۶۴، کیلا روڈ، گئوشالہ پھاٹک، غازی آباد ۔۲۰۱۰۰۹؛ موبائل (9818860029)

لوحِ حیات

-دیپک بُدکی کی خودنوشت سوانح عمری-

-قاسم رسا

مدت قدیم سے عظیم ہستیوں کی سوانح عمریاں ضابطہ تحریر میں آتی رہی ہیں۔ یہ سلسلہ اس لیے چلا کہ آنے والی نسلیں اس سے سبق لیں۔ پھر بادشاہوں، راجے مہاراجوں کی سوانح عمریاں ترتیب میں آتی رہیں۔ معدودے چند سیاست دانوں نے بھی اپنی سوانح ترتیب دی اور اس میں ایک آدھ ایسا راز پوشیدہ کر دیا کہ لوگ اس کا مطالعہ کر کے حیرت زدہ ہوئے۔ سلسلہ یہیں نہیں رکا۔ فن کاروں، ادیبوں اور شعرا نے بھی اس میدان میں اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ کچھ نے تاریخی انداز اپنایا، کسی نے ناول کی خصوصیات سے اسے دوچار کیا۔ مگر دیپک بُدکی صاحب تو معروف افسانہ نگار ہیں لہٰذا انھوں نے افسانوی خصوصیات سے اپنی خودنوشت سوانح عمری کو مزیّن کیا۔ اس سے پہلے کہ میں 'لوحِ حیات' پر قلم اٹھاؤں کچھ دیپک بُدکی کے بارے میں عرض کرتا چلوں تو بہتر ہوگا کیونکہ اس سے ان کی خودنوشت سوانح عمری پر روشنی ڈالنے میں آسانی ہوگی۔

بُدکی صاحب سے میرے زیادہ دیرینہ تعلقات نہیں ہیں مگر دو ایک سال سے ہماری ملاقاتیں ہیں۔ ان کا قد و قامت اور دلکش چہرا اتنا دل آویز ہے کہ کوئی بھی شخص ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی گفتگو بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ وہ ملازمت کے اعتبار سے اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ ہندوستان کے کئی مقامات پر دورانِ ملازمت وقت گزارا۔ کچھ وقت فوج کی سینا ڈاک سیوا میں بھی گزرا۔ آئی اے ایس کرنا چاہتے تھے مگر انڈین پوسٹل سروس پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ وادیِ کشمیر

میں تولد ہوئے اور تعلیمی مراحل بھی وہیں گزرے۔ زندگی میں بہت کم دوست بنائے مگر شبن کول، اشوک مصری، وجے واتل، نثار حسین، پریمی رومانی، انور ظہیر انصاری اور فرید پربتی (مرحوم) کی دوستی پر انھیں ناز ہے۔ مطالعہ کا بے حد شوق ہے۔ معروف زمانہ رسائل کی زینت بنتے ہیں اور ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ شاعر ممبئی، انتساب سرونج (مدھیہ پردیش) اور اسباق پونے (مہاراشٹر) میں ان کے گوشے اور نمبر شائع ہوئے جو بہت پسند کیے گئے۔ جموں یونیورسٹی میں ڈاکٹر جاوید اقبال شاہ نے آپ پر ایم فل کے لیے مقالہ تحریر کیا جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ محمد امین نجار نے بھی ایم فل کی ڈگری کے لیے 'دیپک بُدکی کے افسانوں میں نسوانی کردار' کے عنوان سے حیدرآباد یونیورسٹی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ اسی یونیورسٹی کے ایک اور طالب علم ریاض احمد نجار نے ایم فل کے لیے 'دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری - روح کا کرب اور ریزہ ریزہ حیات کے حوالے سے' مقالہ قلم بند کیا۔ صفیہ بانو اختر حسین نے 'دیپک بُدکی کے تخلیقی افکار کا تنقیدی مطالعہ' کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کے لیے ایم ایس یونیورسٹی بروڈہ میں اپنا مقالہ پیش کیا اور ڈگری حاصل کی۔ دوسری جانب پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی (مرحوم) اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری نے بُدکی صاحب کی شخصیت اور فن پر 'ورق ورق آئینہ' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع کی۔

آپ کے کئی افسانوں کے مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے عنوان اس طرح ہیں: (۱) ادھورے چہرے (۲) چنار کے پنجے (۳) زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (۴) ریزہ ریزہ حیات (۵) روح کا کرب (۶) اب میں وہاں نہیں رہتا (۷) مٹھی بھر ریت (افسانچوں کا مجموعہ)۔ مذکورہ سات مجموعوں میں پہلے مجموعے کے تین ایڈیشن اور دوسرے اور تیسرے مجموعے کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ نیز پہلے اور دوسرے کے ہندی ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔

دیپک بُدکی صرف افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ تنقید نگاری، تبصرہ نگاری اور تحقیق وغیرہ پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل کتابیں اس کی شاہد ہیں:

(۱) عصری تحریریں (۲) عصری شعور (۳) عصری تقاضے (۴) عصری تناظر (۵) عصری نقوش (۶) عصری مباحث (۷) جموں وکشمیر کا عصری ادب (۸) اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

بُدکی صاحب کوشاعری سے بھی لگاؤ ہے اور شاعری کرتے بھی ہیں مگر اب تک ان کا کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آ چکا ہے۔ خیر ان کے شعری ذوق کا پتہ ان کے ذریعے 'لوحِ حیات' کے پہلے ہی عنوان سے پیش کردہ مضمون 'جستجو کیا ہے' میں quote کیے گئے اشعار سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ باب کا ابتدائی شعر یوں ہے۔

؎ کچھ اپنا غم کچھ غم جہاں ہے
یہاں سے آغاز داستاں ہے

دیگر مضامین میں بھی حسب ضرورت معقول اشعار پیش کیے گئے ہیں جو ان کے شعری ذوق کی غمازی کرتے ہیں۔

بہر حال دیپک بُدکی ایک اچھے اور نیک انسان ہیں۔ جب دل دکھتا ہے تو اس کا غبار اپنی نگارشات کے ذریعہ منعکس کر دیتے ہیں۔

آیئے اب کچھ 'لوحِ حیات' کے بارے میں بات کی جائے۔ کتاب کے ٹائٹل کور پر بُدکی صاحب کے مسکراتے ہوئے چہرے سے ملاقات ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ زندگی میں کوئی غم نہیں، صرف مسکراہٹ ہی مسکراہٹ ہے۔ نہیں صاحب ایسا نہیں، ان کی حیات میں جو حادثات رونما ہوئے انھوں نے سب کو اسی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کیا ہے۔ اور اب بھی وہ مسکرا رہے ہیں۔ اس بات پر کہ زندگی کی تمام تلخیوں کو انھوں نے مسکراہٹ کی نذر کر دیا ہے۔ کتاب کا انتساب بڑا پیارا اور موزوں ہے بالکل ٹائٹل پر مسکراتے چہرے کی طرح۔ میں انھیں اس پر مبارک باد پیش کرنا چاہتا ہوں۔ انتساب کے بعد سپاس نامہ ہے جس میں انھوں نے ان مدیر حضرات کی سپاس گزاری کی ہے جنھوں نے ان کی شخصیت اور فن کو اپنے رسالوں میں بجا طور پر اجاگر کیا ہے۔ خاص طور

سے جناب افتخار امام صدیقی مدیر ماہنامہ شاعر ممبئی جو سرِ فہرست ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر سیفی سرونجی اور نذیر فتح پوری کی سپاس گزاری کی گئی ہے۔ ان میں کچھ ہستیاں اور بھی ہیں جن کا ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ سپاس نامہ میں وہ رقم طراز ہیں کہ ''مذکورہ بالا مقالات اور کتابوں میں میری شخصیت اور فن پر کافی روشنی پڑتی ہے مگر یہ برف کے اس تودے کے مترادف ہے جس کا بیشتر حصہ آنکھوں سے چھپا رہتا ہے، اس لیے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اپنی حیات کے بارے میں وہ سب کچھ لکھوں جو ابھی تک دنیا سے مخفی ہے۔ کتاب میں کسی بڑی ادبی شخصیت سے کوئی پیش لفظ تحریر کرانے کے بجائے انھوں نے اپنے قلم پر ہی اکتفا کیا ہے جو ان کی شخصیت کا ایک امتیازی پہلو ہے۔

فہرست کے مطابق کتاب کو ۲۴/ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عنوانات اس طرح ہیں: (۱) جستجو کیا ہے! (۲) کشمیر- کچھ کھٹی میٹھی یادیں (۳) مٹھی بھر لوگ (۴) بچپن جو کہیں کھو گیا (۵) میرے محسن میرے رہنما (۶) عہد جوانی رو رو کاٹا! (۷) سیاہی کی ایک بوند (۸) جہد زیست (۹) شادی، خانہ بربادی (۱۰) نیا پیشہ نئی چنوتیاں (۱۱) فوج کے ساتھ چند سال (۱۲) زندگی کا ایک تاریک باب (۱۳) نیشنل ڈیفنس کالج کی چند یادیں (۱۴) ڈاک جیون بیمہ- ایک یادگار دور (۱۵) ذکر خوباں (۱۶) تدریسی تجربہ- ایک دیرینہ خواب (۱۷) نارتھ ایسٹ- خستہ حال و زبوں زار (۱۸) طواف لالہ زار (۱۹) ادب- ایک نئی شروعات (۲۰) جب گجرات دہک اٹھا (۲۱) پرتگالیوں کی آخری گڑھی (۲۲) مراجعت ارضِ چمن سے (۲۳) اوجِ سفر حیات (۲۴) سفر ابھی جاری ہے

مجموعی طور پر یہ کتاب بہت دلچسپ ہے۔ زبان شستہ، صاف اور عمدہ ہے۔ ابواب کے جو عنوان دیے گئے ہیں ان کے مطابق کوشش کی گئی ہے کہ راقم جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کا پورا دھیان رکھا جائے اور بُدکی صاحب اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کا کشمیری لہجہ اردو زبان سے مطابقت نہیں رکھتا، ایسا لگتا ہے مگر جو بات کہی گئی ہے وہ مستند ہے۔ چونکہ بُدکی صاحب ایک ماہر افسانہ نگار ہیں اس لیے قاری کو کتاب کے مطالعہ میں اس کا بھی لطف حاصل ہوتا ہے۔ ان کے تجربات جو اکثر بیان کیے گئے ہیں قابل صد ستائش ہیں۔ تجربات کے آئینہ میں افسانہ پن کم اور

حقیقت زیادہ ہے۔

'لوحِ حیات' سے کچھ اقتباسات قارئین کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

☆'' جگ موہن اپنی کتاب ' مائی فروزن ٹربیولنس ان کشمیر' (My Frozen Turbulence In Kashmir) میں رقم طراز ہیں کہ اس ناجائز عسکری پھیلاؤ کے بارے میں میں نے وقتاً فوقتاً وزیر اعظم ہندوستان راجیو گاندھی کو انتباہی اشارے (The Warning Signals) بھیج دیے۔ میں جگ موہن کے اس دعوے سے اتفاق نہیں کرتا۔ کیا ایک ذمہ دار گورنر کا فرض صرف وارننگ سگنل بھیجنے کے ساتھ ختم ہوتا ہے؟ اگر اس کی آنکھوں کے سامنے ملک کی سالمیت کے خلاف کوئی مشکوک کام ہو رہا تھا اور ملک کا وزیر اعظم اس پر کوئی کارروائی نہیں کر رہا تھا تو اسے فوراً استعفیٰ دینا چاہیے تھا تا کہ سارے پارلیمنٹ میں اس بات پر بحث چھڑ جاتی کہ ریاست جموں و کشمیر کے گورنر نے استعفیٰ کیوں دیا؟ اس طرح مرکزی حکومت جلد از جلد اس مسئلے پر کارروائی کرنے کے لیے مجبور ہو جاتی اور شاید گربہ کشتن روز اول کے مصداق ملی ٹینسی کو ختم کرنے میں کامیاب ہوتی۔ جگ موہن کوئی بیوروکریٹ تو تھے نہیں کہ ان کو اپنے پنشن اور ترقی کی فکر لاحق تھی۔ (ص ۳۰)

☆ دوسرا جھوٹ جس نے مجھے جھنجلا دیا وہ تھا میری بیوی کی تعلیم کے سلسلے میں۔ مجھے کہا گیا تھا کہ وہ ایم اے، ایل ایل بی ہے جبکہ حقیقت میں وہ محض بی اے پاس تھی۔ ایل ایل بی میں ایڈمشن تو لے لیا تھا مگر بعد میں اسے ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد ایم اے میں ایڈمشن لیا تھا مگر ابھی کوئی امتحان پاس نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ میرے پتا جی مجھے سچ بولنے اور جھوٹ سے نفرت کرنے کی ہمیشہ تلقین کرتے رہے۔ اس لیے اتنے بڑے جھوٹ کو میں سہار نہ پایا اور رفتہ رفتہ یہ سب صدمے میرے اندر لاوے کی طرح جمع ہوتے رہے۔ میں سوچنے لگا کہ جب لوگ اس بارے میں سنیں گے کہ میری بیوی صرف گریجویٹ ہے، تو میری تھڑی تھڑی ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے طے کر لیا کہ میں اس کو

پوسٹ گریجویشن کروا کے ہی دم لوں گا۔ (ص ۱۷۱)

☆ میری ایک اور عادت میرے والد کو ہمیشہ پریشان کرتی تھی۔ میں جہاں بھی بیٹھ جاتا تھا کسی نہ کسی توڑ پھوڑ میں لگ جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ماچس کی ڈبیا ہاتھ لگ جاتی تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا اور ایک ایک کر کے ان ٹکڑوں کو بکھیر دیتا۔ نفسیاتی طور پر اسے تجزیاتی فطرت کہیے یا پھر تخریبی فطرت۔ میرے پتاجی کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آتا تھا اور انھوں نے مجھے کئی بار تنبیہ بھی کی۔ شاید اسی فطرت کے سبب میں نے مستقبل میں اپنی زندگی کو بھی پراگندہ کر لیا۔ زندگی میں بہت کچھ بنا لیا اور اس سے زیادہ تباہ کر لیا۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو خود پر ہنسی بھی آتی ہے اور ترس بھی۔

(ص ۵۳-۵۲)

☆ میرے والد صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ بچوں کی تعلیم کے لیے مجھے بھیک مانگنا، قرض اٹھانا یا پھر چوری کرنا پڑے (Beg, Borrow or Steal)، میں کروں گا۔ انھیں تو ایسا کرنے کی نوبت نہیں آئی مگر تریپورا کے ایک دور دراز علاقے میں ایک ایسی مثال میرے سامنے آئی جس نے اپنے بیٹے کے ایڈمشن کے لیے سرکاری روپیہ عارضی طور پر غبن کیا۔ (ص ۲۷۳)

☆ چونکہ میرا بیٹا اپنی فیملی کے ساتھ دہلی ہی میں رہتا تھا اور نوئیڈا میں نوکری کر رہا تھا اس لیے ممبر ہونے کے باوجود میں اسی کے ساتھ شالیمار گارڈن میں دو کمرے کے خستہ حال فلیٹ میں رہنے لگا۔ یہ مکان اس کی ماں نے ان دنوں خریدا تھا جب میں کشمیر میں تعینات تھا اور وہ مجھ سے الگ رہتی تھی۔ پھر باہمی مفاہمت کے باعث ہم دونوں ایک ساتھ رہنے لگے تھے کیونکہ طلاق کے باوجود ڈودرا میں میرے بڑے بیٹے نے ہمیں پھر سے ملانے کی کوشش کی تھی تاہم رشتوں میں اب وہ گرمی نہیں رہی تھی۔

بہر حال میرا ریٹائرمنٹ فروری ۲۰۱۰ء میں ہوا۔ جاتے جاتے ایک خوش خبری مل گئی۔ انڈیا انٹرنیشنل فرینڈ شپ سوسائٹی نے مجھے راشٹریہ گورو ایوارڈ فار میریٹوریس سروس، اوٹ سٹینڈنگ پرفارمنس اینڈ ریمارکیبل ورک کا حق دار قرار دیا

اور یہ ایوارڈ مجھے ۵/مارچ ۲۰۱۰ء کو ڈاکٹر بھیشم نارائن سنگھ، سابقہ گورنر تامل ناڈو اور آسام کے مبارک ہاتھوں سے ملا۔ بقول کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ:

ہم خطاوار ہی ہیں یہ تو بجا ہے لیکن
کام دنیا میں کچھ اچھے بھی کیے ہیں یارب (ص ۳۱۹)

مندرجہ بالا اقتباسات سے قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دیپک بُدکی کی زندگی کیسے کیسے اتار چڑھاو سے گزری ہے جسے انھوں نے من وعن قارئین کے لیے تحریری جامہ پہنا کر خوبصورت اور دلاویز بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہی نہیں ذکر خوباں بھی کیا ہے اور عشق کی لذتیں بھی کتاب کے اوراق میں بکھیری ہیں۔ مضمون کی وسعت کو خیال میں رکھتے ہوئے میں یہاں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ 'لوحِ حیات' مطالعے سے تعلق رکھتی ہے اور لائبریریوں کی زینت بننے کے قابل ہے۔ میں ایک بار پھر بُدکی صاحب کو لوح حیات کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرنا چاہتا ہوں اور اپنا ایک شعر نذر کرتا ہوں:

مسکراتے گلوں سے بہتر ہے
جگمگاتے شعور کی آواز

☆☆☆

﴾ لوحِ حیات۔ دیپک بدکی کی خودنوشت سوانح عمری؛ مصنف: قاسم رسا؛ مطبوعہ ہفت روزہ 'ہماری زبان دہلی، جلد ۷۸، شمارہ ۳۰؛ ۸تا۱۴/اگست ۲۰۱۹ء

سفر ابھی جاری ہے

-نور شاہ

اردو کے افسانوی ادب میں دیپک بُد کی محتاج تعارف نہیں۔ان کی تخلیقی دنیا بہت وسیع ہے۔مطالعہ کے ساتھ ساتھ حرکت اور فعالیت میں یقین رکھتے ہیں۔وہ نہ صرف اپنے افسانوں کی وساطت سے ملکی سطح پر اپنی ایک الگ پہچان بنا چکے ہیں بلکہ اپنے مخصوص طرز نگارش کے ساتھ ان کے تحریر کردہ تبصرے، تجزیے، تحقیقی اور تنقیدی مضامین ان کی ادبی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔وہ اپنے دور کے عکاس ہیں، ایک جانب مٹھاس سے بھرپور اور دوسری جانب کڑواہٹ سے بھرپور حقیقتوں کو نئے تقاضوں کے ساتھ روبرو کرواتے ہیں۔ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تحریروں سے دوسروں کی تحریروں کو باوقار بناتے ہیں۔اگر ہم اس تعلق سے صرف ریاست جموں وکشمیر کی بات کریں تو انکار نہیں کرسکتے کہ ریاست کے بہت سارے اردو زبان کے قلم کاروں کی تخلیقات پر تبصرے اور تجزیے کرنے کا جو سلسلہ انھوں نے کافی عرصہ سے شروع کر رکھا ہے وہ قابلِ تعریف ہے اور قابلِ ستائش بھی۔یہ کارِ نیک وہ اگرچہ ملکی سطح پر کرتے آ رہے ہیں لیکن ریاست جموں وکشمیر کے تعلق سے کہنا چاہوں گا کہ ریاست سے تعلق رکھنے والے قلم کاروں کی تخلیقات پر بُد کی صاحب کی تحریروں کی فہرست بہت طویل ہے اور طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔

اپنی سوانح حیات کو ضبطِ تحریر میں لانا ظاہری طور پر آسان نظر آتا ہے لیکن یہ کام ہرگز ہرگز آسان نہیں ہے۔لفظ لفظ کے لیے اپنا خونِ جگر جلانا پڑتا ہے تب ہی سچ اور سچائی کے ساتھ الفاظ کی ترتیب ممکن ہوسکتی ہے۔واقعات کے بہاؤ میں اپنے آپ کو تلاش کرنے کے لیے ہمت چاہیے، جرأت چاہیے اور خود اعتمادی بھی۔جب ہمت، جرأت اور خود اعتمادی ایک مثلث کا روپ لیتے

ہیں، ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں، تو سچائی سامنے آ کر نکھرتی ہے، سجتی اور سنورتی ہے۔ زندگی کی تلخ اور کڑواہٹ سے بھرپور حقیقتیں نئے ان دیکھے اور ان جانے تقاضوں کے ساتھ کتاب کے اوراق میں محفوظ ہو جاتی ہیں اور اکثر ان حقیقتوں سے مٹھاس کا احساس بھی ابھرتا ہے۔

دیپک بُدکی کی خودنوشت سوانح حیات 'لوحِ حیات' کے عنوان سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ تین سو پچاس صفحات پر مشتمل یہ کتاب بے حد خوبصورت انداز سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کی تزئین و ترتیب اور کمپوزنگ کا سہرا دیپک جی کو ہی جاتا ہے۔ لڑکپن سے لے کر زندگی کے موجود مرحلے تک انھوں نے جس انداز اور اسلوب، سادگی اور شگفتگی کے ساتھ اپنی کھٹی میٹھی یادوں کو خلوص اور ایمانداری سے سمیٹا ہے میں اس نقطہ نظر سے بھی ان کی قدر کرتا ہوں۔ میں نے ایک دن کتاب میں شامل ایک سچائی کے تعلق سے ان سے کہا تھا:

''اگر آپ اس کا ذکر نہ کرتے تو شاید بہتر رہتا۔''

ان کا مختصر سا جواب تھا۔ ''سچ نہ بولتا یا سچ نہ لکھتا تو شاید زمین سکڑ جاتی اور آسمان سمٹ جاتا۔ خاموش رہنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔''

دیپک بُدکی کی آپ بیتی میں گھر کے آنگن سے رشتوں کی کہانی سے لے کر ان کی زندگی کے بہت سارے ادبی، غیر ادبی، سرکاری اور غیر سرکاری کہانیوں میں سچائی ملتی ہے اور اس کے لیے میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

شہرت اور شرافت کا یہ سفر ابھی جاری ہے!

☆☆☆

✍'سفر ابھی جاری ہے'، مصنف نور شاہ؛ ۱۴۰ ال دید کالونی، غوری پورہ لنک روڈ، راول پورہ، سرینگر، کشمیر-۱۹۰۰۰۵

ریزہ ریزہ وجود-لوحِ حیات کے آئینے میں

-ڈاکٹر پریمی رومانی

دیپک بدکی ایک افسانہ نگار کے طور پر سامنے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ادبی دنیا میں بڑی قلیل مدت میں اپنی محنت اور ریاضت سے الگ پہچان منوائی۔ وہ تنقید و تحقیق کے شعبے میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے اور اپنے منفرد انداز سے اس شعبے میں بھی رنگ آمیزی کرتے رہے۔'لوح حیات' ان کی خودنوشت سوانح عمری ہے جو چوبیس مختصر اور طویل ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں انہوں نے اپنی تلخ ترش اور شیریں یادوں کو تاریخی تناظر میں پیش کیا ہے۔ دیپک بُدکی ایک متوسط طبقہ کے فرد ہیں۔ انہوں نے کئی پاپڑ بیلے ہیں۔ وہ ہر ایک غم کو اپنے سینے سے لگا کر ایک بہادر سپاہی کی طرح آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے اچھے دن بھی دیکھے اور مصائب کے پہاڑوں کا بھی مقابلہ کیا۔ لوح حیات انہی چیزوں کا عکس پیش کرتی ہے جو لائق مطالعہ ہے۔ کتاب کے سرنامے میں وہ ان چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"آدمی کا اثاثہ جل کر راکھ ہو جائے تو وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ بس کریدنی لے کر راکھ کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور بغیر کسی مقصد کے راکھ کو کریدتا رہتا ہے۔ انسانی زندگی کی یہ ایک بنیادی سچائی ہے کہ آخرش ہم اس راکھ کو کریدنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ حال میرا بھی ہے۔ زندگی جوں توں بسر ہو گئی۔ بڑے بڑے خواب سجا رکھے تھے لیکن اب آنکھ کھول کر جو دیکھتا ہوں راکھ کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ میرے پاس کریدنی تو ہے نہیں البتہ قلم سے اس راکھ کو کریدنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" (ص ۱۱)

لوح حیات فقط ایک کتاب نہیں بلکہ اس کتاب میں بہت ساری کتابیں سمائی ہوئی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دیپک نے متعدد مضامین کو اپنے اندر سمایا ہے۔ وہ بنیادی طور پر سائنس کے طالب علم رہے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے دوران انہیں مختلف مضامین کا گہرا مطالعہ کرنا پڑا۔ اسی لئے اس کتاب میں جہاں تواریخی موشگافیاں ملتی ہیں وہاں کشمیر کی سیاست، کلچر، تہذیب اور تمدن کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے قومی جذبے کی بھی بات کی ہے اور مختلف لوگوں کی طرز زندگی کو بھی دل نشین انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہیں کہیں مذہبی اصطلاحات سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے موقف کو واضح طور پر ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ انہوں نے صاف اور سلیس زبان میں لوح حیات میں اپنا درد کاغذ پر انڈیلا ہے۔ وہ جہاں جہاں بھی رہے اور جن منزلوں سے بھی گزرے، ان تجربات کو بروئے کار لانے میں انہوں نے دردمندانہ جذبہ روا رکھا اور اپنی بات لوگوں تک بڑی سلیس اور آسان زبان میں پہنچائی۔

دیپک ایک حقیقی فنکار ہیں۔ انہوں نے اپنے جذبات و تجربات کسی لگی لپٹی کے بغیر قلم بند کئے ہیں اور اپنی زندگی میں ہونے والے واقعات مخلصانہ انداز میں بیان کئے ہیں۔ یہی ایک سچے فنکار کی پہچان ہے۔ لوح حیات کو انہوں نے چوبیس عنوانات میں تقسیم کیا ہے اور اپنی ریزہ ریزہ زندگی، کتاب کے اوراق میں اس طرح بکھیر دی ہے کہ انسان سوچنے پر مجبور ہوتا ہے اور انسان کا دنیا پر سے اعتبار اٹھتا ہے۔ اس کتاب کا سرآغاز 'جستجو کیا ہے' کے باب سے ہوتا ہے۔ اس میں وہ اپنے خاندانی حالات کا عمومی جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پرکھوں کو بھی یاد کرتے ہیں، جو لائق ستائش ہے۔ وہ اپنی والدہ محترمہ کو بھی یاد کرتے ہیں جن کے لاڈ پیار سے وہ بچپن سے ہی محروم ہو گئے تھے اور اس خلا کو زندگی بھر محسوس کرتے رہے۔ دوسرے باب میں انہوں نے کشمیری پنڈتوں کے بنیادی ماخذ کو مدنظر رکھتے ہوئے کشمیر کے حالات کو تواریخی پس منظر میں بیان کیا ہے۔ اور یہ خطۂ ارضی مختلف ادوار میں جن صعوبتوں کا شکار ہو گیا ہے، اس کتاب میں ان چیزوں کی ہلکی پھلکی تصویر بھی سامنے آتی ہے۔ ۱۹۹۰ء کے حالات کو پیش کرنے میں بھی انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور کشمیری پنڈتوں کی بے وطنی، ان کی زبوں حالی اور کسمپرسی کی داستان بھی سچے

دل سے پیش کی ہے۔اس طرح سے حقیقی قلم کار کا منصب نبھایا ہے۔اس سلسلے میں چند اقتباسات یہاں درج کرنا لازمی بن جاتا ہے۔ کشمیری پنڈتوں کے موروثی نام کے بارے میں تواریخی تناظر میں جانچتے اور پرکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کشمیری پنڈتوں میں ہر خاندان کا ایک مخصوص موروثی نام ہوتا ہے۔ جو اس کی پہچان بن جاتا ہے۔عام طور پر یہ نام گوتر سے تعلق رکھتا ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بہت ساری تبدیلیاں آئیں ۔ خاندانوں کو ان کے پیشے یا نک نیم سے پہچانا جانے لگا۔مثلاً بائیں ہاتھ سے کام کرنے والا 'خوشو' کہلایا، بڈگام میں رہنے والا بڈگامی کہلایا، جیوتش جاننے والا جیوتشی کہلایا، پٹواری کا کام کرنے والا پٹواری کہلایا اور سونے کا کام کرنے والا صراف کہلایا'' (ص ۱۸-۱۷)

'بُدکی' کی وجہ تسمیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:-

''اس سرنیم کے بارے میں روایت ہے کہ ہمارے کسی جدامجد نے اپنے مکان کی ازسرِنو تعمیر کرنے کی ٹھان لی تھی۔نئی عمارت کی بنیاد رکھنے کے لئے زمین کھودی گئی۔ اس کارروائی کے دوران کسی نے ایک ہانڈی دیکھ لی جس میں بہت ساری بُدکیاں رکھی گئی تھی۔اس زمانے میں بینک تو ہوتے نہیں تھے۔اسلئے چوروں سے بچنے کے لئے سونے کے سکے (اشرفیاں) کسی برتن میں رکھ کر زمین میں مخصوص جگہ پر گاڑ دئے جاتے تھے۔جس کا علم صرف گاڑنے والے کو ہوتا تھا۔لوگوں کو جب اس بات کا پتہ چلا کہ ہمارے مکان میں بدکیوں کا خزانہ ملا ہے تو وہ ہمارے اسلاف کو بدکی والے کہنے لگے جو دھیرے دھیرے 'بُدکی' ہو کر رہ گیا۔'' (ص ۱۹-۱۸)

کشمیری پنڈتوں کے عادات، اطوار و خصائل پر تفصیل سے لکھتے ہیں:-

''علم حاصل کرنا (گیان مارگ) اکثر و بیشتر کشمیری پنڈتوں کا نصب العین رہا ہے گو کچھ افراد لل دید اور ریہ مانند کی طرح بھگتی مارگ پر گامزن ہوئے۔گیان مارگ کے حوالے سے کئی نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے کشمیری شیوازم کے ارتقا میں اپنا یوگدان دیا جیسے ابھینو گپت (۱۰۱۶-۹۵۰ء،تنتر لوک)، واسو گپت (۸۵۰-۸۰۰ء،

؛ شیو سوتر)، آنند وردھن، اُتپل دیو، بلہن وغیرہ ۔ اسی طرح ویشنومت کے
کھمیندر (۱۰۱۷-۹۹۰ء) نے برہت کتھا منجری، دش اوتار چرت وغیرہ کئی
تصانیف رقم کیں، جبکہ کہانیوں کا ساگر' کتھاسرت ساگر'، شیومت کے کہانی کار
سوم دیو نے گیارہویں صدی عیسوی میں قلم بند کیا۔'' (ص ۳۷)

بچپن جو کہیں کھو گیا، میرے محسن میرے رہنما، عہد جوانی رو رو کاٹا، سیاہی کی ایک بوند، جہد زیست، ان تمام ذیلی عنوانات کے تحت وہ اپنی سرگذشت کو قدم بہ قدم آگے بڑھاتے ہوئے اپنی بکھری بکھری زندگی کی یادوں کو کاغذ پر انڈیلنے سے گریز نہیں کرتے ۔ اس طرح سے انہوں نے اپنی زندگی میں ہونے والے واقعات اپنی اذیتوں، مایوسیوں اور تکالیف کو بیان کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی ہے۔ 'بچپن جو کہیں کھو گیا' میں وہ اپنے آبائی مکان واقع وازہ پورہ اور اس کے ملحقہ علاقوں کو یاد کرتے ہیں ۔ اپنے محلّہ وازہ پورہ کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہیں ۔ سبزی، بادام، زعفران اور اخروٹ کے باغوں اور مقامی غذائی اجناس کو یاد کرتے ہیں، وہاں کے موسموں، پھولوں، پھلوں اور دھان کے کھیتوں کے بارے میں سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ 'میرے محسن میرے رہنما' کے باب میں اپنے والد کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذہ اور خاص طور پر پنڈت شیام لال صراف کا ذکر کرتے ہیں جن کی تعلیمات سے وہ پھلے پھولے اور پروان چڑھے ۔ عہد جوانی رو رو کاٹا، سیاہی کی ایک بوند، جہد زیست، شادی خانہ بربادی میں وہ اپنی نجی پریشانیوں، اذیتوں، تکالیف اور اپنی جہد مسلسل کا ذکر کرتے ہیں۔ یقیناً ان چیزوں کا مقابلہ کرنا ایک مضبوط دل گردے والے آدمی کا ہی کام ہے۔ نیا پیشہ نئی چنوتیاں، فوج کے ساتھ چند سال، زندگی کا ایک تاریک باب سے لے کر تدریسی تجربہ۔ ایک دیرینہ خواب، بھی چند ایسے موضوعات ہیں جن میں انہوں نے اپنی زندگی سے حاصل کئے گئے تجربات بیان کئے ہیں۔ ان موضوعات نے ان کی زندگی میں ایک نہ پر ہونے والا خلا پیدا کیا۔ جس آدمی کو ان دردناک راستوں سے گزرنا پڑے گا اس کی زندگی کیا ہو سکتی ہے؟ یہ ہر ایک ذی حس انسان کے لئے ایک سوالیہ نشان ہے۔ لوح حیات میں 'نیشنل ڈیفنس کالج

کی چند یادیں' ہو یا 'ڈاک جیون بیمہ۔ایک یادگار دور'، 'ذکر خوباں کا' ہو یا تدریسی تجربہ-ایک دیرینہ خواب، 'نارتھ ایسٹ خستہ حال وزبوں زار' ہو یا 'طواف لالہ زار'-ان تمام موضوعات کو بیان کرنے میں انہوں نے کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا بلکہ جذبات کی رو میں آ کر تمام واقعات کو سچے دل سے ضبط تحریر میں لایا ہے۔مزید ادب ایک نئی شروعات، جب گجرات دہک اٹھا، پرتگالیوں کی آخری گڑھی ، مراجعت ارض چمن سے، اوج سفر حیات، اور سفر ابھی جاری ہے کے عنوانات کے تحت ۳۲۴ رصفحات پر پھیلی ہوئی یہ خودنوشت سوانح حیات قابل مطالعہ ہے۔اس کتاب کو پڑھتے ہوئے آپ کہیں کہیں افسانوی چاشنی بھی پائیں گے اور ایسا محسوس ہوگا کہ آپ کسی ناول کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

لوح حیات میں اور بھی کئی موضوعات پائے جاتے ہیں جن میں وہ اپنی سرگذشت پیش کرتے ہیں۔ان میں 'ادب۔ایک نئی شروعات' کا ذکر کرنا مناسب ہے۔اس باب میں بھی وہ صاف اور دوٹوک بات کرنے میں پیچھے نہیں رہے ہیں۔جب ان کا اولین افسانوی مجموعہ ''ادھورے چہرے'' شائع ہوا تو اس پر خاکسار نے سب سے پہلے تفصیلی مضمون لکھا۔اس کے بعد بہت سارے لوگوں کے تبصرے رسائل میں چھپ گئے۔لوح حیات میں ان تمام تبصروں کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کے اس باب میں راقم السطور کا تبصرہ جگہ نہ پا سکا، جس نے بڑے خلوص دل سے ان کے اولین افسانوی مجموعے ادھورے چہرے پر تفصیلی مضمون لکھا تھا، جو انہی دنوں صلاح الدین نیر کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ 'خوشبو کا سفر' میں بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔جس کا ذکر وہ اپنے ایک خط میں یوں کرتے ہیں:-

> ''خوشبو کے سفر میں آپ کا مقالہ پڑھا۔ایک بار نہیں پانچ بار، صلاح الدین نیر نے پہلے ہی سے اطلاع دی تھی اور پھر رسالہ بھی ملا۔حیرت کی بات ہے کہ پہلا ہی مضمون آپ کا تھا جس نے دل کو بہت ہی انبساط بخشی۔مقالہ کیا تھا کہ پڑھتے پڑھتے مزا آ گیا۔اسے بڑھ کر اور موزوں تبصرہ نہیں ہو سکتا، حقیقت یہ ہے کہ تم سے

بڑھ کر ایسا کوئی شخص نہیں جو مجھے اتنے قریب سے جانتا ہو۔ بھائی آپ نے تو ہر
رنگ میں اپنے مضمون کو مرصع و مرقع کر دیا۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ (تم) جذبات
میں آ کر قصیدہ نہیں لکھ بیٹھے بلکہ ہر سطر میں تمہیں نقد و نظر کے اصولوں کا پاس رہا۔"
(راقم السطور کے نام، برودہ گجرات سے لکھے گئے دیپک بدکی کے ایک خط بتاریخ
۲/اپریل ۲۰۰۱ء کا اقتباس)

مختصر یہ کہ لوح حیات کا مطالعہ کرنے سے نہ صرف دیپک بدکی کی ورق ورق زندگی
سامنے آ جاتی ہے بلکہ اس میں کشمیر کی سیاست، ادب، کلچر، تہذیب اور تمدن کے بارے میں بھی
جانکاری ملتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس کتاب کا مطالعہ نہایت سنجیدگی سے کریں گے۔ میں تو
یہی کہوں گا کہ زور قلم اور زیادہ۔

☆☆☆

﴾'ریزہ ریزہ وجود-لوح حیات کے آئینے میں'؛ مضمون نگار: ڈاکٹر پریمی رومانی؛ مدیر، سہ ماہی عالمی میراث؛ ۱۸۰۶-ڈی،
نانڈیڈ سٹی سنھگڈ روڈ، پونے-۴۱۱۰۶۸ (مہاراشٹر)

زمین سے جڑی کہانیاں

اور

'دیپک بدکی' کا نثری آہنگ

('روح کا کرب' اور 'مُٹھی بھر ریت' کے حوالے سے)

-نعیم بیگ (لاہور، پاکستان)

کچھ عرصہ پہلے ہندوستان سے اردو ادب کے چنیدہ عصری شعرا اور ادیبوں سے گاہے بگاہے کسی نہ کسی کتاب، ادبی ریویو یا رسالے کے توسط سے آشنائی کا ایک رشتہ استوار ہو جاتا تھا، لیکن جب سے سوشل میڈیا کی دنیا میں ادبی فورمز کا قیام عمل میں آیا تو فیس بک نے سرحد کے آر پار دوستیوں، محبتوں اور ادبی تبادلہ خیالات کو ایک نیا جہاں عطا کر دیا۔ ملکی اندرونی سطح پر جہاں تعلقات کی نئی ادبی دنیا بسنے لگی، وہیں ہندوستان کے کئی ایک ممتاز ادیبوں سے براہِ راست رابطے کا اہتمام ہوا۔

ایسے میں انٹرنیٹ کی دنیا نے چند ادبی جریدوں کو بھی متعارف کروایا جہاں اردو ادب کی انہی ادیبوں اور شعرا کے فن پارے، انکی ذاتی زندگی اور انداز فکر و سفر سے آشنائی ہوئی۔ سوشل میڈیا پر ہندوستان کے اِن ممتاز ادیبوں میں دہلی سے مشرف عالم ذوقی اور پیغام آفاقی مرحوم اور پرویز شہریار، مہاراشٹرا سے ڈاکٹر صدیقہ نواب سحر، رحمان عباس، بہار سے مشتاق احمد نوری، اقبال حسن آزاد، ، پٹنہ ہی سے شموئیل احمد، پونے سے نذیر فتح پوری، یوپی سے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر

افشاں ملک، ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی، دیپک بدکی، ڈاکٹر منصور خوشتر، عادل فراز، جارکھنڈ سے ابرار مجیب، ڈاکٹر اختر آزاد، راجستھان سے عادل رضا منصوری اور کشمیر سے فرحت عمر اور ڈاکٹر ریاض توحیدی اور ایک بار خود پھر دیپک بدکی (کشمیر کے حوالے سے) اور دیگر ادبا شامل ہیں۔ یہاں کسی طور ان ادیبوں کی فہرست مقصود نہیں، کیونکہ بہت سے نام رابطے میں نہ رہنے کی وجہ سے یادداشت سے محو ہیں، تاہم منشاء وِعرضِ مدعا یہ کہ دنیائے اردو ادب ہندوستان کے ان ادیبوں میں مدیر، نقاد اور دانشور حوالوں سے بہت سے ممتاز نام یہاں پاکستان کی ادبی دنیا میں معروف اور اہمیت کے حامل ہیں۔ انہی میں ایک نام دیپک بدکی کا بھی ہے۔

یہ اتفاق تھا کہ ان کی تحاریر، افسانے، افسانچے اور نثری تنقیدی مضامین سے کچھ منتخب حصے میں انٹرنیٹ جریدوں پر پڑھ چکا تھا اور یہ یقین واثق ہو چکا تھا کہ دیپک بدکی ہندوستان کے ممتاز ادیب و نقاد ہیں۔ تاہم جب حال ہی میں ان کا افسانوی مجموعہ 'روح کا کرب' اور افسانچوی مجموعہ 'مٹھی بھر ریت' میرے ہاتھ لگا تو میری دلی مسرت نا قابل بیاں تھی اور میرے اندر چھپے مطالعاتی تجسس و جبلت نے مجھے مجبور کیا کہ انہیں فوراً پڑھا جائے۔

یکے بعد دیگرے ان مجموعوں کو پڑھنے سے جو پہلا خیال میرے دل و دماغ میں آیا کہ جیسے انسان کے اندر فطری مناظر، بہتے جھرنوں کی موسیقی، برگد اور چنار کے درختوں کے سائے، پہاڑ، دریا اور سمندر اپنی ایک خاص مہک رکھتے ہیں ویسے ہی ادیب کا ذہن کس قدر زمینی حقائق سے جڑت رکھتا ہے اور وہ انسانی المیوں میں فکر و ادراک کا سفر جاری رکھتا ہے۔ فکری و ثقافتی رویوں کو تہذیبی آشنائی کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور زرعی تہذیب سے کشید کئے ہوئے نئے شہری فکری افق کس قدر تیزی سے اپنے قلم میں سمو لیتا ہے۔ یہ اس لئے کہا کہ یہ سب کچھ آپ کو ان نثری مجموعوں میں بکثرت ملے گا۔

دیپک بدکی نے واضح طور پر نہ صرف منقسم معاشرے کی حدود کا تعین کیا ہے بلکہ وہ ان حدود میں نقل مکانی کے دکھ و درد کو ہمراہ رکھتے ہوئے اپنے افسانوں میں اسکا اظہار بڑی صراحت

سے کرتے ہیں۔ وہ فہم اورادراک کی کج روی کا شکار نہیں ہوتے بلکہ سیاسی، معاشی، معاشرتی شعور کا پوری طرح جائزہ لیتے ہیں اور جگمگاتی زندگی کی حقیقت کے پیچھے سچائی کا وہ کونسا مخفی پہلو ہے، اِسے جرأت کے ساتھ آشکار کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے افسانوں میں کسی ٹوٹم اور ٹیبوز کا لحاظ نہیں کرتے اور زندگی کے طرز وفکر واحساس کو، جو آج کی انسان میں رچ بس گیا ہے، کو علامتوں میں واضح کر دیتے ہیں۔

ان کے افسانوی مجموعہ 'روح کا کرب' کے پہلے افسانے 'ٹکڑوں میں بٹی زندگی' میں اِن کا ایک کردار میکھلا کہتی ہے۔

"پچھڑی جاتی اور جن جاتی کے لوگ ابھی بھی اس قابل نہیں ہوئے کہ وہ اونچے طبقے کے لوگوں سے براہِ راست مقابلہ کر سکیں۔ ان کا یہ ہینڈی کیپ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ جب تک ہمارے سماج میں مساوات اور یکسانیت نظر نہیں آتی۔ البتہ ان جاتیوں کے جو لوگ آسودہ حال ہو چکے ہیں انہیں یہ رعایت دینا جائز نہیں ہے۔"

"میں آپ سے سہمت ہوں، دراصل ان جاتیوں کا شوشن ہزاروں سالوں سے کیا جا رہا ہے، سماجی بہشکار، مالی بدحالی اور فیصلہ کرنے کی مشینری سے دور رکھنے کی کوشش۔ نسل درنسل اس استحصال کا خمیازہ تو ہمیں اٹھانا ہی پڑے گا۔"

شہری زندگی میں کامیابی کی کنجی کہاں ہوتی ہے؟ اس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔

'کاگ پورنیما' افسانے میں ہجرت کے دکھ و کرب کو نوسٹیلجک انداز میں رقم کیا گیا ہے۔ کیلاش پنڈت بچپن کی یادوں کو سمیٹتا ہوا اپنی جڑوں کی کھوج میں بہت دور نکل جاتا ہے اور اپنے پوتے سنّی کو ساتھ لئے ماضی کے جھروکوں سے جھانکتا ہے۔ علامتی انداز میں پرندوں کی ہجرت اسکے اندر انسانی ہجرت سے کہیں کم دکھ لئے نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ہے۔

"بیٹے ہمیں بھی پچیس برس پہلے انسانی انتہا پسندی کے باعث وادی سے باہر ہجرت کرنا پڑی، چونکہ ہماری آبادی آٹے میں نمک کے برابر تھی اس لیے ہم نے وادی کو خیر باد کہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ وہاں رہے ہوتے تو شاید اب تک نیست ونابود ہو

چکے ہوتے۔۔۔‘‘

دیپک بدکی کا ادبی رجحان، ان کا تیکھا پن لیکن پر سکون قلم فطری مناظر سے بڑھ کر ان کائناتی سر بستہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی سعی کرتا ہے۔ اسی مجموعہ میں ’ بستے کا بوجھ‘ جیسے خوبصورت افسانہ میں جو بظاہر سادہ بیانیہ کا حامل ہے اور باطن میں اپنی علامتوں کو ساتھ اٹھائے قاری کو شہری زندگی کی نئی سوچ وفکر سے آگہی دیتا ہے۔نو آبادیاتی طرزِ فکر میں قومی کردار کی تشکیل میں انگریزی کے رجحان کو ہندوستانی تہذیب وتمدن سے دوری کا شاخسانہ سمجھتے ہوئے وہ غلام ذہنیت کو معاشرے کے لئے سم قاتل سمجھتا ہے۔اوران ٹوٹتی ہوئی انسانی تہذیب کے شاندار ماضی سے جڑا رہنا اس کی فطرت ہے۔

’’ ایسے موقعوں پر میں اس کے دل کی زبان سمجھ لیتا اور میری خاموشیاں بول اٹھتیں۔ نائیلہ،تم ساری عمر انسانوں سے بھرے جز دان کا بوجھ اٹھاتی پھری۔ مجھے اور شائستہ کو کسی بات کی کمی نہ محسوس ہونے دی۔اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تمہارا بوجھ کون اٹھائے گا۔‘‘

انسانی نفسیات پر ایک اور افسانے ’ ڈاگ ہاؤس‘ میں وہ اپنے مشاہدے کی کرنیں بکھیرتے ہوئے تہذیبی زندگی کے حصار کو مزید محدود کرتے ہوئے دیو قامت نو تشکیل شدہ شہری تمدن کو ایک بار پھر اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں۔وہ روایات سے روگردانی نہیں کرتے بلکہ کائنات کے مخفی گوشوں کا بھید پا لینے والے انسان کی فکری، جذباتی، احساساتی اور سیاسی بصیرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

گو بظاہر وہ کسی سماجی وسیاسی شعور کے کسی فارمولے میں مقید نہیں لیکن حیات انسانی کے بدلتی ہوئی تصویر میں وہ الوہی امکانات کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہیں۔ان کے ہاں نثری تنوع کے ساتھ ساتھ اظہار کا نیا پن اور علامتوں کی نئی تشریحات کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ ملتا ہے۔ان کا افسانہ ’طلسمی عینک‘ اور ’روح کا کرب‘ ان کے خوبصورت افسانوں میں شمار ہوں گے۔ جہاں فطری

رجحانات اپنے عروج پر ہیں۔

ضمیر کی خلش اور کرپشن کے خلاف آواز اٹھانے میں عصری محاذوں پر وہ اپنے قلم کی جنگ میں نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہیں، 'میں انا ہوں' میں وہ اپنی اسی کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

سماجی المیوں کو بیان کرتے ہوئے وہ 'گونگا کیئر ٹیکر' جیسا افسانہ تخلیق کرتے ہیں۔ اور مذاہب سے دور کہیں ایک نئی دنیا بساتے ہوئے 'زمین پھوٹ کر جو بھگوان نکلا' ایک ایسا فن پارہ جنم دیتے ہیں جہاں انسانی توہمات اور وشواس کی دنیا میں کائناتی رنگ نظر آتا ہے، لیکن وہ اپنے افسانوں میں تجرید کے رنگ کے ساتھ ساتھ اپنی امیجری، تلازمہ خیال اور اجتماعی لاشعوریت کو بھی ساتھ رکھتے ہیں۔ داخلی کرب کی عکاسی ان کے ہاں بکثرت ملتی ہے۔

دیپک بدکی کے فنی سفر میں کئی ایک نشیب و فراز نظر آتے ہیں۔ قلمی نقطہ نظر سے ہم اسے تنوع بھی کہہ سکتے ہیں۔ کسی بھی فن کار کے کام کو جانچنے کے لئے اس کا اپنا سماجی اور ادبی پس منظر از حد ضروری ہے۔ اپنے دیئے گئے ایک انٹرویو میں (شائع شدہ 'انتساب' جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء) خود کہتے ہیں۔

> ''میں کشمیری پنڈت ہوں۔ کشمیر میں پیدا ہوا، تعلیم ایم۔ایس۔ای، بی۔ایڈ تک حاصل کی۔ پھر انڈین پوسٹل سروس میں ملازمت کی، جہاں سے ۲۰۱۰ء میں سبکدوش ہو چکا ہوں، اسی درمیان نو سال فوج میں ڈیپوٹیشن پر رہا اور بحیثیت لیفٹیننٹ کرنل واپس اپنے محکمہ میں آیا۔ ہندوستان کی کئی ایک ریاستوں میں کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو میرے افسانوں میں تنوع ملے گا۔''

جب ہم دیپک بدکی کے 'مٹھی بھر ریت' جیسے افسانچوی مجموعے کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اس میں ایک نیا جہان ملتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں ان کا فکری و سماجی شعور نثری پیرہن میں آج کی شہری زندگی کو واضح طور پر دیکھتا ہے۔ شہری زندگی کی نعمتوں اور محرومیوں سے نبرد آزمایہ

انسان انہیں ہندوستان میں ہر جگہ ملتا ہے۔ جس کے خواب، اندیشے اور امکانات پہلی دنیا سے قطعی مختلف ہیں۔ ان انسانوں کے یہاں خدا کا وہ تصور نہیں رہا، جو دھرتی پوجا کرنے والے دیہات کے سادہ انسانوں کے پاس تھا۔

اسی کتاب کے دیباچہ میں ان افسانچوں کے بارے میں ان کا اپنا خیال ہے کہ'' میں نے کچھ افسانچوں میں چند افسانوی عناصر کو عمداً نظر انداز کیا ہے۔ کیونکہ میں کسی فارم کا قیدی بننا پسند نہیں کرتا۔ ان نثر پاروں میں افسانچوں کی مبادیات کے بدلے فکر وخیال کو ترجیح دی گئی ہے۔ میری نظر سے کئی ایسے انگریزی نثر پاروں کے مجموعے گزرے ہیں، جن میں فکر پارے 'رینڈم تھاٹس' قلم بند کئے جا چکے تھے۔ میں نے بھی ان کی تتبع میں کئی نثر پارے قلمبند کئے ہیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔''

افسانچوں کے مستقبل پر لکھتے ہوئے یہ کہتے ہیں'' جہاں تک افسانچے کی مقبولیت کا سوال ہے اس حقیقت سے آنکھیں چرانا مشکل ہے کہ ہم میں سے بیشتر افسانہ نگار اس صنف کو بطور فیشن یا تفریح اپناتے رہے ہیں۔ اگر افسانہ نگار اس صنف پر سچے من سے فوکس کریں اور اس کو بحیثیت سنجیدہ صنف کے اپنا لیں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ افسانچہ آنے والے دور میں مقبول ترین صنف کا درجہ حاصل کر سکے۔''

ان کے مجموعے کا پہلا افسانچہ 'سچ کی تلاش' دراصل ایک ایسی حقیقت کے معانی کو کھولتا ہے جہاں سچ کی تلاش میں انسان ابھی تک سرگرداں ہے۔

''تم سمجھتے ہو کہ تمھارے ہاتھ میں جو صحیفہ ہے وہ آخری سچ ہے۔
میں سمجھتا ہوں کہ میرے مصحف سے بڑا سچ کوئی اور نہیں۔
تمھارے سچ اور میرے سچ کے درمیان کتنا تضاد ہے۔''

'صندل'، 'نیکی'، 'جرم' تینوں افسانچے انسانی جبلت میں نیکی اور بدی کے درمیاں ایک ایسی جنگ کو سامنے لاتے ہیں، جہاں شعور اپنی لامتناہی طاقت کے بل بوتے پر اپنا فیصلہ سناتا ہے۔

دیپک بدکی کے ان نثری فن پاروں میں اگرچہ جدید فکر کی روشنی پوری طرح پھیلی ہوئی ہے تاہم یہ کلاسیکیت کی مدہم، خوابناک اور روح پرور چاندنی کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ان کے ہاں یہ رجحان غیر شعوری طور پر سامنے نہیں آتا بلکہ وہ خیال آفرینی کو انسانی جذبات میں پیش کرتے ہوئے گنجینہ معنی کا طلسم بھی بڑی کاوش سے سامنے لاتے ہیں جس میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ فطرت کی عکاسی اور جذبات کی حدت کو کس طرح الگ کیا جائے۔ان کے فکر کا پیمانہ اتنا مختلف ہے کہ ان کے افسانوی معانی کو فکری استغراق پر حاوی ہونا ناممکن لگا۔

میں آخر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کا مخصوص افسانوی انداز اور جمالیاتی اسلوب ان کے افسانچوں میں بھی کہیں کہیں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔جو ان کے جمالیاتی شعور کا گہرا اور پختہ اظہار ہے۔

☆☆☆

مضمون نگار نعیم بیگ، ، پاکستان، مرقومہ بتاریخ ۱۹رجنوری ۲۰۱۷ء ؛مطبوعہ 'ایک روزن'، پاکستان

www.aikrozan.com

مکاں سے لامکاں تک

-دیپک بُدکی کی افسانوی دنیا 'اب میں وہاں نہیں رہتا' کے آئینے میں-

-ڈاکٹر رینو بہل

ادب کے دیگر اصناف کے مقابلے افسانہ ایک ایسی مقبول صنف ہے جس کے ذریعے تخلیق کار اپنے مشاہدے اور تجربات کا سہارا لے کر زندگی کے حقائق، معاشرے کی حقیقی تصویر اور اس کے پوشیدہ زخموں کو اپنے جمالیاتی اظہارِ خیال، احساسات اور جذبات کا آئینہ بنا کر افسانے کی صورت میں قارئین تک پہنچا دیتا ہے۔ افسانہ انسان کی فطری طبیعت کا وہ جزو ہے جو اسے بازیافت کا ذریعہ فراہم کرتا ہے۔ تخیل اور حقیقت کے ملن سے اکثر افسانہ نگار وہ سب کچھ تخلیق کرتا ہے جو اس کے ذہن اور اس کے نہاں خانۂ دل میں چھپا رہتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ معروف افسانہ نگار دیپک بُدکی کی اکثر کہانیوں میں کبھی کشمیر سلگتا و جلتا ہے اور کبھی وہاں کی خوبصورت یادیں انھیں جھنجھوڑتی ہیں۔ یہی اضطراب کہانیوں کی صورت میں قارئین کے دل پر دستک دیتا ہے۔ انسان دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے، عمر کے کتنے ہی پڑاو طے کر لے مگر جائے پیدائش کی کشش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ دیپک بُدکی کا تازہ افسانوی مجموعہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' اسی بات کی غمازی کرتا ہے۔ اب تک ان کے سات افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے ان کے سبھی مجموعے پڑھے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے کی کہانیوں میں بھی اپنے محبوب وطن سے ہجرت کا دکھ اور وہاں کی بدحالی کا ایسا بیان ہے کہ دل پر ضرب کیے بنا کہانی آگے نہیں بڑھتی۔ اس مجموعے میں ۲۰/ کہانیاں شامل ہیں جن میں 'دودھ کا قرض'، 'اب میں وہاں نہیں رہتا'، 'یومِ حساب'، 'جاگتی آنکھوں کے خواب' اور 'فرض شناس' ایسے افسانے ہیں جن کی کہانی کشمیر کی مٹی

سے جڑی ہے۔

دوسری اہم بات جو بُد کی صاحب کے افسانوں میں نظر آتی ہے، وہ ہے پوسٹ آفس سے جڑی یادیں۔ پوسٹ آفس کی نوکری کے دوران ان کے ساتھ جو بھی اچھے بُرے قابل ذکر واقعات پیش آئے، انھوں نے اپنی فن کارانہ صلاحیت سے انھیں افسانوں میں ڈھال دیا۔ 'ہرکارہ'، 'آگ کا دریا'، 'ڈاک بابو' اور 'فرض شناس' ایسے ہی افسانے ہیں۔

مہاجروں کے درد اوران کی تکلیفوں کو دیپک بُد کی جس شدت سے محسوس کرتے ہیں، اسی چابک دستی سے افسانے میں اس کا بیان بھی کرتے ہیں۔ 'دودھ کا قرض' اور 'اب میں وہاں نہیں رہتا' میں اس کرب کا ذکر اس انداز سے بیان کیا ہے کہ قاری کے دل کو چھوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ 'دودھ کا قرض' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

> ''کشمیری پنڈت مہاجروں کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ انھوں نے غیر مساعد حالات میں بھی ہمت نہ ہاری۔ یہ سچ ہے کہ ایک پوری نسل تباہ و برباد ہوگئی جیسے پکی ہوئی فصل پر ٹڈی دل نے حملہ کیا ہو۔ مگر انھوں نے آنے والی نسل کی پرورش کے لیے اپنا خون پسینہ بہایا۔ خود جھلستی گرمی میں پھٹے ٹاٹ کے خیموں میں زندگی بسر کرتے رہے، ذیابیطس اور امراض قلب سے جھوجھتے رہے لیکن اپنے بچوں کو پڑھایا، لکھایا اور اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا'' (ص ۳۸)

دراصل اپنی مٹی سے مجبوراً دور ہونے کی تکلیف انسان کو اتنا توڑ کر رکھ دیتی ہے کہ وہ بکھر کر ٹوٹنے کی کگار پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' سے یہ اقتباس دیکھیے:

> ''میں کہیں بھی نہیں رہتا۔ خانہ بدوش بن چکا ہوں۔ اپنی زمین جب ٹھکراتی ہے اور مسکن جب کھو جاتا ہے تو آدمی خانہ بدوش ہو جاتا ہے۔ وہ پھر کہیں کا نہیں کہلاتا۔''
>
> (ص ۵۶)

دہشت گردی، فسادات، انتشار اور بدامنی نے کشمیر کو جنت کے بجائے جلتا ہوا جہنم بنا ڈالا ہے۔ کشمیر جب جلنے لگا، وہاں کے باشندے ان آگ کے شعلوں سے بچنے کی تدبیریں کرنے

لگ گئے۔ جو وطن چھوڑ گئے وہ بے گھر ہونے کا گھاؤ دل پر لے بیٹھے اور جو رہ گئے وہ ہر روز موت کا تانڈو دیکھتے رہے۔ اس تناظر میں افسانہ 'دودھ کا قرض' انسانیت کے زندہ رہنے کا ثبوت ہے۔ مسلمان رحمتی ایک ننھے ہندو بچے اقبال کی جان بچاتی ہے جس کا گھر فساد میں جل گیا ہے اور جس کے خاندان کے سبھی افراد دہشت گردوں کی گولیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ رحمتی کی مہربانی سے اس کی جان بچ جاتی ہے، وہ اسے دودھ کا گلاس پلا کر سنبھال لیتی ہے اور اس کو حفاظت سے اس کی بہن کے پاس بھیج دیتی ہے۔ برسوں بعد اقبال، جو اب ڈاکٹر بن چکا ہے، اسی رحمتی کی جان بچا کر بنا کوئی فیس لیے دودھ کا قرض اتار دیتا ہے۔ افسانے کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ اقبال مشہور ڈاکٹر ہے، وہ رحمتی اور اس کے شوہر کو پہچان جاتا ہے، اسے فیس نہیں لیتا، اس کی جان تو بچاتا ہے مگر اس سے ملے بنا ہی بیرونِ ملک چلا جاتا ہے جب کہ رحمتی اور اس کے گھر کے لوگ اقبال کو نہیں پہچان پاتے اور سمجھ بھی نہیں پاتے کہ ڈاکٹر نے ان کی مدد کیوں کی۔ اگر دونوں یعنی رحمتی اور اقبال ایک بار دوبارہ اتنے سالوں بعد مل جاتے اور وہ احتراماً شکریہ بھی ادا کر دیتی تو شاید کہانی اور زیادہ رنگین ہو جاتی۔ بہر حال افسانہ نگار اپنی تخلیق کا خود مالک ہے، اسے جس طرح اچھا لگے وہ اسی طرح لکھے، یہ تو اس کا حق ہے۔

فرقہ وارانہ فساد کرانے کے پیچھے کن کن لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے اور یہ لوگ اپنے فائدے کے لیے معصوم رعایا کے جذبات سے کیسے کھیلتے ہیں، اس کا بیان بُدکی صاحب کے افسانے 'اپنے اپنے زاویئے' میں بخوبی ملتا ہے۔ اعلیٰ افسر، سیاسی لیڈر، جرنلسٹ، دلال، چور، بدمعاش، سب ان فسادات کی گنگا میں اپنے ہاتھ دھونا چاہتے ہیں۔ دہشت گردی سے متعلق ایک اور افسانے 'طالبِ بہشت' میں پشاور سکول (پاکستان) کے حادثے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ کس طرح دہشت گرد جنت کی خواہش میں انسانیت کا گلا گھونٹ کر اس زمین اور اس کے مکینوں کو جہنم کی آگ میں جلا رہے ہیں، اس افسانے کا تھیم ہے۔

بُدکی صاحب کی کہانیوں کے موضوع سماجی ہوتے ہیں اور وہ بھی عام زندگی سے جڑے

ہوئے۔ان کی کہانیاں عموماً متوسط طبقے کے خاندانوں کی کہانیاں ہوتی ہیں جن کے کردار زندگی کی جدو جہد میں الجھے آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں۔'جاگتی آنکھوں کے خواب' بھی ایسے والدین کی کہانی ہے جو سب طرح کی تکلیفیں سہہ کر اپنی اولاد کے اچھے مستقبل کے لیے انھیں بیرون ملک بھیج دیتے ہیں لیکن وہی اولاد باہر جا کر اپنے والدین کو بھول جاتی ہے۔ یہ ہمارے سماج کا المیہ ہے کہ مغربی معاشرے کی طرح اب ہمارے سماج میں بھی بڑھاپے میں بزرگ گھر میں تنہا رہ جاتے ہیں اور بچے بھاگتی زندگی کی دوڑ میں شامل ہو کر انھیں بھول جاتے ہیں۔

صنف نازک کے درد کو بھی بُدکی صاحب دل سے محسوس کرتے ہیں۔ مرد اس سماج میں مجبور، کمزور، لاچار اور بے بس عورتوں کا استحصال کس طرح طاقت ور مرد کرتا ہے، افسانہ 'لہو کے گرداب' میں بیان کیا گیا ہے۔ البتہ خوش آئند بات یہ ہے کہ اس افسانے کی عورت ظلم سہتے سہتے بغاوت پر اتر آتی ہے اور اپنا بدلا خود ہی ظالم کی جان لے کر پورا کرتی ہے۔ معاشرے کی بدعنوانیوں کی ایک اور جہت کرپشن ہے۔ آج کے دور میں ہر سطح پر رشوت کا بول بالا ہے۔ یہ ایسی وبا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ راتوں رات امیر بننا چاہتے ہیں۔ کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے 'یوم حساب' میں افسانہ نگار نے کھل کر اس روایت کا ذکر یوں کیا ہے:

> ''جھوٹ، مکاری، رشوت خوری اور کنبہ پروری ہمارے معاشرے کا اوڑھنا بچھونا بن چکا ہے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک ایسا کون ہے جو ان بدعتوں سے بچا ہوا ہے؟''
>
> (ص ۱۶۶)

بہر حال اس کے برعکس معاشرے میں ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو صرف محنت اور ایمانداری کا رزق کھانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ سچائی اور ایمانداری کی راہ دشواریوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ 'آگ کا دریا' اسی موضوع پر لکھی بامقصد کہانی ہے۔

زیر نظر مجموعے میں 'میری کہانی کا کردار' واحد رومانی افسانہ ہے۔ افسانہ دلچسپ ہے اور آخر تک تجسس بنا رہتا ہے۔ کہانی ایک ایسی خوبصورت لڑکی کی ہے جو زندگی کی ہر خوشی چاہتی ہے مگر

شادی کے بندھن میں بندھنا نہیں چاہتی۔ یہ افسانہ عورتوں کے دل اور دماغ میں رشتوں کو لے کر خوف کے پہلو کو بیان کرتا ہے۔

افسانوں کے مجموعے 'اب میں وہاں نہیں رہتا' کی سبھی کہانیوں میں دیپک بُدکی کا تجربہ، سماج کا گہرا مشاہدہ، کشمیر سے محبت، اس کی بگڑتی ہوئی صورت حال کا ملال اور اپنے وطن سے بچھڑنے کا درد جا بجا نظر آتا ہے۔ کوئی بھی کہانی ایسی نہیں جس میں انھوں نے کوئی فحش بات رقم کی ہو۔ آج کل تو مغرب کی طرز پر اردو ادب میں اکثر افسانہ نگار تہذیبی حدوں کو پھلانگ کر کھلی باتیں لکھتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بُدکی صاحب کی کہانیاں اتنی صاف اور پاک ہیں کہ گھر کا کوئی بھی اور کسی بھی عمر کا فرد اطمینان سے پڑھ سکتا ہے۔ میں بُدکی صاحب کو اس کاوش کے لیے دِلی مبارکباد دیتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ زورِ قلم اور زیادہ۔

☆☆☆

✎مضمون: مکاں سے لامکاں تک - دیپک بُدکی کی افسانوی دنیا 'اب میں وہاں نہیں رہتا' کے آئینے میں۔ مضمون نگار: ڈاکٹر رینو بہل، چنڈی گڑھ؛ مطبوعہ بطور تبصرہ: ماہنامہ زبان و ادب، پٹنہ، بہار، فروری ۲۰۱۸ء؛ ص ۵۸-۵۶۔ افسانوی مجموعہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا'، سن اشاعت: ۲۰۱۷ء ضخامت: ۱۸۰ صفحات، قیمت: -/۲۰۰ روپے، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی - ۱۱۰۰۰۶۔

زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی-ایک مختصر تعارف

-وکیل نجیب

دیپک بُدکی اردو کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ برسوں سے اس میدان میں فتح و کامرانی کے پرچم لہراتے چلے آرہے ہیں۔تواتر سے افسانے لکھنا اور مسلسل لکھتے رہنا بڑی بات ہے چونکہ افسانے لکھنے کے لیے پلاٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ویسے تو یہ پلاٹ معاشرے کے اطراف و جوانب سے ہی اٹھائے جاتے ہیں لیکن ان واقعات کو منتخب کرنا اور پھران پر کہانی کا تانا بانا تیار کرنا، یہ صرف وہی کر سکتا ہے جو ان کے رموز سے واقف ہو، زبان پر مکمل عبور ہو، انداز پیش کش کا شعور ہو، آغاز و اختتام کو پیش کرنے کا سلیقہ آتا ہو۔ دیپک بدکی صاحب اس فن کے ماہر ہیں۔ وہ ایک سینئر قلم کار ہیں اور کئی افسانوی مجموعوں کے خالق اور مالک ہیں، ساٹھ کی دہائی کو پار کر لینے کے بعد فن افسانہ نگاری میں جوانوں سے زیادہ باعمل نظر آتے ہیں۔ اردو زبان کے تمام ہی معیاری اور نامور رسالوں میں موصوف کی تخلیقات نمایاں طریقے سے شائع کی جاتی ہیں۔

افسانہ نگاری کی سب سے اہم چیز ہوتی ہے افسانہ کا پلاٹ۔ افسانے کی پوری عمارت افسانے کے پلاٹ پر کھڑی ہوتی ہے اور پلاٹ کی تلاش کے بعد افسانہ نگار یہ سوچتا ہے کہ اس پر بڑی عمارت تعمیر ہوگی یا چھوٹی...!اس کے حساب سے افسانہ نگار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے افسانہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔اس پلاٹ کے منظر، پس منظر، کردار، مکالمے اور بیانیے غرض ہر چیز کو افسانہ نگار سلیقے سے جماتا سجاتا چلا جاتا ہے اور پھر وہ افسانہ اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔

دیپک بُدکی کے افسانوں کو پڑھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی انجینئرنگ کے کافی

پیچیدہ اور وقت طلب کام کا ہوم ورک انجام دے لیتے ہیں اور پھر افسانے کی بنیاد پر عمارت کھڑی کرنے کے لیے خوبصورت لفظوں اور برجستہ جملوں کا استعمال کر کے اسے مکمل کرتے ہیں۔

پلاٹ کو خوبصورت افسانے میں ڈھالنے کے لیے افسانے میں دلچسپی کا عنصر بھی ہونا چاہیے۔ دیپک بُدکی آغاز سے ہی تجسس اور تحیّر کی ایسی فضا قائم کر دیتے ہیں کہ قاری اگر یہ سوچ کر افسانہ شروع کرتا ہے کہ بس وہ سرسری طور گزر جائے گا تاہم ابتدائی چند جملے یا پیراگراف پڑھنے پر قاری اس سے بندھ جاتا ہے اور ایسا بندھتا ہے کہ افسانے کو اختتام تک پہنچنے سے پہلے اسے چین نہیں آتا۔ افسانے کی یہ وہ خصوصیت ہے کہ جس کی بنیاد پر نہ صرف افسانہ یادگار بن جاتا ہے بلکہ افسانہ نگار کی پوری شخصیت قاری کے دل و دماغ میں مرتسم ہو جاتی ہے۔

'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' یہ اس مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن ہے لیکن اس کے افسانوں میں ایسی تازگی ہے کہ آج بھی نئے اور نوخیز نظر آتے ہیں اور ان کی شروعات کرنے کے بعد قاری کو اسے مسلسل پڑھتے جانا لازمی ہو جاتا ہے۔

دیپک بُدکی نے پلاٹ تو اپنے اطراف و جوانب سے ہی اٹھائے ہیں لیکن ان کا اندازِ پیشکش نرالا ہوتا ہے کہ قاری اس میں کھوسا جاتا ہے اور ڈوب جاتا ہے مثلاً اس مجموعے کے افسانے 'گھر کا بیدی' کا مطالعہ کرنے پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو میاں بیوی کی آپسی چپقلش و رنجش کی معمولی کہانی ہوگی مگر کہانی جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی ہے اس میں نئی نئی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور قاری ان میں الجھن پر الجھن کا شکار ہوتا جاتا ہے۔ تجسس اور تحیّر کے نئے نئے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسے حالات پیدا کیے جاتے ہیں کہ قاری بھٹکنے لگتا ہے اور یہ سوچ اس کے دماغ میں گھر کرنے لگتی ہے کہ کہیں اب راوی خود بھی اس ڈرامے کا ایک کردار نہ بن جائے لیکن افسانہ نگار نے نہایت خوبصورتی سے اس کہانی کو ایسے انوکھے انداز سے اختتام تک پہنچایا ہے کہ قاری تو مطمئن ہو جاتا ہے لیکن اختتام اسے غیر متوقع لگتا ہے۔ ایسے واقعات آئے دن اخبارات مین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس کہانی کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ شوہر بیوی سے محبت بھی کرتا ہے

اور خائف بھی رہتا ہے، اس کی وجہ آخر میں عیاں ہوتی ہے کہ بلّی صفت بیوی شیرنی کیوں بن جاتی ہے۔ بظاہر شوہر کی کسی کمزوری کو مصنف نے نہ تو عیاں کیا ہے اور نہ ہی نمایاں طریقے سے اس کا بیان ہوا ہے لیکن عورت کا دل مرد کی کس بات پر آجائے اور مرد کی کونسی ادا پر وہ فریفتہ ہو جائے کچھ کہا نہیں جاسکتا اور جب عورت کو انتخاب کی سہولت میسر آجائے تو کمزور کے مقابلے میں قوی کو ہی چنتی ہے۔ قدرت کا بھی یہی اصول ہے کمزور کو طاقت ور کے ہاتھوں فنا کروا دیتی ہے۔ اس افسانے کو مصنف نے جس خوبصورتی سے طولانی بخشی ہے وہ ایک ماہر فن کار ہی کر سکتا ہے۔ دیپک بُدکی کے اس ایک افسانے سے ہی ان کی فن کاری کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اسی طرح افسانہ نگار کی ایک کہانی ہے، 'چڑی کی بیگم'۔ اس افسانے میں بھی افسانہ نگار نے عورت کی فطرت اور اس کے خوشی حاصل کرنے کے الگ الگ طریقوں کو نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں افسانہ نگار کا انجینئرنگ ورک کافی پیچیدہ اور کسا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے قاری کو پوری طرح سے افسانے کے مرکزی کردار سے جوڑ دیا ہے اور اس کی خود سپردگی جہاں راوی کو خوشی اور انبساط کی دبیز لہروں میں گم کر دیتی ہے وہیں قاری بھی اس میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔ یہ عمل کافی طویل ہوتا ہے لیکن جب فراق کی نوبت آتی ہے تو لگتا ہے کہ ندی کے دو کنارے الگ ہو کر ندی کو اپنے درمیان سے گزار کر مطمئن ہو چکے، دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں مگر بعد میں راوی نے یعنی افسانہ نگار نے انسانی فطرت کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری نہ صرف چونک جاتا ہے بلکہ ششدر بھی رہ جاتا ہے اور یہ عمل کوئی غیر فطری بھی نظر نہیں آتا کیونکہ ہر ایک کو خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب وہ سہارا شکستہ اور بکھرا ہوا بھی ہو سکتا ہے لیکن سہارا تو ہے۔ اس کہانی کا کلائمکس (Climax) قاری کو نہ صرف حیرت زدہ کر دیتا ہے بلکہ فطری تقاضوں کی تکمیل کا درس بھی دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ پیچ ورک دیپک بُدکی صاحب کی خصوصیت ہے جو انھیں ایک منفرد افسانہ نگار ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

اسی مجموعہ میں ایک افسانہ ہے 'سرحدیں'۔ سرحد ایک ملک کو دوسرے ملک سے جدا کرتی

ہے لیکن کبھی کبھی حالات ایسے پیش آتے ہیں کہ ایک ملک کا جاندار دوسرے ملک کے جاندار کا قرب حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے جس کے دوررس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ کہانی کتّوں کی فطرت کو بیان کرتی نظر آتی ہے لیکن کہانی کا یہ پلاٹ پورے جانداروں کی فطرت کو آشکار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ سرحد کی لکیروں سے جاندار تقسیم نہیں ہوتے ہیں۔ قدرت کی بنائی ہوئی زمین پر صرف لکیر کھینچ کر آپ اسے دو ملکوں یا دو تہذیبوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ فطرت کے تقاضے ان سرحدوں کو توڑ کر ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ یادگار فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ راج کپور کی فلم 'حنا' یا پھر جلد ہی آنے والی فلم، ابھشیک بچن اور کرشمہ کپور کی پہلی فلم 'سرحد' اس کی خوبصورت مثالیں ہے لیکن دیپک بُدکی صاحب کا کمال یہ ہے کہ موصوف نے ایک ناپاک جانور کے اختلاط اور اس کے نتیجہ میں برآمد ہونے والے حالات پر یہ کہانی بحث کرتی ہے اور قاری اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ سرحدیں جذبات اور محبتوں پر نہ تو پہرہ بٹھا سکتی ہیں اور نہ ہی انھیں تقسیم کر سکتی ہیں۔

غرض یہ کہ ایسے ہی خوبصورت اور دیرپا اثرات مرتب کرنے والے افسانے اس خوبصورت مجلد کتاب میں موجود ہیں۔ اس افسانوی مجموعہ کا ہر افسانہ اپنے اندر ایک جہان آباد کیے ہوئے ہے جو نہ صرف قاری کی دل بستگی کا سامان مہیا کرتا ہے بلکہ اسے دنیا کے مختلف مسائل سے روبرو کراتا ہے اور پھر ان میں ملوث ہو جانے اور کھو جانے پر مجبور کرتا ہے۔ کتاب 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' دوسرا ایڈیشن ہونے کے باوجود ہر طریقے سے فریش اور تر و تازہ ہے، شاداب ہے اور انبساطی کیفیت پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔

☆☆☆

٭ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی - ایک مختصر تعارف، بطور تبصرہ، تبصرہ نگار وکیل نجیب: ماہنامہ ایوان اردو دہلی، جلد نمبر ۳۳، شمارہ ۴، اگست ۲۰۱۹ء

بنجاری روح کا کرب

-افسانوی مجموعہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' کے آئینے میں-

-ڈاکٹر ہاجرہ بانو

افسانوں کی دنیا جدیدیت کے نام پر بدلتی بدلتی اکیسویں صدی میں دبے پاؤں داخل ہوئی اور قاری وادیب کے درمیانی پل کو چھوٹا کرتی گئی۔ ساتھ ہی افسانہ نگار کا وجود افسانہ میں سمٹتا گیا اور قاری کی شبیہہ دیوہیکل جن کا روپ اختیار کرنے لگی۔ فنون کے دریچے میں انسانی رشتوں سے لپٹا ہوا افسانہ کبھی زندہ تو کبھی بوسیدہ ہیئت لیے ذہنوں میں چپکتا رہا۔ تفریح کے نام پر تفکرات کی پرتیں کھولنے میں کئی افسانہ نگار پیچھے رہ گئے اور افسانوی فن کے تقاضے منزل تک پہنچنے کی حسرت میں کاغذ پر ہی دم توڑ گئے۔ ان ہی افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں دیپک بدکی کا نام جب ابھرتا ہے تو فن کی لکیریں بلند ہوتی نظر آتی ہیں۔ جن کے پاس بیانیہ کا خوبصورت تجریدی رنگ کا پیرہن قاری کو مسحور کر کے اپنی گرفت میں لیتا ہے اور سچائی اور حقیقت کو کوٹ کوٹ کر بھری ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ نہ جذبات سے کھلواڑ نہ ہی نظروں کو آسودگی بخشنے والے الفاظ۔ یہی سچائی کا نور دیپک بدکی کے افسانوں کی خاصیت ہے۔ جو آغاز تا انجام تک قائم رہتا ہے۔

وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے اپنے سمندرِ تخیل کو ہمیشہ کھلا چھوڑا مگر سائنسی میلان کے سبب استنباط اور استخراج سے کام لے کر معروضیت اور معقولیت کو ہمیشہ ترجیح دی۔ سفید و سرخ رنگت لیے بلند قد و قامت رخساروں پر سچائی کا تاثر تو ماتھے پر افسردگی کی لکیریں، لبوں پر خیر مقدماتی، مسکراہٹ۔ دیپک بدکی کی یہ مجموعی کشمیری شخصیت ان کے افسانوں میں جگہ جگہ متاثر کرتی ہے۔ دو دنیا کے بھنور کے درمیان ہاتھ پیر مارتا یہ فنکار زندگی کو صفحات پر منتقل کر کے آگے ہی بڑھتا نظر آتا

ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''اب میں وہاں نہیں رہتا'' قاری کو مضطرب کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ قاری جو ستاروں کی گردش کے سامنے بے بس ہے۔ وہ قاری جو ہاتھوں کی مٹھیوں سے زندگی کو پھسلتے دیکھتا رہتا ہے۔ وہ قاری جو ہنومان کی طرح اپنے دل کو چیر کر بھگوان رام کی شبیہہ دکھانا چاہتا ہے۔ وہ قاری جو فلک کو زمین پر پٹخنا چاہتا ہے، وہ قاری بس اور کیا کیا لیکن لیکن وہ مفلوج ہے، وہ کچھ نہیں کرسکتا، سب کچھ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ یہی ساری بے بسی مجھے ان کے افسانوی مجموعہ ''اب میں وہاں نہیں رہتا'' میں نظر آئی۔ اور بے اختیار مرا قلم چل پڑا۔ دل کی جلی راکھ کی سیاہی میں آگ کی لپیٹیں کتاب کے سرورق پر پھیلی نظر آئی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے پبلیشڈ شدہ 200 روپے قیمت کی کتاب کے 180 صفحات جگہ جگہ جھنجھوڑتے رہے اور نظریں ہر نئے افسانے پر دوڑتی رہیں۔ دیپک بدکی نے مجموعہ کے انتساب کو اپنے سورگ واسی ماما جی مکھن لال نہرو کو معنون کیا ہے۔ پیش لفظ تحریری کی زحمت بھی خود ہی برداشت کی ہے۔ 20 افسانوں پر مشتمل یہ کتاب ایک ہی نشست میں قاری کی نس نس میں اُتر جاتی ہے۔

پانچویں افسانے کے نام ''اب میں وہاں نہیں رہتا'' کو ہی مجموعہ کے لیے منتخب کیا ہے۔ جس میں افسانہ نگار کی پوری فنی صلاحیت ہر سطر میں نظر آتی ہے۔ جیسے یہ سطریں:

> ''مگر اب! اب تو میں وہاں نہیں رہتا۔ میں کہاں رہتا ہوں مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ مرے اپنے جہاں لے جاتے ہیں، چلا جاتا ہوں۔ نئی جگہیں، نئے شہر، نئے ممالک! طالبِ علمی کے زمانے میں ان جگہوں کے نام سنا کرتا تھا مگر وہاں جانے کا کبھی سوچا بھی نہ تھا...... یہ الگ بات ہے کہ میری زندگی کی گھڑی بند ہو چکی ہے یا پھر مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ پھر بھی کہیں کچھ احساس ابھی باقی ہے جو مجھے ہر روز تاکید کرتا ہے کہ ''تم زندہ ہو'' میرے ساتھ جو لوگ رہتے تھے وہ سب بکھر چکے ہیں۔ ہم ایک دو روز میں کہیں نہ کہیں مل ہی جایا کرتے تھے مگر اب تو برس ہا برس تک ہم مل نہیں پاتے۔''

دیپک بدکی زندگی کو مٹھی میں بند کرنا تو کجا انگلی کی پور پر رکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ جذبات

کے شفاف رنگ ان کے الفاظ میں سادگی سے اترتے اور قاری کی نظروں سے رنگ لے کر اُبھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی ایمانداری قاری کو بھی اس کی ڈگر پر لے آتی ہے۔ ان کے افسانے ''اپنے اپنے زاویے'' میں یہ تصدیق ہو جائے گی کہ ایک سچا فنکار مذہب کی کسوٹی پر سچائی کا دامن نہیں چھوڑتا۔

''.....جسونت سنگھ نے ایک نوجوان سے پوچھا ''بھائی کیا بات ہے؟ یہاں دنگا کس بات پر ہوا؟''

''ارے کیا بتائیں صاحب۔ اس پار والوں نے گئو ماتا کی ہتھیا کر کے مندر کے پھاٹک کے سامنے مانس ڈال دیا۔ یہ باہر کی سنتانیں ہیں ہمارے ملک پر پھر سے قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔''

''آپ کو پتہ چلا کہ یہ کام کس نے کیا ہے؟''

''ارے صاحب! معلوم ہوتا تو کیا ہم اس کو زندہ چھوڑ دیتے۔ مگر اتنا تو طے ہے کہ یہ کام ان کے بغیر کوئی کر ہی نہیں سکتا۔'' بھیڑ میں سے کوئی اور آدمی بول پڑا۔..................

جہانگیر خان نے ایک نوجوان کو الگ لیجا کر اسے پوچھا ''بھئی یہ کیا معاملہ ہے، کیوں اتنا سارا ہنگامہ ہو رہا ہے؟''

''ہندوؤں نے کچھ روز پہلے ہماری مسجد کے احاطے میں خنزیر ڈال کر اسے ناپاک کر دیا اور پھر رات کو بستی میں آگ لگا دی۔''

''تم لوگوں نے کسی کو ڈالتے ہوئے دیکھ لیا کیا؟''

''جناب، رات کا وقت تھا، ہم سب سوئے ہوئے تھے، کیا معلوم کون تھا!''

''کیا ہندو اس طرف آتے ہیں؟''

''پہلے جب امن و امان تھا تو بنا جھجھک چلے آتے تھے لیکن جب سے تناؤ بڑھ گیا ہے، اب نہیں آتے۔''

"پھر تم کیسے کہتے ہو کہ یہ کام ہندو نے ہی کیا ہے؟"

اسی طرح 'اب میں وہاں نہیں رہتا' کے باقی افسانے بھی انسانی ذہن میں شعور کی حدیں پھلانگنے میں معاون ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ جذبات کو جب بکھرنا ہوتا ہے۔ تو کبھی وہ صفحات پر بھی بکھر جاتے ہیں اور منجمد پڑے اجسام میں تمازت بھر دیتے ہیں۔ دیپک بدکی کے اس افسانوی مجموعہ نے فن کا پورا حق ادا کیا ہے۔

☆☆☆

﴾مضمون 'بنجاری روح کا کرب۔ افسانوی مجموعہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا کے آئینے میں' مضمون نگار ڈاکٹر حاجرہ بانو، ایڈیٹر حاشیہ رسالہ، مطبوعہ ماہنامہ حاشیہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر۔

اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار اور شاعر

-سہیل احمد صدیقی (پاکستان)

ادھر تکرار اُلفت کی، اُدھر جھگڑا وفاؤں کا
جو رنجش پڑ گئی باہم، بڑی مشکل سے نکلے گی

یہ مشہور شعر ہے، بشیشر ناتھ صوفیؔ [Bashesharnath Sufi] کا جو تقسیم برصغیر سے قبل، اپنے وقت کے ممتاز شاعر تھے۔ (بحوالہ' اصلاح سخن، لاہور۔ سن انیس سو دس)۔ خاکسار نے یہ شعر اپنی کتاب' اردو کے مشہور اشعار۔ ایک جائزہ': تحقیق (سن اشاعت: سن دو ہزار ایک) میں شامل کیا، مگر ''حرف چیں'' [Composer] نے اُن کا نام غلط کر دیا۔ چھے مرتبہ کی تغلیط و تصحیح کے بعد، کتاب شایع ہوئی تو معلوم ہوا کہ اُس نے بشیشر کی بجائے، شبیر ناتھ لکھ دیا ہے۔ اب دوسو اعزازی نسخوں پر ہاتھ سے لکھ کر تصحیح کرنی پڑی۔ یہ شعر اور اس سے جُڑا معاملہ یوں ذہن میں تازہ ہوا کہ شاعر موصوف، غیر مسلم تھے اور گزشتہ دنوں ہندوستان میں مقیم، میرے بزرگ کرم فرما دیپک بُدکی صاحب نے ازراہ عنایت اپنی دو تازہ کتب ارسال فرمائی ہیں اور اس ہیچ مدآں کو اس لائق جانا ہے کہ ان کتب کے متعلق خامہ فرسائی بھی کرے۔ ان دو کتابوں میں اُن کے افسانوں کا نیا (اور ساتواں) مجموعہ' اَب میں وہاں نہیں رہتا' اور ایک نہایت اہم، تحقیق پر مبنی کتاب' اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' ہے۔ ممتاز افسانہ نگار و نقاد جناب دیپک بُدکی کی اس کتاب میں ڈھائی سو سے زائد غیر مسلم افسانہ نگاروں کے کوائف شامل ہیں، جبکہ سرسری نظر سے دیکھیں تو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس تعداد میں اکثریت ہندو حضرات کی ہے۔ اردو کے افسانوی ادب میں پریم چند، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے اسماء کسی عمارت کے ستون کی طرح مستحکم ہیں اور بقول کسے، ''انھیں نکال

دیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے''۔(ضمنی بات یہ ہے کہ کرشن چندر کی بیگم سلمٰی صدیقی بنت پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد صدیقی کے بقول، کرشن چندر مسلمان ہوگئے تھے اور نکاح نامے میں اپنا نام بھی تبدیل کر کے غازی مَلِک لکھوا دیا تھا، مگر عملاً ہندو ہی رہے اور سماجی شہرت بھی کرشن چندر کے نام ہی سے برقرار رہی)۔اہم سوال یہ ہے کہ اردو ادب کی خدمت کے حوالے سے بات کی جائے تو مذہبی بنیاد پر تخصیص یا تقسیم کیوں کی جائے یا ایسا کرنا کسی محقق کے لیے کیوں ناگزیر ہے؟.....اس کا جواب جناب نند کشور وِکرَم کی اس تحریر سے مل سکتا ہے جو زیرِ نظر کتاب میں شامل ہے:''........اس سلسلے میں دیپک بُدکی صاحب نے کئی برسوں کی تحقیق کے بعد زیرِ نظر کتاب 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' پیش کی ہے، حالانکہ اس اکیسویں صدی میں 'مسلم' اور 'غیر مسلم' افسانہ نگاروں کی تخصیص کچھ عجیب سی لگتی ہے ....بہر حال کتاب کا موضوع اور نام کا انتخاب، مصنف و مرتب کا کام ہے، ہم اعتراض کرنے والے کون؟.... میرے خیال میں بُدکی صاحب نے یہ تخصیص اس لیے کی ہوگی کہ اگر وہ اردو کے تمام افسانہ نویسوں کو اس میں شامل کریں گے تو اس تحقیق میں مزید برسوں لگ جائیں گے اور کام پھر بھی مکمل نہ ہو پائے گا۔ دوسرے اُن کے ذہن میں یہ بات بھی ہوگی کہ آیندہ دس بیس برسوں میں اردو میں غیر مسلم افسانہ نگار نا پید ہو جائیں گے اور شاید اُن پر کوئی تحقیق کرنے والا بھی نہ ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے، ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں غیر مسلم لکھنے والے 'نا' کے برابر رہ جائیں، مگر، گزشتہ ایک سو سال کے عرصے میں کی گئی اُن کی کاوشوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا اور اُن پر تحقیق ہوتی رہے گی''۔ خاکسار کی رائے میں موصوف نے ایک انتہائی قنوطیت کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انگریز سے آزادی کے بعد، انگریز ہی کے شروع کئے ہوئے 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے للولال جی کی ''پریم ساگر'' کا مشن آگے بڑھاتے ہوئے اردو کو محدود اور مسدود کرنے کی شعوری مساعی سرکاری سرپرستی میں جاری رکھی گئیں (اور ہندوستان کے معروف، بزرگ صحافی محترم رشید انصاری سمیت بعض اہل درد کے نزدیک، ابوالکلام آزاؔد جیسے مسلمانوں کے اقتدار میں ہوتے ہوئے اردو دشمنی کا یہ سلسلہ جاری

رہا)، اس کے باوجود، اردو سے تعلق جوڑنے والوں میں کسی نہ کسی طرح اضافہ ہوتا رہا ہے، تو کچھ بعید نہیں کہ نا امیدی کے یہ بادل چھٹ جائیں اور بات مایوسی تک نہ پہنچے۔ اس راقم کو تو زیرِ نظر کتاب سے معلوم ہوا کہ اردو کے غیر مسلم، خصوصاً ہندو افسانہ نگار اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں یا موجود رہے، مگر طبقۂ شعراء میں یہ چلن کہیں زیادہ عام ہے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ ''ہر فرعونے را موسیٰ (علیہ السلام)'' کے مصداق ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہونے والی اور ہندی پر عبور کی حامل اردو شاعرہ لتا حیا نے کس طرح اردو کا بھرپور دفاع کیا ہے اور اس ضمن میں آنند نرائن مُلّا جیسے اہل ذوق کی یاد تازہ کر دی ہے جو کہا کرتے تھے:

مُلّا بنا دیا ہے اسے بھی مُحاذِ جنگ
اِک صلح کا پیام تھی اردو زباں کبھی

یہاں ضمنی طور پر سابق مُنصف، محترم الیاس احمد، مرتب ''گل ہائے پریشاں'' سے استفادہ کرتے ہوئے یہ عبارت اہل دل کے ذوق مطالعہ کے لیے نقل کر رہا ہوں: ''اس برے وقت میں بھی اردو کی محبوبیت میں چنداں فرق نہیں، کم از کم اہل نظر یہی سمجھے ہیں کسے کہ محرم بادِ صباست می داند + کہ باوجودِ خزاں، بوئے یاسمن باقیست۔ امید ہے کہ انصاف پسند طبقہ اردو کا ساتھ دے گا اور اُن خطروں میں بھی کمی ہو جائے گی جن سے اردو محصور ہے''۔ آمدم برسرِ مطلب! ہم بات کر رہے تھے جناب دیپک بُدکی کی جو ہندوستان کے زیرِ انتظام کشمیر میں پندرہ فروری سن انیس سو پچاس کو پیدا ہوئے اور سن انیس سو نوے سے نامساعد حالات کے سبب، غازی آباد کے علاقے وسندھرا میں مقیم ہیں۔ افسانہ نگاری، تبصرہ و تنقید اور تحقیق میں شہرت یافتہ، بُدکی صاحب علم نباتات میں ماسٹرز کی سند کے علاوہ کئی اعلیٰ اسناد کے حامل ہیں جن میں علی گڑھ سے ادیب ماہر کی سند اور فوجی تربیت گاہ سے گریجویشن بھی شامل ہے۔ وہ چار زبانوں اردو، انگریزی، ہندی اور کشمیری پر دسترس کے ساتھ ساتھ ان میں شایع ہونے والی نگارشات اور متعدد کتب کے خالق کی حیثیت سے دنیا بھر میں پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے تدریس، انشورنس، ڈاک اور فوج سمیت

مختلف ومتنوع شعبہ جات میں خدمات انجام دی ہیں اور اب کُل وقتی ادیب ہیں۔ دیپک بُدکی کی کتاب 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' کی بنیاد یوں پڑی کہ اُنھوں نے سہ ماہی 'فکر و تحقیق' کے 'افسانہ نمبر' بابت اکتوبر تا دسمبر سن دو ہزار تیرہ کے لیے مواد بالتحقیق جمع کر کے مدوِن کیا تو بوجوہ اسے مختصر کرنا پڑا، پھر موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے وسیع کرتے ہوئے ایک مفصل مقالہ تحریر کر کے اسے کتابی شکل دی۔ انھوں نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی موضوع کے بعض محدود گوشوں پر کتاب تحریر کرنے والوں کا بھی ذکر کیا ہے اور انھیں اپنا پیش رَو مانا ہے، حالانکہ اس موضوع پر یہ اولین مکمل کتاب ہے جسے ایک مدت تک بجائے خود، سند کا درجہ حاصل رہے گا تاوقتیکہ کوئی اس موضوع سے انصاف کرے اور اُن پہلوؤں سے بھی بخوبی آشنا ہو جو بوجوہ ادیب موصوف سے نظر انداز ہو گئے۔ تحقیق اور رَدِ تحقیق کا سلسلہ اسی طرح چلتا ہے کہ جب اردو تنقید کا دامن کورا تھا تو محمد حسین آزادؔ کی 'آبِ حیات' اور موضوع کے فرق سے قطع نظر 'محاسن کلام غالب' از عبدالرحمٰن بجنوری سند کا درجہ رکھتے تھے، پھر وسعت ہوتی گئی اور ''لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا''، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان دونوں کتب کے مواد کی وقعت اور مصنفین کی فکری اُپچ بہر حال اپنی جگہ نا قابل فراموش ہیں۔ 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' کے شروع میں 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار۔ ایک تعارف' کے عنوان سے اردو ادب، صحافت اور ادبی صحافت میں کلیدی کردار ادا کرنے والے بعض غیر مسلم خصوصاً ہندو اہل ذوق کا محض اشارۃً ذکر کیا ہے اور ایک بات بڑے پتے کی کہی ہے کہ بقول محمد حافظ سعید، مصنف اردو لٹریچر کے ہندو رائٹرز، ہندوؤں میں دو فرقوں (برادریوں یا ذاتوں) نے اردو میں کمال حاصل کر لیا، ایک کشمیری برہمن تھے اور دوسرے کائستھ۔ یاد رکھئے کہ خود بُدکی صاحب کشمیری ہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ کشمیری اور انگریزی ادب سے بھی بحسن و خوبی انصاف کرتے ہیں، جبکہ ایک ضمنی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں کائستھ، فارسی اور علم ریاضی میں مہارت کے سبب مشہور تھے۔ میرے والد صاحب نے بھی اپنے اسکول، نور محمد ہائی اسکول، حیدرآباد (سندھ) کے ایک ایسے ہی قابل استاد کا ذکر کیا ہے جو سائنس اور

ریاضی کے ماہر تھے۔ (میرے والدمحترم رفیع احمد صدیقی صاحب کو اُن کی لیاقت کے سبب، میٹرک کے امتحان میں امتیازی نشانات حاصل کرنے کے فوری بعد، بطور مدرس ملازم رکھ لیا گیا۔ بعد میں انھوں نے بی کام تک تعلیم نیز انگریزی، ریاضی، ڈرائنگ اور اسکاؤٹس کے لیے باقاعدہ تربیت یافتہ استاد کی حیثیت سے سندھ کی اس درس گاہ کی خدمت کی، بعدازآں، گورنمنٹ سیکنڈری اسکول، جیل روڈ۔ کراچی اور میری کلاکو اسکول۔ کراچی سے بھی منسلک رہے اور پھر سندھ ایمپلائیز سوشل سیکیوریٹی انسٹی ٹیوشن سے ایک طویل مدت وابستہ رہ کر سبک دوش ہوئے)۔ اسی مضمون میں ادیب موصوف نے برملا اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اردو افسانہ نگاروں کے قافلے کے پیش رَو، پنڈِت رتن ناتھ سرشارؔ اور منشی جوالا پرشاد برقؔ تھے۔ اول الذکر، لکھنؤ میں مقیم کشمیری پنڈت تھے جنھوں نے 'فسانہ آزاد' لکھ کر ناول اور افسانے دونوں کی راہ ہموار کی۔ بقول بُدکی صاحب، اردو کے عظیم افسانہ نگار پریم چند نے 'فسانہ آزاد' کی تلخیص "آزاد کتھا" کے نام سے چھاپی تھی۔ پنڈت صاحب شاعر بھی تھے اور اسیرؔ لکھنوی جیسے معروف سخن وَر کے شاگرد تھے، مگر اُن کا بطور شاعر مشہور ہونا مقدر میں نہ تھا۔ لکھنؤ کے مشہور اخبار، 'اَوَدھ اخبار' کے یہ فاضل مدیر عربی و فارسی پر گرفت کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم سے بہرہ مند اور اپنی عملی زندگی کی ابتداء میں مُعلِم تھے۔ ناول نگار منشی جوالا پرشاد برقؔ بھی اردو کے اولین اور کامیاب ادبی مترجمین میں شامل تھے، مگر اُنھیں شاعری سے وہ مقام نہیں ملا جو اُن کے معاصرین کو حاصل ہوا۔ ہندوستان کے زیر انتظام ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب و صحافت کی بیش بہا خدمات انجام دی گئیں۔ اس ضمن میں سرفہرست نام 'کشمیر کے پریم چند'، پریم ناتھ پردیسی کا ہے جنھیں بقول بُدکی صاحب اس خطے میں افسانے کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے اور پھر ان کے مقلدین میں پریم ناتھ در، پشکر ناتھ، ویریندر پٹواری، دیپک کنول، دیپک بدکی اور آنند لہر نے عالمی سطح پر نام کمایا۔ دیپک بدکی کی کتاب 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' میں شامل اہل قلم کی فہرست میں صرف چند نام ملاحظہ فرمائیں: پریم چند، پنڈت میلا رام وفاؔ، کنھیا لال کپور (نامور طنز و مزاح نگار، شاگردِ پطرس بخاری)، شِو برت لال

وَرمن، بدری ناتھ سُدَرشن، گوپال متّل ، دیویندر ستیارتھی، اوپندر ناتھ اشکؔ، کرشن چندر، برج موہن دتا تریہ کیفیؔ، راجندر سنگھ بیدی، جمنا داس اخترؔ، رام لعل، نریش کمار شادؔ (نامور قطعہ نگار شاعر)، گردیال سنگھ عارفؔ، بھگوان داس اعجازؔ (نامور دوہا نگار شاعر جنھوں نے خاکسار کے جریدے ہائیکو انٹرنیشنل کے لیے ازخود ہائیکو نگاری کا آغاز کیا اور ایک عرصے تک اپنے کلام سے نوازتے رہے)، ہمت رائے شرما، ارنسٹ ڈی ڈین، سیموئل وِکٹر بھنجن، بلراج کومل، ستیہ پال آنند (بطور شاعر بھی معروف)، دلیپ سنگھ، کشمیری لال ذاکر، پرکاش پنڈت (جن کی مرتبہ کئی کتب ہمارے یہاں عام دستیاب ہیں)، شانتی رنجن بھٹا چاریہ، نریندر لوتھر، اندرا شبنم اِندوؔ (چوبیس نومبر سن انیس سو پچاس کو کراچی، پاکستان میں متولد، اردو، ہندی اور مراٹھی کی ممتاز شاعرہ۔ خاکسار کے فیس بک حلقے میں شامل)، آنند لہرؔ، آشا پربھات، بلراج مین را، ڈاکٹر کیول دھیر، طالبؔ کاشمیری اور بہاری لال بہارؔ شملوی۔ حصہ نظم بھی غیر مسلم شعراء کی ایک کثیر تعداد سے مملو نظر آتا ہے، یہ اور بات کہ معروف اہل سخن یا اساتذہ کی فہرست میں معدودے چند شامل ہیں جیسے راجہ رام نرائن موزوںؔ جن کا سراج الدولہ کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست اور پھر غدار میر جعفر کے بیٹے کے ہاتھوں قتل کے پس منظر میں کہا گیا مشہور زمانہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے:

؎ غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

پھر نگاہ دوڑائیں تو یہ نام سامنے آتے ہیں: میرزا ہرگوپال تفتہؔ (شاگرد میرزا غالبؔ)، دَیا شنکر نسیم (مثنوی گلزار ارم) اور مادھو رام جوہرؔ فرخ آبادی جن کے یہ اشعار بہت مشہور ہیں:

؎ بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

....

ب اب عطر بھی مَلو تو تکلف کی بُو کہاں
وہ دن ہُوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

....

ب نالہ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

(اردو کے ضرب المثل اشعار۔ تحقیق کی روشنی میں از محمد شمس الحق)

مزید: دُرگا سہائے سُرور جہاں آبادی، برج نرائن چکبست، منشی جوالا پرشاد برق، برج موہن دتاتریہ کیفی، تلوک چند محروم، رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری، پنڈت ہری چند اختر، عرش ملسیانی، جوش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، آنند نرائن مُلاّ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ہمت رائے شرما ۔بانی اردو ماہیا، نیز افسانہ نگار، بھگوان داس اعجاز اور بہت سے دیگر۔ اردو کے غیر مسلم شعراء کے سوانح اور کلام کا انتخاب مختلف کتب میں شامل اشاعت ہوا۔ میرے بزرگ معاصر محترم طاہر سلطانی کی منفرد کتاب 'اذان دیر' سن انیس سو ستانوے میں منصۂ شہود پر آئی جس میں انچاس غیر مسلم شعراء کا حمدیہ کلام مع کوائف پیش کیا گیا، پھر اُنھی کی دوسری کتاب 'گلشن حمد' میں سَتر غیر مسلم شعراء کا کلام شامل ہے جو سن دوہزار پانچ میں شایع ہوئی۔ طاہر بھائی کی بھرپور مدد اور حوصلہ افزائی سے نوراحمد میرٹھی کا کام بھی پایہ تکمیل کو پہنچا۔ (راقم کے غیر مطبوعہ مضمون 'امر عظیم کا سرسری جائزہ' سے اقتباس)۔ اب محض امتثال امر اور قارئین کرام کے شوق کے پیش نظر 'اسباق' (پونہ، ہندوستان) میں شامل، نیز تلامذہ شاد عظیم آبادی از سید نعمت اللہ و دیگر کتب میں منقول، حمد و نعت و منقبت گو غیر مسلم شعراء کے اسماء نقل کرتا ہوں (اس شمارے کا ماہ وسال اشاعت میرے پاس محفوظ نہیں): ۱۔ قمر جلال آبادی (اصل نام غیر مذکور)۔ ۱۹۱۷ء تا ۲۰۰۳ء (بمبئی)۔ ۲۔ آزاد گلاٹی ۔ ۳۔ ڈاکٹر وِدّیا ساگر آنند۔ ۴۔ آزاد عظیم آبادی، بھوانی پرشاد (تلمیذ شاد عظیم آبادی)۔ ۱۸۷۵ء تا ۱۹۳۵ء۔ ۵۔ عاجز گیاوی، منشی میوالال (تلمیذ شاد عظیم آبادی): ۱۸۸۷ء۔ دور عروج۔ صوفی

مشرب۔ مجموعہ ہائے کلام: 'کلید گنجینہ توحید' (۱۹۲۷ء) اور سرّ توحید' (۱۹۳۰ء) ...۶۔ عارف عظیم آبادی، شیو نرائن چودھری (تلمیذ شاد عظیم آبادی): ۱۸۸۰ء تا (اندازاً) ۱۹۶۰ء۔ ۷۔ عطا عظیم آبادی، رائے اسیری پرشاد (تلمیذ شاد عظیم آبادی): ۱۸۵۵ء تا ۱۹۲۵ء۔ صوفی مشرب۔ ۸۔ مُست گیاوی، بابو نند کشور لال (تلمیذ شاد عظیم آبادی): ۱۸۵۰ء (اندازاً) تا ۱۹۰۵ء (بحوالہ تلامذہ شاد عظیم آبادی از سید نعمت اللہ۔ مطبوعہ جون ۲۰۰۴ء)۔ ۹۔ رائے سنگھ عاقل (سودا کے دوست): سنین غیر مذکور۔ تعلق: پنجاب (بحوالہ پنجاب کے قدیم اردو شعراء از خورشید احمد خان یوسفی۔ مطبوعہ ۱۹۹۲ء) ۱۰۔ شور، جارج پیش: پ۔ ۱۸۲۳ء بمقام کوئل، علی گڑھ۔ سن وفات غیر مذکور۔ فرنچ نژاد عیسائی، اسلامی طرز معاشرت کا دل دادہ۔ ۱۱۔ موزوں، مہاراجہ رام نرائن: نواب سراج الدولہ کے مصاحب۔ ۱۲۔ کنور، راجہ اپور بو کرشنا بہادر: ۱۸۰۷ء تا ۱۸۶۸ء۔ ۱۳۔ دیب، دینا ناتھ: اواخر انیسویں صدی کے ماہر اردو، فارسی، سنسکرت و انگریزی۔ {کلکتے کی ادبی داستانیں از ڈاکٹر وفا راشدی۔ مطبوعہ ۱۹۹۹ء}۔ (راقم کے غیر مطبوعہ مضمون 'امر عظیم کا سرسری جائزہ' سے اقتباس)۔

میرے خیال میں اگر دیپک بُدکی صاحب کو بھرپور مدد فراہم کی جائے جو اُن کے نجی مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے تحقیق و تصنیف میں معاون ثابت ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اردو کے غیر مسلم شعراء کے موضوع پر ایک اہم کتاب کا اضافہ نہ کر سکیں۔

☆☆☆

☜ مضمون بعنوان 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار اور شاعر (سخن شناسی نمبر چوبیس)'؛ تحریر: سہیل احمد صدیقی، پاکستان؛ مرقومہ ۲۶؍نومبر ۲۰۱۷ء؛ مطبوعہ ڈیلی ایکسپریس، پاکستان [سنڈے میگزین]، ۱۰؍دسمبر ۲۰۱۷ء

دیپک بدکی کے افسانوی مجموعہ 'ادھورے چہرے'
کا سماجی وثقافتی مطالعہ

-عیسیٰ محمد

دیپک بدکی جموں وکشمیر کے ایک معروف کہانی کار ہیں۔ان کی ولادت سرینگر کے محلّہ کرالہ ٹینگ (وازہ پورہ)، مہاراج گنج میں ۱۵رفروری ۱۹۵۰ کو ہوئی۔وہ ایک سچے ایماندار انسان، ہمدرد سرکاری افسر، معتبر ادیب اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے مقرر بھی ہیں لیکن ادبی دنیا میں ان کو ایک مقبول افسانہ نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہیں۔جموں وکشمیر کے افسانے پر جب بھی بحث ہوگی ان کا نام لیے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۰ء میں افسانہ 'سلمیٰ' لکھ کر کیا، جو مقامی روزنامہ 'ہمدرد' سرینگر کے سنڈے ایڈیشن میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ کچھ برس فعال رہنے کے بعد لکھنا ترک کیا لیکن پھر ۱۹۹۶ء میں دوبارہ ادب کی جانب راغب ہوگئے اور تب سے اب تک مسلسل افسانے لکھ رہے ہیں۔اب تک ان کے پانچ افسانوی مجموعے اور ایک افسانچوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ان کے علاوہ تنقیدی مضامین وتبصروں پر مشتمل تین کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

دیپک بُدکی کے پہلے افسانوی مجموعے 'ادھورے چہرے' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا جس کے بعد دوسرا اور تیسرا ایڈیشن ۲۰۰۵ء اور ۲۰۱۴ء میں بالترتیب شائع ہوئے۔۲۰۰۵ء میں اس مجموعے کا ہندی ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔'ادھورے چہرے' میں ۱۴رکہانیاں شامل ہیں۔ان کہانیوں میں دیپک بُدکی نے سماج کے ایسے پہلوؤں کو پیش کیا ہے جن کو انھوں نے وقتاً

فو قتاً اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ جہاں جہاں اپنے فرضِ منصبی پر مامور رہے وہاں کے لوگوں اور وہاں کے سماج کا انھوں نے بڑی مہارت سے مشاہدہ کیا اور پھر اپنے افسانوں میں قلم بند کیا۔ مجموعے میں شامل پہلے افسانے 'رشتوں کا درد' میں انھوں نے معاشرے میں موجود ایک ایسی خاتون کا کردار تخلیق کیا ہے جو جاہ طلب بھی ہے اور شاطر بھی۔ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے اور کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک اولوالعزم بیوی اپنے شوہر سے سبقت لینے کے لئے کیسی کیسی حرکتیں کرتی ہے۔

> ''فریڈم پارٹی کے ایک پر اثر اور مقبول ترین نوجوان لیڈر سے اس کی اچانک ملاقات ہوگئی۔ شاید ماتر بھومی کے لئے اس کا انٹرویو لینے کی غرض سے اس کے پاس چلی گئی تھی۔ فری لانس جرنلزم اس کی ہابی تھی ۔....دونوں نے اپنے اپنے مکھوٹے پہن رکھے تھے۔ وہ اپنے مکھوٹے کو میرے ہی وارڈ روب میں چھپا کر رکھتی تھی ....انھوں نے آپس میں شادی کرنے کی ٹھان لی۔ راستے کی رکاوٹ صرف میں تھا، اور کوئی نہیں۔ ابھے سنگھ نے اس کو بنا شادی کے اپنے پاس رکھنے کی پیش کش کی، وہ نہیں مانی۔ وہ با قاعدہ شادی کے بندھن میں بندھنا چاہتی تھی، تا کہ اسے کوئی رکھیل نہ کہے اور اس کے بچے حرامی نہ کہلائیں۔ ابھے سنگھ اس بات پر راضی ہو گیا۔ مگر راستے کی رکاوٹ...؟ مجھے راستے سے ہٹانے کی کئی منصوبے بنائے گئے۔ کورٹ...!لالچ...!اغوا...!تاڈا...!سپاری...!

(افسانہ 'رشتوں کا درد' ادھورے چہرے، تیسرا ایڈیشن، ص ۲۸-۲۷)

میاں بیوی کے جھگڑے اور پھر الگ ہو جانے سے خاندان میں مصیبتیں تو پیدا ہوتی ہی ہیں، لیکن اس کا خمیازہ سارے کنبے اور سماج کو اٹھانا پڑتا ہے۔ ایسے منتشر کنبوں کے افراد بدفعلیوں

جیسے رنڈی بازی یا اغلام بازی کے مرتکب ہو جاتے ہیں اور یہ بدفعلیاں وبا کی طرح سماج میں پھیل جاتی ہیں۔افسانے میں افسانہ نگار نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔اقتباس:۔

''اس سے بدنام بازاروں کو تقویت پہنچتی ہے، بال بچے نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اور جنسی بھوک سے تڑپتے یہ مرد و زن کمسن بچوں اور بچیوں کے ساتھ بدفعلیاں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''

(افسانہ 'بٹی ہوئی عورت'؛ادھورے چہرے،تیسرا ایڈیشن ،ص ۱۴۱)

افسانہ 'ڈرفٹ وڈ' میں دیپک بدکی نے سماج کے ان عناصر کو اجاگر کیا ہے جو والدین کی لاپروائی سے بے لگام ہو جاتے ہیں۔اس افسانے کا مرکزی کردار 'سمن' ہے جس کو والدین نے بہت زیادہ چھوٹ دے رکھی ہے۔اس کی ماں لاپرواہ ہوتی ہے جب کہ باپ اپنی ہی بیٹی کے ساتھ ناجائز تعلقات کا مرتکب ہوتا ہے۔ نتیجے میں سمن برے کاموں میں لگ جاتی ہیں۔والدین کی فراموشی کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کر لیتی ہے۔والد کی منشا کے خلاف وہ اپنی مرضی سے ماڈل بننا چاہتی ہے اور اسی مقصد کے حصول کے لیے ممبئی چلی جاتی ہے۔وہاں ہر جائز و ناجائز کام کرنے کے باوجود اسے کامیابی نہیں ملتی ،پھر بھی اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے وہ ایک مالدار عربی شیخ،جس کے ساتھ اس کی ملاقات ممبئی میں ہوتی ہے، کے ساتھ دبئی چلی جاتی ہے اور نہ صرف اس کی ملازمت کرتی ہے بلکہ اس کے حرم کا حصہ بن جاتی ہے۔تاہم اس کے والدین ان چیزوں سے بےخبر رہتے ہیں کیونکہ وہ انھیں صرف خوش خبریاں دیتی رہتی ہے جب کہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔اس انجام کو دیپک بدکی نے یوں بیاں کیا ہے۔

''دبئی کی اپنی زندگی کے بارے میں سمن اپنے پتا جی کو وقتاً فوقتاً اطلاع دیتی رہی ۔اس نے باپ سے کبھی کچھ بھی نہ چھپایا ماسوا اس کے کہ وہ شیخ عبداللہ الکبیر کے حرم کی زینت بن چکی ہے۔''

(افسانہ 'ڈرفٹ وڈ': ادھورے چہرے، تیسرا ایڈیشن، ص ۶۲)

عورت کو ہمیشہ پست درجے کا شہری یا دوسرے نمبر کی مخلوق سمجھا گیا ہے، اس لئے ہر سماج میں عورتوں سے زیادتیاں ہوتی رہی ہیں۔ عام طور پر گھر میں جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو خوشی کی بجائے ماتم جیسا ماحول بن جاتا ہے۔ ہر ساس سسر یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان کی بہو ایک بیٹے کو جنم دے۔ دو تین لڑکیاں پیدا ہونے پر یا پھر بانجھ ہونے کی صورت میں کئی بار بیوی کو طلاق دی جاتی ہے۔ گھروں میں بیٹے اور بیٹی کے حوالے سے اس طرح کی امتیازی سوچ کی عکاسی افسانہ 'ادھورے چہرے' میں کی گئی ہے۔ نیچے دیئے گئے جملوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ماں اپنی بیٹی کو اس بارے میں کیا کہتی ہے۔ بقول ماں کے ایک شادی شدہ عورت لڑکے کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے اور اس کی سسرال میں عزت نہیں کی جاتی ہے۔ اقتباس:

''اری تم نہیں سمجھتی۔ لڑکا گھر کا چراغ ہوتا ہے۔ نتاشا کا کیا بھروسا وہ تو آج یہاں ہے کل کہیں اور ہوگی۔ پرایا دھن ہے۔ چلی جائے گی۔''

(افسانہ 'ادھورے چہرے': ادھورے چہرے، تیسرا ایڈیشن، ص ۷۷)

اتنا ہی نہیں یہ افسانہ موجودہ دور کے معاشرے کا آئینہ بن کر سامنے آتا ہے جس میں مشترکہ کنبے غائب ہو رہے ہیں اور چھوٹی اکائیوں کا چلن عام ہو رہا ہے۔ ایسے کنبوں میں باہمی رشتوں کی ناپائیداری اور گھروں کی ٹوٹ پھوٹ یقینی ہو رہی ہے۔ آئے روز کی طلاقیں اور بچوں کی فراموشی موجودہ سماج کا ناسور بن چکا ہے۔ افسانہ 'ادھورے چہرے' انہی سماجی بدعتوں کا مظہر ہے۔ دراصل ہر سماج میں اچھے برے دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ اچھے کام کرتے ہیں اور کچھ برے کام کرتے ہیں، کوئی بیوی شوہر کو دھوکا دیتی ہے تو کوئی شوہر شراب پی کر بیوی کی پٹائی کرتا ہے ،کہیں بچے جرائم میں دلچسپی لیتے ہیں تو کہیں جان جوکھم میں ڈال کر دوسروں کی جان بچاتے ہیں، کہیں ہمسایہ ہمدرد ملتا ہے تو کہیں پریشانی کا باعث بنتا ہے۔ یہی سب کچھ سماج کا تقاضہ ہے۔ افسانہ 'خودکشی' میں دیپک بدکی نے سماج کے ایسی بدعت کو منعکس کیا ہے جو مرد اساس سماج کا پردہ

فاش کرتا ہے۔ ہمارے سماج میں بوڑھے مرد چھوٹے بالغ یا نابالغ لڑکیوں سے روپے کا لالچ دے کر شادی کرتے ہیں۔ وہ نہ تو عورت کی جسمانی تشفی کے لائق ہوتے ہیں اور نہ پوری عمر اس کا ساتھ نبھا سکتے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار سلمیٰ ہے، جس کی بیوہ ماں اس کی شادی ایک عمر رسیدہ شخص سلمان رشید سے اس لیے کرتی ہے تا کہ دونوں کو سہارا مل جائے۔ لیکن شادی کے بعد حالات ایک دم بدل جاتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ شادی کے کچھ عرصہ بعد سلمیٰ کی ماں دنیا سے اٹھ جاتی ہے اور اس کے کچھ مہینوں بعد بوڑھا سلمان سیڑھی سے گر کر ہمیشہ کے لئے اپاہج ہوتا ہے۔ گو اس کی جوان بیوی اپنی تمام تر خواہشات کو دبا کر اس کی خدمت کرتی ہے لیکن اسے گھر کے لیے آمدنی کی سبیل بھی کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے نوکری کرتی ہے اور پھر سرکاری خرچے پر بی ایڈ کرتی ہے جہاں اس کی دوستی ایک مخلص آدمی سے ہوتی ہے جو اس کو پڑھائی میں مدد کرتا ہے تا کہ وہ کامیاب ہو جائے۔ اِدھر سلمیٰ کا بوڑھا شوہر جسمانی طور پر اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ وہ پشیماں ہو کر مخلصی موت (Euthanasia) کی آرزو کرتا ہے اور سلمیٰ کے دوست سے مدد کرنے کو کہتا ہے تا کہ سلمیٰ اس کی زوجیت سے آزاد ہو اور وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا سکیں۔ اس بارے میں شوہر یوں گویا ہوتا ہے۔

> ''بے چاری کیا بتائے گی۔ یہ تو میری کرنی کا پھل بھگت رہی ہے۔ ورنہ اس کا بھی ایک خوش حال گھر ہوتا۔ بال بچے ہوتے... میں اپنی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔ میں سلمیٰ پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ کیا آپ میری مدد کر سکیں گے..... مجھے دس پندرہ خواب آور گولیاں لا کر دیجئے۔ میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔''
>
> (افسانہ 'خودکشی'؛ ادھورے چہرے، تیسرا ایڈیشن، ص ۸۷-۸۶)

افسانہ 'خودکشی' پڑھ کر افسانہ نگار کی دور اندیشی پر تعجب ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ ہندستانی ذرائع ابلاغ اور قانون میں نویں صدی کے بعد چھایا رہا جب کہ یہ افسانہ دیپک بُدکی کا پہلا افسانہ تھا اور ۱۹۷۰ء میں بعنوان سلمیٰ لکھا گیا تھا۔

افسانہ'ادھورے چہرے' جدید سماج میں رونما ہو رہے ان مسائل کو زیر بحث لاتا ہے جو شہری کلچر، کنبوں کی شکست و ریخت اور پہچان کے بحران کا نتیجہ ہے، جس کو بقول ایلون ٹوفلر 'استعمال کرو اور پھینک دو کلچر'(throw away culture) کہا جاتا ہے۔ ایسے کلچر میں جو مصیبتیں بیویوں اور معصوم بچوں کو اٹھانی پڑتی ہیں اس کو دردمندی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کلچر میں یگانگت لمحوں میں بیگانگی میں بدل جاتی ہے اور انسان اتنا سنگ دل ہو جاتا ہے کہ اپنے خون کو پہچاننے سے انکار کرتا ہے۔ مذکورہ افسانے میں افسانہ نگار نے شوہر کے بیوی کو چھوڑ کر دوسری لڑکی کے ساتھ رشتہ جوڑنے اور اس سے بیوی و اولاد کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کو منظر عام پر لایا ہے۔ شوہر کے چلے جانے کے بعد بیوی کو مالی پریشانیوں، رہائش کے مسئلے اور بیٹی نتاشا کی پڑھائی کے مسئلے سے جوجھنا پڑتا ہے۔ باوجود اس کے کہ دونوں میں باہمی رضامندی سے طلاق ہو جاتی ہے، ماں بیٹی کے گوش گزار نہیں کرتی تاکہ وہ پریشاں نہ ہو اور اس کی تعلیم میں حرج نہ ہو۔ آخر کار ایک روز بیٹی اور باپ کا آمنا سامنا ایک پارٹی میں ہوتا ہے جہاں باپ اس کو پہچاننے سے انکار کرتا ہے جبکہ ماں اس کو سمجھاتی ہے کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں بلکہ انکل ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''دریں اثنا سامنے دروازے سے ایک جانا پہچانا آدمی کسی تیس پینتیس سالہ عورت کی کمر میں اپنے بازو حمائل کئے ہوئے چلا آیا اور پھر بھیڑ میں گم ہو گیا۔ نتاشا اس کو دیکھتے ہی تلملا اٹھی۔ وہ بہت دیر تک جل بن مچھلی کی طرح صوفے پر تڑپتی رہی۔ آخر اس سے رہا نہ گیا، ہمت بٹور کر وہ کھڑی ہوئی اور بھیڑ کو چیرتی ہوئی دبے قدموں سے اس آدمی کا پیچھا کرنے لگی۔ اس آدمی کا دھیان اپنی طرف مبذول کرنے کی خاطر نتاشا نے پیچھے سے اس کے کوٹ کے دامن کو کھینچ لیا اور ساتھ ہی رندھی ہوئی آواز میں چلائی۔ پا... پا۔''

(افسانہ'ادھورے چہرے'؛ادھورے چہرے،تیسرا ایڈیشن،ص ۸۰-۷۹)

چونکہ دیپک بدکی کا تعلق کشمیر سے ہے، اس لئے ان کے افسانوں میں کشمیری سماج و ثقافت کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔انھوں نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے'ادھورے چہرے' میں مشمول کہانی 'اچانک' میں کشمیر کے ان ضیافتوں کا ذکر کیا ہے،جن کا اہتمام کشمیر میں خاص موقعوں جیسے شادی بیاہ،تہوار یا کسی شادمانی کے موقعے پر کیا جاتا ہے۔اتنا ہی نہیں کشمیر کی ملواں تہذیب کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔مصنف نے ایک سیر و تفریح کے موقعے پر ظہرانے کا نقشہ کھینچتے ہوئے یوں ان کا ذکر کیا ہے۔

"لنچ ٹفن کیا کھلے کہ ساری فضا کشمیری پکوان سے معطر ہوگئی ،گشتابہ، رستہ، سیخ کباب، یخنی اور مرغ مسلم ایک طرف اور روغن جوش ،قلیہ ،کوفتہ، ندرو (کمل ککڑی)، ساگ اور دم آلو دوسری طرف۔جو کچھ بھی تھا سامنے تھا،اور سبھی مل بانٹ کر کھانے لگے۔" (افسانہ'اچانک'؛ادھورے چہرے،تیسرا ایڈیشن،ص ۱۱۹)

جموں و کشمیر میں مشکلات سے نجات پانے کے لئے مندروں،مسجدوں اور خانقاہوں پر حاضری دینے کا رواج ہے۔اگر کسی کی دلی تمنا پوری نہ ہو یا سخت بیمار ہو یا کسی گھر میں آپسی جھگڑا نہ تھمتا ہو یا پھر روزمرہ کے مسائل سے آدمی پریشان ہو تو ان سے مکتی پانے کے لئے لوگ اکثر ان عبادت گاہوں پر حاضری دینے جاتے ہیں۔ایسا کرنے سے ان کو دلی سکون مل جاتا ہے۔اس کا ذکر دیپک بدکی نے اپنے افسانہ'ریزے' میں کیا ہے۔افسانے میں راکیش احساس کمتری کا شکار ہے اور جب وہ نوکری چھوڑ کر ایم کام فسٹ ایئر میں فیل ہو جاتا ہے تو اس کی بیوی ریکھا اس کو برا بھلا کہتی ہے جس کے سبب راکیش غائب ہو جاتا ہے،اور کہیں سے کوئی سراغ نہیں ملتا تو ریکھا مندروں میں جا کر منتیں مانگتی ہے۔

"ریکھا کا ردعمل نیم پاگلوں جیسا تھا۔مندروں میں شیو جی پر دودھ کی بالٹیاں انڈیل

دیں ، سادھوؤں ، سنیا سیوں اور تانتر کوں کے پاس حاضری دی ، گوشت خوری
چھوڑ دی ، بالکل ویجی ٹیرین بن گئی ، پہلے سوموار اور پھر شکروار کو بھی برت رکھنے لگی
۔مندروں کی گھنٹیاں بجاتے بجاتے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے مگر ان کے گنبدوں
سے کوئی بھی بازگشت سنائی نہ دی۔''

(افسانہ 'ریزے'؛ادھورے چہرے، تیسرا ایڈیشن،ص ۱۳۸)

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ریکھا اور راکیش اپنے اندر جھانکتے کہ جذبات میں بہہ کر انھوں نے بنا سوچے سمجھے شادی کی تھی جبکہ ان دونوں کا کوئی جوڑ ہی نہ تھا، ریکھا لیکچرر تھی اور راکیش ایک معمولی کلرک۔ انجام کار راکیش احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے۔ مفاہمت کے بجائے اور زندگی سنوارنے کے بجائے وہ لڑ پڑتے ہیں اور ایک دوسرے سے دور چلے جاتے ہیں اور لاکھ کوشش کرنے کے بعد بھی وہ یہ کھائی نہیں پاٹ پاتے۔ ایسے ہی مسئلے کی طرف افسانہ 'ادھورے چہرے' میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ افسانے میں نابالغ بیٹی اپنے والدین سے یہ جاننے کی کوشش کرتی ہے کہ سامنے والے فلیٹ کی آنٹی اتنی پریشان اور گم صم کیوں رہتی ہے؟ کوئی بھی شخص صحیح جواب نہیں دے پاتا۔ اس کا باپ کہنا چاہتا ہے کہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے اور جنسی طور پر تشنگی کے شکار ہیں مگر کمسن بیٹی کو ایسا جواب دینے سے ڈرتا ہے،اس لیے شعوری طور پر جواب کو بدل کر کہتا ہے کہ سنیتا بہت تعلیم یافتہ اور اولوالعزم ہے اور اس کے شوہر نے اس کی ترقی کو روک لیا ہے، اس لیے وہ ذہنی انتشار کی شکار ہو چکی ہے۔ خود نتاشا کا خیال ہے کہ سنیتا کو اپنے بوائے فرینڈ کے بچھڑنے کا غم کھائے جا رہا ہے۔ مگر اس کے برعکس اس کی ماں یوں جواب دیتی ہے:-

''دراصل سونیتا کی شادی کو چھ سال ہو چکے ہیں، آج تک اس کی گود سونی ہے
۔ بہت علاج معالجہ کروایا، پیروں فقیروں کے در پر حاضری دی۔ گنڈے تعویز پہنے
۔''　　　　　('ادھورے چہرے'؛ادھورے چہرے، تیسرا ایڈیشن،ص ۴۷)

ان کے علاوہ افسانہ 'جاگو' میں ایک پاگل کردار انسانی وتیرہ پر طنز کرتا ہے کہ کیسے انسان کذب کا ساتھ دیتا ہے اور غلامی کی زنجیریں پہننا پسند کرتا ہے جس سے سماج کی قدروں پر منفی اثر پڑتا ہے، 'بٹی ہوئی عورت' میں عورت کی دوشاخہ شخصیت کو اجاگر کیا گیا ہے جب کہ اس کے برعکس 'بکھرے ہوئے لمحوں کا سراب' کی عورت خود اعتمادی سے کام لے کر کامیابی اور کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیتی ہے۔ 'کینچلی' میں ان لوگوں کی زندگی پیش کی گئی ہے جو 'پدرم سلطان بود' کہہ کر خود عظمت پارینہ پر زندہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ افسانہ 'ایک ہی خط' میں ڈاکٹروں کی لاپرواہی پر زور دیا گیا ہے کہ کیسے وہ طبقہ جو مسیحا ہونے کا دعوی کرتا ہے، انسان کو مزید مصیبتوں میں ڈال دیتا ہے۔ ایسے لوگ سماج کے لیے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ 'کالا گلاب' میں صنعتی انقلاب سے پیدا شدہ مسائل اور 'ادھ کھلی' میں غریب بے روزگار مزدوروں کو معاشی طور پر استحصال کرنے کی عکاسی کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر دیپک بدکی نے مذکورہ افسانوی مجموعے میں کسی مخصوص طبقے یا فرقے کے بجائے عام سماج کو پیش آرہے مسئلوں پر بڑی ہنر مندی سے روشنی ڈالی ہے۔ مجموعے کا مطالعہ کرنے سے یہ احساس ہوتا ہے کی مصنف نے اپنے افسانوں کے ذریعے نہ صرف سماج میں پھیل رہی بدعتوں کو ظاہر کیا ہے بلکہ بھلائیوں اور مثبت افعال کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں کشمیر کی ثقافت کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

☆☆☆

عیسیٰ محمد، ریسرچ اسکالر، روم نمبر ۲۰۴، ہوسٹل این آر ایس، حیدرآباد یونیورسٹی، تیلنگانہ-500046 :مطبوعہ ماہنامہ بیباک، مالیگاؤں، جون ۲۰۱۷ء

دیپک بُدکی کی افسانچہ نگاری
-مٹھی بھر ریت کے تناظر میں-

- ڈاکٹر ظفر عبداللہ دوانی

مغرب کی مشہور و مقبول ترین صنف افسانہ نگاری کو بام عروج تک پہچانے میں اردو فکشن نے جو رول ادا کیا ہے وہ نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ قابل تحسین بھی ہے۔ مغرب میں اس صنف کو شارٹ سٹوری (Short Story) کے نام سے جانا جاتا ہے اور اردو ادب میں افسانہ نگاری کے نام سے یہ صنف مشہور ہوئی ہے۔ ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے افسانے کے بطن سے نکلی ہوئی ایک اور نئی صنف نے جنم لیا ہے جو اردو ادب میں کئی ناموں سے مشہور و مقبول ہو رہی ہے۔ اس نئی صنف کو ادب کی دنیا میں افسانچہ، منی افسانہ اور منی کہانی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

دیپک بدکی کا شمار نئی نسل کے ممتاز و مشہور فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے فکشن کی دُنیا میں افسانہ نگاری پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی ہے۔ دیپک بُدکی کی ادبی زندگی کا آغاز 1970ء میں ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ 'سلمیٰ' روزنامہ ہمدرد سرینگر میں شائع ہوا، پھر ۱۹۷۸ سے ۱۹۹۶ء تک وہ قلمی تعطل کا شکار رہے مگر تب سے ان کا یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ ان کے افسانے ہندو پاک کے مختلف رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ افسانے کے علاوہ بُدکی تنقیدی مضامین اور تبصرے بھی لکھتے ہیں۔ آج تک ان کے افسانوں کے چھ مجموعے 'ادھورے چہرے'، 'چناروں کے پنچے'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، 'ریزہ ریزہ حیات'، 'روح کا کرب' اور 'اب میں وہاں نہیں رہتا' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۶۷/صفحات پر مشتمل ان کا ایک خوبصورت افسانچوں کا

مجموعہ 'مٹھی بھر ریت' ۲۰۱۵ء میں میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹر بیوٹرس، بٹہ مالو، سرینگر کشمیر ۱۹۰۰۰۹ نے شائع کیا ہے۔

مٹھی بھر ریت کی کہانیوں میں آسان اور بامعنی زبان کا استعمال ہوا ہے۔ یہ کہانیاں شروع ہوتے ہی قاری کو اپنی کشش کا احساس دلاتی ہے۔ دیپک بدکی نے اپنی ان چھوٹی کہانیوں میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعے اپنا اور دوسروں کا کرب اُبھارا ہے۔ رومانویت اور حقیقت دونوں کو اپنی کہانیوں میں سمویا ہے۔ افسانوی دُنیا سے اس طرح کے لگاؤ نے نہ صرف بدکی کو افسانہ نگار سے افسانچہ نگار بنا ڈالا بلکہ انھیں یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ کشمیر کے پہلے وہ ادیب ہے جنہوں نے افسانچوں کا مجموعہ بھی شائع کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ نمبر ۲۱ ر پر 'افسانچے کا مستقبل' کے عنوان سے مصنف نے افسانچے کے لیے جن شرائط کو لازمی قرار دیا ہے وہ نہ صرف افسانچے کی مبادیات سے آگاہ کراتی ہیں بلکہ آنے والے قلم کاروں کے لیے بھی راہیں ہموار کرتی ہیں۔ بدکی نے اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل شرائط کو لازمی قرار دیا ہیں۔

۱: پلاٹ مختصر ترین ہو۔ اس میں زندگی کا ایک واقعہ صرف سما سکتا ہے۔
۲: افسانچے میں ارتقاء کی کوئی گنجائش نہیں۔
۳: منظر نگاری اور بیانیہ سے گریز کرنا چاہیے۔
۴: تعلیق Suspense ہو مگر مختصر۔
۵: زماں ومکاں کے لحاظ سے ایک ہی نقطے پر فوکس کرنا چاہیے۔
٦: افسانچہ کوئی لطیفہ نہیں جسے قارئین کی دل جوئی کے لیے لکھا یا سنایا جائے۔

علاوہ ازیں مصنف نے اس صنف کو مزید فروغ بخشنے کے لیے اس سے بطور فیشن یا تفریح نہیں بلکہ بحیثیت سنجیدہ صنف اپنانے پر زور دیا ہے۔

مذکورہ مجموعے میں ۱۰۴ افسانچے شامل ہیں جو مختلف عنوانات پر مبنی ہیں۔ ان کہانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ عنوان اور موضوع دونوں اعتبار سے قاری کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں اور ہر موڑ پر تجسس بڑھاتے ہیں۔ چند سطور پر مشتمل یہ کہانیاں اپنے اندر کئی سوالات اُٹھاتی ہیں۔ بعض اوقات ایسی کہانیاں بھی سامنے آتی ہیں جو تاریخ کے کئی گوشوں پر از سر نو سوچنے کی دعوت دیتی ہیں۔ مجموعے میں شامل کچھ کہانیاں مختلف مذاہب سے جڑے ہوئے عقیدوں کو بھی چیلنج کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر افسانچہ 'سوال' میں دو آدمیوں کی بحث اس بات پر ہوتی ہے کہ اگر آدم کو نافرمانی کے سبب بہشت سے نکالا گیا تو سزا پوری امت کو کیوں؟ یہ سوال اس افسانچہ کا بنیادی قصہ بھی ہے اور مقصد بھی۔ ایک طرفہ دیکھا جائے تو یہ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے عقیدت کو چھیڑتا ہے لیکن وہی دوسری طرف یہ منطق پر مبنی (Logical) بھی ہے۔ ایک کی سزا پوری امت کو یہ کہاں کا انصاف ہے۔

دیپک بدکی کی ایسی کہانیوں سے لگتا ہے کہ نہ وہ کسی مذہب کے پرستار ہے اور نا ہی اس کے خلاف۔ بلکہ انہیں جو صحیح لگتا ہے وہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور جو چیز انہیں غلط لگتی ہے وہ اس پر سوال اُٹھاتے ہیں۔ اس طرح کی بے باکی ان کی کہانیوں کو مزید حسن بخشتی ہیں۔

''مٹھی بھر ریت'' کے اس مجموعے میں مصنف نے تقریباً سماج سے جڑے ہوئے ہر ایک مسئلے کو کہانی کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عنوان سے ہی کہانی کا موضوع معلوم ہوتا ہے۔ یہ افسانچے جن عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں وہ بذات خود کافی وسیع میدان رکھتے ہیں مگر بدکی کے فن کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے جس طرح ان موضوعات کو سمیٹا ہے وہ واقعی میں سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے برابر ہے۔

اندھے اعتماد (Blind Faith) اور توہم پرستی پر مبنی ان کی ایک اور کہانی 'چمتکار' میں مصنف نے سائنس کی کرامات اور سائنس دانوں کی محنت اور لگن کے ذریعے ٹیسٹ ٹیوب بچے کی پیدائش کو دنیا کے سامنے لانا چاہا ہے، لیکن بدقسمتی کی وجہ سے غیر عقلی اعتقاد میں پھنسے لوگوں نے

سائنس کی اس محنت کو سراہنے کے بجائے اس سے بھی بھگوان کا کرشمہ قرار دیا۔ ملاحظہ ہو افسانچہ:

''پاپا آج چمتکار ہوا، ایک امریکی سائنسدان نے ٹیسٹ ٹیوب میں بچہ پیدا کر لیا۔''

''واہ رے بھگوان تیرے جلوے بھی ہزار۔۔۔۔۔ بیٹے یہ سب اسی بھگوان کی مایا ہے''

بُدکی کے بے باک قلم نے لفظ 'انصاف' کی ایک نئی تعریف پیش کی ہے اور اس طرح ارباب حکومت کو بھی نہیں بخشا ہے۔ کہانی 'انصاف' میں پروفیسر نے جب طلباء سے سوال کیا کہ انصاف کیا ہوتا ہے۔ سب سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے مگر جو جواب آخری بنچ پر بیٹھے طالب علم نے دیا وہ ایک ایسی سچائی اور امر حقیقت ہے جس سے شاید ہی کوئی آنکھیں چرا سکتا ہے۔

''سر انصاف وہ ہوتا ہے جو حکمران کی خوشنودی کا باعث بن سکے اور محکوم کو تسلیاں دیتا رہے۔''

مصنف کے قلم سے نکلے ہوئے یہ چند جملے ہزاروں سوال پیدا کرتے ہیں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل عام کی بھی گواہی دیتے ہیں۔ یہ کسی ایک ملک یا فرد کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ پوری دُنیا میں بادشاہ کی خوشنودی کے لیے ہزاروں اور لاکھوں غریبوں اور محکوموں کی امنگوں، خوابوں اور جوانیوں کا سودا ہوتا ہے۔

دیپک بدکی نے اس مجموعے میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ذریعے ایسے مسائل کی طرف بھی ہماری توجہ دلائی ہیں جن سے ہماری ازدواجی زندگی، آنے والی نسل اور ذاتی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ ایسے مسائل میں بُری عادتوں کا شکار ہونا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ مجموعے میں شامل کہانی 'سگریٹ' دراصل سگریٹ سے ہونے والی تباہ کاری کو بیان کرتی ہے۔ جوانی میں سگریٹ پینا ایک نوجوان کے لیے نہ صرف باعث فکر کی بات ہوتی ہے بلکہ اپنی معشوقہ کے سامنے پیتے وقت اسے اپنے آپ میں اور وقت کے حاکم میں بالکل فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اور یہی سگریٹ جب اس کی ازدواجی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو پھر لڑائی اور جھگڑوں کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں

ہوتا۔ بعض اوقات انسان اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہیں کہ پوچھنے والا دھنگ رہ جاتا ہے۔ بیوی کا اصرار کہ سگریٹ چھوڑ دو اور اس پر شوہر کا جواب ملاحظہ کیجیے:

''آج میں ایک نئے دوست کے کہنے پر پرانے دوست کو چھوڑ دوں تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ کل میں کسی اور کے کہنے پر تمھیں چھوڑ دوں۔''

مختصر یہ کہ ان افسانچوں سے دیپک بدکی کی تخلیقی صلاحیت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کا انداز بیان سلیس وشستہ ہے۔ انھوں نے روایت سے ہٹ کر نئے موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ اردو ادب اور اردو زبان کے فروغ میں معاون ثابت ہوگا۔

☆☆☆

《مضمون 'دیپک بدکی کی افسانچہ نگاری - مٹھی بھر ریت کے تناظر میں'؛ مضمون نگار ڈاکٹر ظفر عبداللہ وانی، شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی میں بطور گیسٹ لکچرر کام کرتے ہیں۔

دیپک بُدکی-ادبی کارنامے

-راہی ریاض

دیپک بُدکی کی ادبی زندگی پر نظر ڈالنے سے پہلے ان کے تعلیمی پس منظر پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔وہ بنیادی طور پر سائنس کے طالب علم تھے اور بی ایس سی آنرس (بوٹنی) کرکے انھوں نے ایم ایس سی (بوٹنی) کا امتحان کامیاب کیا۔کچھ مصلحت رہی ہوگی کہ انھوں نے آگے ڈاکٹریٹ کرنے کے بجائے بی ایڈ میں داخلہ لیا اور اس میں کامیابی حاصل کرلی۔انھی دنوں ان کے پھُپھیرے بھائی کی موت واقع ہوئی جس نے ان کو بہت متاثر کیا۔اسی رات کو انھوں نے ایک ڈرامہ 'بندھن' کے نام سے تحریر کیا جس میں انھوں نے کہیں انگریزی، کہیں ہندی اور کہیں اردو کے الفاظ لکھے کیونکہ انھیں ان میں سے کسی بھی زبان پر دسترس حاصل نہ تھی۔ساتھ ہی کچھ تک بندی بھی کرلی۔مگر یہ ڈرامہ وقت کی گردش کے ساتھ تلف ہوگیا لیکن ان کے دل میں تخلیقی چنگاری چھوڑ گیا۔کزن کی رحلت سے کئی برس پہلے ان کی ماں بھی مالک حقیقی سے جا ملی تھی۔اس وقت ان کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔پھر گھر میں مالی پریشانیاں بھی بہت بڑھ گئی تھیں اور والد تنہا زندگی کا مقابلہ کررہے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ان کے حساس ذہن نے اظہار کا وسیلہ ڈھونڈا اور وہ ادب کی جانب راغب ہوگئے۔ایوننگ کالج میں اردو سیکھی، جامعہ علی گڑھ کے ادیب اور ادیب ماہر امتحانات پاس کیے۔ادیب کامل اس لیے رہ گیا کہ ملازمت کی وجہ سے چنڈی گڑھ جانا پڑا۔

دریں اثنا سرینگر کشمیر سے شائع ہونے والے چند اخبارات، جہان نو، نوجیون، عقاب اور ہمارا کشمیر کے ساتھ مختصر مدت کے لیے بحیثیت کارٹونسٹ اور کالم نویس کام کرتے رہے۔ہفتہ وار 'عقاب' کے ساتھ تو سال بھر بطور جائنٹ ایڈیٹر منسلک رہے۔اس طرح ایک طرف وہ اردو سیکھ

رہے تھے اور دوسری طرف اردو میں کالم نگاری اور افسانے لکھنے لگے۔ دوردرشن، سرینگر اور آل انڈیا ریڈیو کی یووانی اور جنرل سروس کے پروگراموں خاص کر مباحثوں میں بھی شرکت کرتے رہے اور کئی پروگراموں میں بطور اینکر اور کوئز ماسٹر بھی شرکت کی۔

• ۱۹۷۰ء میں پہلا افسانہ 'سلمیٰ' کے نام سے ہمدرد سرینگر میں شائع ہوا۔ اس افسانے کو شائع کرنے کے لیے انھیں انوکھے تجربے سے گزرنا پڑا۔ گاندھی کالج میں، جہاں وہ بی ایڈ کی تعلیم پا رہے تھے، میں ایک ڈبیٹ کا انعقاد ہوا تھا۔ موضوع تھا 'گورونانک اور ان کی تعلیمات'۔ دیپک بُدکی کے لیکچر کو سامعین نے بہت سراہا تھا مگر انھیں انعام نہیں ملا۔ اس حوالے سے فرماتے ہیں کہ بہت مایوس ہوگیا اور گھر واپس جا کر پہلا افسانہ قلم بند کیا۔ افسانہ دوبارہ خوشخط لکھا لیکن بہت کوشش کے باوجود ٹائٹل نہیں سوجھا۔ پھر دوسرے دن سرینگر کے مقبول ترین روزنامہ 'آفتاب' کے دفتر پہنچ گئے۔ بے بس ہوکر گیٹ پر ہی افسانے کی ہیروئن کا نام چپکا دیا اور اندر جا کر خواجہ ثنااللہ بٹ سے ملا۔ خواجہ صاحب کسی آدمی کے ساتھ گفتگو میں محو تھے، میں نے سلام عرض کی، انھوں نے جواب دے کر پوچھا کہ کس لیے آئے ہو۔ میں نے مدعا بیان کیا۔ انھوں نے نام پوچھا اور میرا نام سن کر اور یہ جان کر کہ میں کشمیری ہوں تحقیرانہ لہجے میں کہا کہ کشمیری ہو تو کشمیر زبان میں لکھو، کشمیریوں کے لیے اردو لکھنا مشکل ہے۔ میں نے ندامت سے درخواست کی کہ جناب، آپ افسانہ دیکھ لیجیے، اچھا لگے تو چھاپ لیجیے۔ انھوں نے افسانے کا پہلا پیراگراف پڑھا اور حیرت سے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''لگتا ہے یہ افسانہ پاکستان کے ماہنامہ ماہ نو سے نقل کیا گیا ہے۔'' میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا کیونکہ پاکستانی رسالے تو میری نظر سے کبھی گزرے ہی نہ تھے۔ سو انھوں نے رکھ لیا مگر کہا کہ دو تین مہینے لگیں گے۔ اتنی دیر انتظار کرنا میرے لیے ناممکن تھا سو افسانہ واپس لے کر روزنامہ ہمدرد کے دفتر میں چلا گیا۔ ہمدرد کے ایڈیٹر صاحب نے افسانے کو بلا تاخیر دو قسطوں میں اتوار کے ادبی ایڈیشن میں چھاپ لیا۔ میری تو خوشیوں کا ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ پھر سال بھر روزنامہ آفتاب، پولیٹکل ٹائمز، نشیمن، عقاب وغیرہ میں میری نگارشات چھپتی رہیں۔ اُدھر جموں کے ہفتہ وار 'رفتار'، جس کے ایڈیٹر

معروف افسانہ نگار موہن یاور تھے، نے میری کہانی 'کینچلی' چھاپ لی اور ماہنامہ تعمیر ہریانہ نے 'ادھورے چہرے' شائع کی۔

دفتری مصروفیات اور دیگر مصلحتوں کے سبب ۱۹۷۸ء میں دیپک بُدکی کا قلم تعطل کا شکار ہوگیا۔ البتہ ۱۹۹۶ء سے انھوں نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ آج تک تقریباً ۱۰۰/ افسانے تحریر کیے ہیں جو ہندوستان، پاکستان اور دیگر مغربی ممالک کے معتبر رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کئی افسانے ہندی، کشمیری، گوجری (پہاڑی)، انگریزی، مراٹھی اور تیلگو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ چند ایک افسانے دوردرشن پر بھی ٹیلی وائز ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً ۵۵/ تنقیدی مضامین اور ۲۵۰/ کتابوں پر تبصرے بھی قلم بند کیے ہیں۔ حال ہی میں کافی عرصے تک اردو ترقی بورڈ نئی دہلی کے ہفتہ روزہ 'ہماری زبان' نئی دہلی کے لیے مختلف کتابوں پر تبصرے رقم کرتے رہے۔

دیپک بُدکی کی مندرجہ ذیل افسانوں کے مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں:

(۱) ادھورے چہرے۔ اس مجموعے کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۹ء میں انٹرنیشنل پبلشرز، دریا گنج نے شائع کیا۔ پھر اس کی اشاعت دوم ۲۰۰۵ء میں عمل میں آئی۔ یہ ایڈیشن مصنف نے خود ہی 'چنار پبلی کیشنز'، بوڑی، جموں کے ذریعے شائع کیا۔ ۲۰۱۴ء میں مجموعے کی ساری کاپیاں تقسیم ہونے کی وجہ سے اس کا تیسرا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا۔ اس مجموعے میں ۱۶/ افسانے شامل ہیں جن میں اکثریت ان افسانوں کی ہے جو بدکی صاحب نے ابتدائی زمانے میں لکھے تھے مگر بعد میں نذرِ آتش کیے تھے۔ ان افسانوں کو انھوں نے از سرِ نو لکھا ہے۔ کچھ ایک تو نئے بھی ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ 'سلمیٰ' بھی بہ عنوان 'خودکشی' شاملِ کتاب ہے۔ مجموعے کا پیش لفظ شہرت یافتہ جدید افسانہ نگار انیس رفیع نے تحریر فرمایا ہے۔

(۲) چنار کے پنجے۔ یہ دوسرا مجموعہ پہلی بار ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ ناشر انٹرنیشنل پبلشرز، دریا گنج، دہلی تھے۔ اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کیا۔ اس مجموعے میں ۱۹/ افسانے شامل ہیں جن میں سے اکثر کشمیر پنڈتوں کی ہجرت کے

تعلق سے لکھے گئے ہیں۔ چند ایک انسانی نفسیات پر مبنی ہیں۔ اس مجموعے کی بھی خوب پذیرائی ہوئی۔

(۳) زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا جو میزان پبلشرز، سرینگر کشمیر نے شائع کیا۔ اس مجموعے میں ۲۳ر افسانے شامل ہیں۔ اس افسانوی مجموعے میں موضوعات کی گوناگونیت نظر آتی ہے، چند ایک افسانے کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں، کچھ ایک سماجی مسائل سے اور کچھ ایک انسانی نفسیات کے بارے میں ہیں۔

(۴) ریزہ ریزہ حیات کا پہلا ایڈیشن ۲۰۱۰ء میں میزان پبلشرز، سرینگر کشمیر نے شائع کیا۔ اس کا ٹائٹل افسانہ کشمیر سے متعلق ہے جبکہ کئی افسانے رومانی ہیں اور چند ایک سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔

(۵) افسانوی مجموعہ 'روح کا کرب' ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا، اس افسانوی مجموعے میں بھی موضوعات کا تنوع صاف طور پر نظر آتا ہے۔ یہ مجموعہ بھی میزان پبلشرز نے شائع کیا ہے۔

(۶) 'مٹھی بھر ریت' افسانچوں کا مجموعہ ہے جو میزان پبلشرز، سرینگر نے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا۔ اس میں سو سے زائد افسانچے شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً ہندستان اور پاکستان میں مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

مذکورہ بالا افسانوی مجموعوں کے علاوہ تنقیدی مضامین وتبصروں پر مبنی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ سبھی کتابیں میزان پبلشرز، سرینگر نے ہی شائع کی ہیں۔ نام یوں ہیں:

(۱) عصری تحریریں [۲۰۰۶ء]

(۲) عصری شعور [۲۰۰۹ء]

(۳) عصری تقاضے [۲۰۱۳ء]

دیپک بُدکی کی مزید تین چار کتابیں مختلف ناشروں کے پاس منظر عام پر آنے کا انتظار کر رہی ہیں۔ نام یوں ہیں؛ اب میں وہاں نہیں رہتا (افسانوی مجموعہ)؛ عصری تناظر (تنقیدی

مضامین وتبصروں کا مجموعہ)؛اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار (تحقیق)؛ادبی مباحث (تنقیدی مضامین)۔ادھورے چہرے اور چنار کے پنجے کے ہندی ایڈیشن بھی ۲۰۰۵ء اور ۲۰۱۰ء میں منصۂ شہود پر رونما ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ بدکی صاحب کا انٹرنیٹ پر ذاتی بلاگ چل رہا ہے جس کا آئی ڈی یوں ہیں: budki.blogspot.com

دیپک بُدکی ادبی سیمناروں میں بھی شرکت کرتے رہے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱)'برصغیر میں اردو زبان وادب۔کل آج اور کل'[اگست ۲۰۰۷ء]، کشمیر یونیورسٹی کے زیر اہتمام سہ روزہ سیمنار میں شرکت کی۔اس سیمنار میں انھوں نے مضمون 'جموں وکشمیر میں اردو افسانہ' پڑھا تھا۔

(۲)'اردو کا سیکولر مزاج'[مارچ ۲۰۰۸ء]۔سنٹر آف پروفیشنل سٹڈیز ان اردو، جموں یونیورسٹی کے زیر زہتمام دوروزہ سیمنار میں شرکت کی تھی۔اس سیمنار میں انھوں نے 'جموں وکشمیر کے افسانوی ادب میں قومی یکجہتی کے عناصر' کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا تھا۔

(۳)'جموں وکشمیر میں اردو، ماضی، حال اور مستقبل'[جنوری ۲۰۰۹ء]۔سنٹر آف پروفیشنل سٹڈیز ان اردو، جموں یونیورسٹی کے زیر زہتمام دوروزہ سیمنار میں شرکت کی تھی۔اس سیمنار میں انھوں نے 'کشمیر میں اردو۔ماضی، حال اور مستقبل' کے عنوان سے پیپر پڑھا تھا۔

(۴)این جی او 'لہر' کی جانب سے منعقدہ 'توی کنارے-جموں ادبی میلہ' میں ۲۷-۲۶ دسمبر 2015ء کو ابھینو تھئیٹر میں شرکت کی اور پینل ڈسکشن میں حصہ لیا۔عنوان تھا 'عصری ادب کے رجحانات-ظاہر کیا اور پوشیدہ کیا!'۔

(۵)بھوپال میں مدھیہ پردیش اکادمی (محکمہ ثقافت) کی جانب سے منعقدہ تقریب 'افسانے کا افسانہ' بتاریخ ۳۰/اپریل ۲۰۱۶ء میں افسانہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' پڑھ لیا۔اس کے بعد سرونج میں انتساب پبلی کیشنز اور سدبھاونا منچ کی جانب سے منعقد ہوئی 'ایک شام دیپک بُدکی

کے نام' میں شرکت کی اور وہاں افسانہ 'ایک انقلابی کی سرگزشت' پڑھ لیا۔

(٦) مدھیہ پردیش اردو اکادمی (محکمہ ثقافت) کی جانب سے منعقدہ کل ہند سیمنار 'اردو فکشن سمت اور رفتار' بروز ۱۸/۱۷ اکتوبر ۲۰۱٦ء کو بھوپال میں شرکت کی۔ سیمنار میں انھوں نے مضمون 'عصر حاضر میں فکشن کے جہات' پڑھ لیا۔

دیپک بدکی پر کئی رسالوں نے گوشے اور خصوصی نمبر نکالے ہیں؛ تفصیل یوں ہے:

(۱) شاعر ممبئی ستمبر ۲۰۰۴ء، (گوشہ)

(۲) انتساب سرونج ۲۰۰٦ء، (گوشہ)

(۳) اسباق پونے جولائی ۲۰۰۷ء (گوشہ)

(۴) سہ ماہی انتساب عالمی (دیپک بُدکی نمبر) سرونج، جولائی تا ستمبر ۲۰۱٦ء

قلم کار کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر کئی طالب علموں نے تحقیقی مقالے بھی لکھے ہیں:

(۱) 'دیپک بدکی کی افسانہ نگاری' - مقالہ نگار ڈاکٹر جاوید اقبال شاہ۔ برائے ایم فِل، جموں یونیورسٹی۔ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

(۲) 'دیپک بدکی کے افسانوں میں نسوانی کردار' - مقالہ نگار محمد امین نجار۔ برائے ایم فِل، شعبہ اردو، سکول آف ہیومنٹیز، یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد ۵۰۰۰۴٦، آندھراپردیش

(۳) 'دیپک بدکی کے تخلیقی افکار کا تنقیدی مطالعہ' - مقالہ نگار ڈاکٹر شیخ صفیہ بانو اختر حسین۔ ایم ایس یونیورسٹی، بروڈہ، کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ۲۰۱۵ء میں تفویض ہوگئی۔

☆☆☆

مضمون 'دیپک بُدکی کے ادبی کارنامے'؛ مضمون نگار راہی ریاض (اصل نام: ریاض احمد نجار)

دیپک بدکی: ہجرتوں کا مصور

-امیر حمزہ

دیپک بدکی کی شخصیت افسانے کی دنیا میں منفرد شناخت کی حامل شخصیت ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جب افسانہ کو افسانہ نگار ایک نئی جہت عطا کرنے میں لگے ہوئے تھے اسی عہد میں دیپک بدکی نے اپنا پہلا افسانہ 'سلمیٰ' لکھا۔ جو ہمدرد سرینگر سے شائع ہوا تھا۔ اس دور کی ادبی تحریکیں اور رجحانات جو ہر ایک افسانہ نگار کو اپنے دامن میں سمیٹ رہے تھے وہیں دیپک بدکی خود کو ان رجحانات سے دور رکھتے ہوئے اپنا راستہ خود منتخب کر رہے تھے۔ انہوں نے افسانوں سے علامت ابہام اور تجریدیت کے زور کو کم کر کے اس میں کہانی پن پیدا کیا اور اس کو قاری سے قریب تر کیا جس سے ان کے افسانوں کا انداز نگارش بہت ہی سادہ، آسان، سہل اور زود فہم ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا ایک عام قاری بھی ان کے افسانوں سے وہ لطف اٹھاتا ہے جو ایک خاص قاری کے حصہ میں آتا ہے۔ اس طریقے سے دیپک بدکی فوری طور پر اس کو اپنے خیالات و احساسات کا ہم شریک بنا لیتے ہیں۔

موصوف کے چھ افسانوی مجموعے؛ 'ادھورے چہرے'، جس کے اردو میں اب تک تین ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں اور ایک ایڈیشن ہندی میں بھی طبع ہوا ہے، 'چنار کے پنجے' (اشاعت اول ۲۰۰۵ء) جس کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور ہندی میں بھی شائع ہو چکا ہے، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی (۲۰۰۷ء)، 'ریزہ ریزہ حیات' (۲۰۱۰ء)، 'روح کا کرب' (۲۰۱۵ء)، 'اب میں وہاں نہیں رہتا' (۲۰۱۷ء) اور ایک افسانچوں کا مجموعہ 'مٹھی بھر ریت' (۲۰۱۵ء) منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ تنقیدی مضامین اور تبصروں پر مشتمل تین کتابیں (عصری تحریریں، عصری شعور اور عصری تقاضے)

منظر عام پر آ چکی ہیں اور دو کتابیں زیر طبع ہیں۔ان کے افسانوں پر دو مقالے ایم فل کے اور ایک پی ایچ ڈی کا لکھا جا چکا ہے جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

'ادھورے چہرے' میں شامل سارے افسانے اپنے موضوع کے اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔'جاگو' اور 'ادھورے چہرے' میں معاصر دور کے کرب اور اضطراب کی جھلک نظر آتی ہے۔ان میں سے افسانہ 'جاگو' ایمرجنسی کے دوران لکھا گیا تھا۔'ادھورے چہرے' میں اس معاشرہ کی عکاسی کی گئی ہے جہاں رشتے ناطے عارضی اور ہنگامی بن کر رہ گئے ہیں۔جہاں اجنبی لوگ دیکھتے ہی دیکھتے ایک دوسرے کے رشتہ دار بن جاتے ہیں اور اصل رشتوں کا خون حالات بدلتے ہی سفید ہو جاتا ہے۔انجام کار انسان اس بھری دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے۔افسانہ 'ڈرفٹ وُڈ' ایک معصوم لڑکی کی امنگوں اور مسکراہٹوں کا مدفن ہے۔اس کہانی میں وہ لڑکی گھریلو جنسی زیادتی کا شکار ہوتی ہے۔ایسے جنسی واقعات عموماً ۹۵ رفیصد پوشیدہ رکھے جاتے ہیں اور ان میں کئی ذہنی مرض میں مبتلا ہو کر خودکشی کی مرتکب ہو جاتی ہے جبکہ اس کہانی میں سُمن خود کو ڈرفٹ وُڈ کی مانند دریا کے موجوں کے حوالے کر دیتی ہے اور مردوں کو آلۂ کار بنا کر زندگی ہموار کرتی رہتی ہے۔اس افسانہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ایسی صورت حال میں لڑکیاں اپنے آپ سے حقارت کرتی ہیں اور پستی کی گہرائیوں میں گر جاتی ہیں مگر وہ اپنے مغموم دل کو قہقہوں کے پھاہے لگاتی رہی، جسمانی قربتوں سے اپنے مضروب ذہن کو جھوٹی تسلیاں دیتی رہی اور مردوں کو آلۂ کار بنا کر اپنی زندگی کی راہیں ہموار کرتی چلی گئی''۔

'رشتوں کا درد' آج کے کرم خوردہ سماج کی تصویر ہے جہاں جھوٹ، مکر و فریب اور جرائم کا بول بالا ہے۔اس کہانی میں ایک ایسا سماج ہے جہاں مجرم بری ہوتا ہے اور معصوم تختۂ دار پر لٹکایا جاتا ہے۔

'چنار کے پنجے' افسانوی مجموعہ میں وقت کے اہم موضوعات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے

وہیں ان کے افسانوں کا ایک اہم موضوع کشمیر کے حالات اور کشمیر سے ہجرت کے مسائل ہیں۔ اگر چہ ہجرت کے تعلق سے بہت سے افسانے ہماری نظروں سے گزرے ہوں گے لیکن مصنف کی تحریروں میں جو کشمیری پنڈتوں کے ہجرت کا کرب نظر آتا ہے وہ ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔'چنار کے پنجے' میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں اس موضوع کو پیش کیا گیا ہے اور کئی افسانوں میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ افسانہ 'چنار کے پنجے' میں اس کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اقتباس:

> ''غربت میں اکثر وہ مرجھا جاتا ہے۔ نیست ونابود ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔ اور پھر رہ جاتی ہیں یادیں۔ ڈھیروں ساری یادیں۔ تواریخ کی کتابوں میں مدفن یادیں۔ فرعونی تہذیب کے یادیں۔ یونانی تہذیب کی یادیں۔ یا پھر رہ جاتے ہیں فوسل اور آثار قدیمہ۔ ڈائنوسورس اور آرکیوپیٹرکس، اسٹون ہینج اور جنتر منتر یا پھر رہ جاتے ہیں لِونگ فوسل۔ گنگو بائلوبا اور ہم لوگ جو زندہ لاشوں کی طرح اپنی نسل کو گھسیٹتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔''

اس طرز کے کئی اور افسانے ہیں جن میں کلچر اور ہجرت کی کشمکش ایک ساتھ ملتی ہے مثلاً 'ایک نہتے مکان کا ریپ'، 'وفادار کتا'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی'، 'کاگ پورنیا' اور 'سفید کراس'۔ 'ایک نہتے مکان کا ریپ' میں موصوف نے محض ایک تالے کے توسط سے انسانی فطرت میں کج روی اور لالچ کو بے نقاب کیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں مکان مالکن دروازے پر تالا لگاتی ہے اور تین بار جھٹک کر دیکھتی ہے، پھر اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب مکان محفوظ ہے۔ لیکن مکان کے پاس سے گزرنے والے ہر شخص کی رال ٹپکتی ہے کہ نہ معلوم مکان میں کتنا ذخیرہ موجود ہوگا۔ کہ اچانک ایک بندوق بردار پولیس کے ڈر سے مکان کا تالا توڑ کر اندر جا کر چھپ جاتا ہے۔ پھر مکان میں داخل ہونے کے لیے راستے کھل جاتے ہیں اور بظاہر ایک دوسرے سے نظریں بچا کر مکان میں بچی ہر چیز اٹھا کر لے جاتے ہیں یہاں تک کہ کالے کوئلے بھی نہیں چھوڑتے ہیں۔ الغرض اس جڑ سے اکھڑے ہوئے شخص کے گھر کی ہر چیز جڑ سے اکھاڑ لے جاتے ہیں۔ اس افسانہ

کے متعلق وارث علوی لکھتے ہیں:

''ایک نہتے مکان کا ریپ بے مثال افسانہ ہے، یہ اردو میں اپنی نوعیت کا اچھوتا افسانہ ہے''

'کاگ پورنیا' میں مصنف نے ہجرت کو الگ زاویہ سے دیکھا ہے اور مرکزی کردار خود کو کس طرح سنبھالتا ہے (یعنی تسلی دیتا ہے) اس کو بھی اس افسانہ میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس افسانہ سے چند جملے:

''ہاں بیٹے ....ان دنوں ہر سال سائبیریا اور روس کے دیگر شمالی علاقوں سے مہاجر کوے ہزاروں لاکھوں میلوں کی مسافت طے کر کے یہاں چلے آتے ہیں۔ ہم ان کی سواگت کے لیے یہ تیوہار مناتے ہیں۔ تم باہر جا کر دیکھ لو۔ آج کل تمہیں چھتوں پر، دیواروں پر، پیڑوں پر، غرض ہر جگہ کالے کلوٹے کوے نظر آئیں گے جو چونچ سے دم تک کوئلے کی مانند سیاہ ہوتے ہیں۔ (کاگ پورنیا)

الغرض ان کے افسانوں میں ہجرت کا کرب و درد بہت ہی زیادہ نظر آتا ہے۔ آج ہم ایک ایسے افسانہ نگار کے درمیان ہیں جنھوں نے حقیقت کی عکاسی کے لیے کبھی اپنا ضمیر اور قلم کا سودا نہیں کیا۔ اب تک ہم نے ہجرت کے تعلق سے بہت سارا فکشن پڑھا ہوگا لیکن کیا ہجرت وہی ہے جس کو ہم اب تک منٹو، کرشن چندر اور دیگر قلم کاروں کے افسانوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ آخر اس ہجرت سے خود کو کب تک دور رکھیں گے جو سن ۱۹۹۰ء میں کشمیر سے وہاں کی اقلیتوں نے کیا۔ کیا ہم ہجری ادب کو اس کے بغیر مکمل سمجھیں گے، بالکل نہیں! ۔ لہذا آج ہم ایک ایسے افسانہ نگار سے رو برو ہو رہے ہیں جنھوں نے دیگر موضوعات کے ساتھ کشمیر سے ہجرت کے موضوع کو سب سے زیادہ اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

☆☆☆

یہ مقالہ ۶/اپریل ۲۰۱۷ء کو دہلی یونیورسٹی کے اردو شعبہ میں دیپک بدکی کی آمد اور اپنا افسانہ 'پھٹا ہوا البم' پیش کرنے کے موقع پر پڑھا گیا۔

لوح حیات

-مصاعد قدوائی

سوانح نگاری کو اردو میں ایک علیحدہ صنف کا درجہ حاصل ہے۔ یہ ایک غیر افسانوی صنف ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں مولانا حالی اور علامہ شبلی نعمانی نے جب اردو میں سوانح نگاری کا آغاز کیا تو انھوں نے فارسی اور انگریزی دونوں زبانوں میں سوانح نگاری کے جو اصول رہے ہیں ان سے فائدہ اٹھایا۔ حالی کی 'حیات جاوید'، شبلی کی 'الفاروق'، قاضی عبدالغفار کی 'آثارِ ابوالکلام' اور غلام رسول مہر کی 'غالب' اردو میں سوانح نگاری کے قابل قدر ادبی نمونے ہیں۔

سوانح نگاری میں ضروری ہوتا ہے کہ ولادت سے وفات تک زندگی کے تمام اہم واقعات اور کارنامے ایک مرقع کی صورت میں سامنے آجائیں۔ سوانح میں عام طور پر زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق رکھنے والی کسی مشہور اور ممتاز ہستی کے حالاتِ زندگی اور اس کے کارناموں کی روداد بیان کی جاتی ہے۔

آزادی کے بعد اردو ادب میں بہت سی خودنوشتیں تحریر کی گئیں۔ ان میں جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی برات' کافی مقبول ہوئی۔ اس صنف نے بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں ارتقائی منازل طے کیں۔ خاص طور پر اس صنف کو آزادی کے بعد ترقی ملی۔ آزادی سے پہلے اس صنف کے چند نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں مولانا جعفر تھانیسری کی خودنوشت 'تواریخ عجائب (کالا پانی)، جو ۱۸۸۵ء میں منظر عام پر آئی، ظہیر دہلوی کی 'داستانِ غدر' جس میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کا ذکر ہے، خواجہ حسن نظامی کی 'آپ بیتی'، حسرت موہانی کی 'قید فرنگ' اور وزیر سلطان جہاں کی 'نیرنگی بخت' قابل ذکر ہیں۔

خودنوشت سوانح ایک نثری ادبی صنف بھی ہے۔ یہ مصنف کی اپنی سوانح عمری یا پھر آپ بیتی ہوتی ہے۔ خودنوشت کا محور مصنف کی شخصیت ہوتی ہے۔ یہ فن کافی اہم ہے اور دیپک بُدکی نے اپنی سوانح عمری 'لوحِ حیات' میں اس فن کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔

خودنوشت کے ذریعہ صرف ایک فرد کی زندگی کے گوشے ہی نہیں بلکہ اس دور کے متعلق بھی بہت سی معلومات ہوتی ہیں۔ 'لوح حیات' میں بھی کشمیر کی کچھ کھٹی میٹھی یادیں ہیں:

☆ ''کشمیر میں اسلام تیغ وتلوار کے ساتھ ساتھ تبلیغ وترغیب سے پھیل گیا جس کے باعث مخلوط اور گنگا جمنی تہذیب نے نمو پائی۔''

☆ ''مجھے اپنے آپ کو کشمیری کہلانے میں بڑا فخر محسوس ہوتا ہے۔ کشمیری عام طور پر نیک سیرت اور امن پسند ہوتے ہیں۔ کشمیری سے میرا مطلب وہ لوگ ہیں جو وادی کشمیر میں رہتے ہیں یا رہتے تھے خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔''

خودنوشت میں کشمیری پنڈتوں کی ایک طویل فہرست بھی ہے، جنھوں نے حکومت ہند کے اعلیٰ عہدوں پر کام کیا ہے۔

خودنوشت کے ذریعہ نہ صرف کسی شخصیت کی زندگی کے واقعات منظر عام پر آتے ہیں بلکہ اس دور کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی، تمدنی اور ثقافتی پہلو بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ لوحِ حیات اس پیمانے پر کھری اترتی ہے۔ دیپک بُدکی کی ولادت سے بچپن اور لڑکپن کے حالات، ان کے دور کا کشمیر، وہاں کی تہذیب وتمدن کو بڑی خوبصورتی سے تحریر کیا گیا ہے۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ کس قسم کے ماحول میں مصنف کی پیدائش اور پرورش ہوئی:

☆ ''میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اور سری نگر کشمیر کے ایک گنجان آبادی والے محلّے 'وازہ پورہ' کی تنگ وتاریک گلیوں میں پل بڑھ کر یہاں تک پہنچا ہوں۔''

☆ ''میں نے اپنی بنیادی تعلیم گھر کے پاس ہی ایک جبری اسکول میں حاصل کی جس کا نام گانی آٹ منز پرائمری سکول تھا۔...اسکول کیا تھا ایک جھر جھر بھوت بنگلہ

تھا جو باہر سے ایسا لگتا تھا کہ اگر زور دار زلزلہ کا جھٹکا آ جائے تو دھڑام سے زمیں بوس ہو جائے گا۔''

بہترین خودنوشت وہ ہوتی ہے جس میں امانت داری، دیانت داری، سچائی اور صداقت پسندی سے کام لیا جائے اور لوحِ حیات میں یہ عنصر موجود ہیں:

''کئی لوگ کشمیری پنڈتوں کا تقابل یہودیوں سے کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہے کیونکہ یہودیوں نے جس باہمی رواداری، لچک اور ابھرنے کی قوت کا مظاہرہ کیا ہے وہ کشمیری پنڈتوں میں مفقود ہے۔۔۔۔۔ایک کشمیری پنڈت کو دوسرا کشمیری پنڈت ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ دوسرے پنڈت کو اپنا بھائی نہیں اپنا حریف سمجھتا ہے۔''

انسانی زندگی کے کچھ واقعات ولمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں کوئی انسان کبھی فراموش نہیں کر پاتا۔ 'لوحِ حیات' میں کئی ایسے واقعات بھی نظر سے گزرے۔ دیپک بُدکی نے زندگی کے تلخ وشیریں واقعات، مختلف نشیب وفراز اور خوشی اور غم کے لمحات کو بڑی مہارت سے تحریر کیا ہے:

''سات برسوں میں چار قریبی رشتہ داروں کو بچھڑتے دیکھ کر میں کچھ زیادہ ہی حساس ہو گیا تھا۔ موت کے خیال ہی سے کچھ خوف سا لگتا تھا۔''

'ذکر خوباں' کے عنوان سے مصنف نے اپنے زندگی کے سفر میں کئی دوشیزاؤں سے ملاقات کا بھی ذکر بے باکی سے کیا ہے اور نوجوانی کے تجربات بھی بیان کیے ہیں:

''بچپن میں چند جنسی تجربے ہوئے تھے مگر ان کو اہمیت دینا صحیح نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایسی بچکانہ حرکتیں تو ہر کسی سے ہوتی ہیں۔''

وادیٔ کشمیر کے موجودہ حالات پر ان کے دل کا دکھ بھی نظر آتا ہے:

''بدقسمتی سے آزادی کے بعد جموں وکشمیر کے ماحول پر اتنی سیاسی گلٹ چڑھی کہ اس کی اصلیت مسخ ہو کر رہ گئی۔ کشمیر ایک مستقل تنازعہ ابھر کر سامنے آ گیا۔ دوسری جانب ملک کی دیگر ریاستوں میں فرقہ وارانہ جھڑپوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو یہاں کی سیاست پر کافی اثرانداز ہوا۔''

دیپک بُدکی کی خودنوشت 'لوحِ حیات' کا اسلوب عمدہ اور بیانیہ رواں ہے۔اس خود نوشت میں قاری کی حیثیت سے بس ایک بات مجھے مناسب نہیں لگی کہ اسے باب میں تقسیم کر دیا گیا۔لہٰذا ایک دو باب مکمل کرنے کے بعد پھر سے دوبارہ اس دور میں واپسی ہو جاتی ہے۔مثلاً بچپن کے حالات ایک بار پڑھنے کے بعد وہی بچپن کے حالات یا نوجوانی کا دور دیکھنے کے بعد وہی نوجوانی کا دور کسی اور حوالے سے سامنے آجاتا تھا۔اگر یہ خودنوشت بچپن سے تا حال ایک کڑی میں پرودی جاتی اور اسے مختلف باب میں تقسیم نہ کیا جاتا تو یہ ایک اعلیٰ خودنوشت ہوتی۔

پھر بھی دیپک بُدکی کی لوح حیات ایک عمدہ خودنوشت ہے اور مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خودنوشت اردو میں ایک اضافہ ہے۔

☆☆☆

٭تبصرہ 'لوح حیات'، مصاعد قدوائی، ماہنامہ موج اردو، علی گڑھ، جلد۲، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۶۶-۶۵۔

سوانح عمری 'لوح حیات' - ایک جائزہ

-ڈاکٹر رینو بہل

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

(فانی بدایونی)

آغاز سے انجام تک، جنم سے لے کر مرنے تک انسان کی زندگی جیسے جیسے آگے بڑھ جاتی ہے، کردار بدلتے جاتے ہیں، ماحول بدلتا جاتا ہے اور مزاج بدلتا جاتا ہے۔ اس سفر میں کئی لوگ ملتے ہیں، کئی بچھڑتے ہیں مگر سفر جاری رہتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ہر شخص کی زندگی ایک مکمل ناول ہی تو ہے۔ اپنی زندگی کی کہانی کو، اس سے جڑے کرداروں کو، واقعات کو، جذبات کو اگر کوئی افسانہ نگار سوانح حیات کی صورت میں تحریر کرے تو یقیناً وہ کتاب مختلف رنگوں اور خوشبوؤں سے مہک اٹھے گی۔ دیپک بُدکی صاحب کی 'لوح حیات' بھی اسی فہرست میں آتی ہے۔

اردو ادب کی دنیا میں دیپک بُدکی ایک معتبر نام ہیں۔ وہ ایک معروف افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ تاہم انھوں نے تنقید، تحقیق اور تبصرہ نگاری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ سات افسانوی مجموعوں اور سات تنقیدی، تحقیقی اور تبصرہ نگاری کے فن پاروں کے مالک نے خودنوشت سوانح عمری 'لوح حیات' شائع کر ایک نئی صنف میں اپنا جوہر دکھادیا ہے۔

بُدکی صاحب کے افسانوں میں اکثر ان کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس لوح حیات میں افسانوی رنگ کا ذائقہ چکھنے کو ملتا ہے۔ لوح حیات کو ۲۴/ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آغاز شجرۂ نسب سے کیا ہے۔ ان کا تعلق ملک کی اس سرزمین سے ہے جسے جنت کا خطاب عطا

کیا گیا ہے۔ کوئی بھی فرد ایک بار کشمیر کی حسین وادیوں کو اگر اپنی نگاہوں سے دیکھ لے، اس کی فضا میں مہکتی خوشبوؤں کو اگر محسوس کر لے تو یقیناً اس جگہ کو وہ تاعمر فراموش نہیں کر سکتا۔ پھر وہ زمین تو بُدکی صاحب کی جائے پیدائش ہے۔ انسان چاہے عمر کے کسی بھی حصے میں پہنچ جائے، دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے، اپنی زمین کی کشش کبھی کم نہیں ہوتی۔

دیپک بُدکی کا جنم متوسط طبقے کے کشمیری پنڈتوں کے خاندان میں ہوا۔ ان کے اکثر افسانوں میں کشمیر کا ذکر ملتا ہے جس سے ان کے جذباتی لگاؤ کا احساس بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ لوح حیات میں انھوں نے ریاست جموں وکشمیر کی تاریخ، وہاں کی ثقافت، زبان، ریتی رواج اور کھان پان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں قاری کو وہاں کے تیزی سے بدلتے حالات کے بارے میں بڑی باریکی سے روشناس کرایا ہے۔ کچھ ایسی باتوں اور ایسی حقائق سے بھی واقف کرایا ہے جو مقامی لوگ ہی جانتے ہیں اور دور دراز رہ رہے لوگ ان حقائق سے لاعلم ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں کے نتائج اور ان کے اثرات عوام پر جو پڑے، ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ بگڑے حالات کے باعث کشمیری پنڈتوں کو ۱۹۹۰ء میں جبراً اپنا گھر، اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ ہجرت کا کرب بُدکی صاحب کے اندر اس طرح گھر کر چکا ہے کہ افسانوں اور لوح حیات میں اس کا ذکر پڑھ کر ٹیس محسوس کیے بنا نہیں رہ سکتے

کشمیر کی کھٹی میٹھی یادوں کے ساتھ بچپن کی یادیں اور گھر پریوار کی تفصیل بیان کی ہے۔ والدہ کی چھوٹی عمر میں انتقال اور والد کا چار چار بچوں کی پرورش کی خاطر دوسری شادی کرنے سے انکار کرنا ایک بہت بڑا فیصلہ تھا۔ والدین کی طبعیت میں بعد المشر قین تھا جس کے سبب گھر کے ماحول میں کشیدگی رہتی تھی اور اس کا اثر بچوں کی پرورش اور ان کی شخصیت پر پڑنا لازمی تھا۔ دیپک بدکی کے والد بہت ہی خوبیوں کے مالک تھے اور ہر بچے کی طرح بُدکی صاحب کو بھی لگتا تھا کہ ان کے والد جیسا شاید ہی دنیا میں کسی کا والد ہو۔ اس بات کا بھی انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ ''حقیقت یہ ہے کہ پتا جی بچپن میں اپنے والد سے دبتے رہے، جوانی میں اپنی بیوی اور معمری میں اپنے بچوں سے۔ ڈرپوک ہونا، فیصلہ نہ کر پانا، کسی تعمیری کام سے جس میں جوکھم ہو جی چرانا، ان

کی عادت بن گئی۔ اس لیے عمر بھر سسکتے رہے حالانکہ بچوں کو کبھی محسوس نہ ہونے دیا'' (ص ٦٦)۔
چھوٹی عمر میں ماں کو کھو دینے کے بعد دیپک بُد کی کی اصل پرورش ان کی پھوپھی نے کی جو بچپن ہی میں بیوگی سے دوچار ہوئی تھیں۔

پنڈت شام لال صراف کا ان کی زندگی میں بہت بڑا رول رہا۔ وہ نہ صرف ان کے پھوپھا تھے بلکہ ان کے محسن بھی تھے جن کی شخصیت نے انھیں بہت متاثر کیا۔ صراف صاحب پندرہ سال منسٹر رہے اور بعد میں ممبر پارلیمنٹ بن گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان کی شخصیت کے تین پہلو ہوتے ہیں، جسمانی، ذہنی اور روحانی اور ان تینوں میں اعتدال پیدا کرنا انسانی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس طرح وہ کسی بھی شعبے میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ بُد کی صاحب نے اپنے محسن کی باتیں زندگی بھر گانٹھ باندھ کر رکھ لیں۔

کشمیر میں، جس کو جنت کے نام سے جانا جاتا ہے، حالات نے ایسی کروٹ لے لی کہ دھیرے دھیرے یہ گلشن دوزخ کی آگ کی طرح جلنے لگا۔ ایسے نامساعد حالات کو دیکھ کر بُد کی صاحب کا یہ کہنا قابل غور ہے:

> ''حیرت کی بات یہ ہے کہ اس جہنم میں لاکر بھی ہمارے والدین ہم سے اظہار تشکر کی امید رکھتے ہیں گویا کہ انھوں نے ہمیں اس دنیا میں لاکر ہم پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو۔'' (ص ١٧)

مندرجہ بالا اقتباس سے کشمیری نوجوانوں کی بے زاری کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عمر کے ہر پڑاؤ کو دیپک بُد کی نے بڑے افسانوی ڈھنگ اور دلچسپی سے بیان کیا ہے۔ تعلیمی دور، کالج کا دور، ڈرامہ میں دلچسپی، افسانوی ادب کی دنیا میں پہلا قدم، ادبی سفر، جوانی کے رنگین قصے، ملازمت سے جڑے واقعات کی تفصیل انھوں نے دلچسپ انداز سے بیان کیے ہیں۔

مشرق کا یہ المیہ ہے کہ بچے کے مستقبل سے جڑے ہر فیصلے کا اختیار اس کے والدین اپنا حق سمجھتے ہیں، چاہے وہ تعلیم ہو، کیریئر ہو یا پھر شادی۔ بُد کی صاحب کو بھی ان مرحلوں سے گزرنا

پڑا۔ جہاں تک شادی کا سوال ہے ان کے والد صاحب کا اصرار تھا کہ شادی کسی بڑے گھر میں ہونی چاہیے مگر بُدکی صاحب نے بغاوت کا پرچم لہرایا اور ایک نچلے متوسط خاندان کی لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ افسوس کہ ان کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہ گزری۔ رو دھو کر کچھ سال دونوں نے ساتھ گزارے۔ دو بیٹے بھی ہوئے مگر دل نہ مل سکے۔ پھر دونوں میں علیٰحدگی ہوگئی اور دونوں اپنے اپنے راستے پر چل دیے۔ میاں بیوی کا رشتہ تو ٹوٹ گیا مگر اولاد سے رشتہ برقرار رہا جس کا ثبوت یہ ہے کہ ۲۰۱۰ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ وسندھرا، غازی آباد میں رہائش پذیر ہیں جبکہ چھوٹا بیٹا ماں کے ساتھ رہتا ہے۔

بُدکی صاحب نے اپنی زندگی سے جڑے کھٹے میٹھے، تلخ و شیریں واقعات کو لوحِ حیات میں قلم بند کیا ہے جس سے ان کی زندگی کھلی کتاب کی طرح قارئین کے سامنے آگئی ہے۔ حساس شخص اپنے ذاتی یا دنیاوی کرب سے باہر نکلنے کے لیے قلم کا سہارا لیتا ہے اور اپنے درد کو کاغذ پر اُتار دیتا ہے۔ افسانے کو تخلیق کرتے وقت افسانہ نگار اپنے تجربات، مشاہدات اور تخیل سے ان کا تانا بانا بُنتا ہے مگر سوانح حیات کے لیے بیتے لمحوں اور اہم واقعات کو یاد کر اسے قلم بند کرنا آسان کام نہیں۔ ان واقعات کا کرب و اذیت سہنی پڑتی ہے۔

کتاب میں جا بجا شعر درج کیے گئے ہیں جو اشارہ کرتے ہیں کہ نثر نگار کا رجحان شاعری کی طرف بھی ہے۔ کتاب کی پرنٹنگ، کاغذ بھی عمدہ ہے۔ شستہ زبان میں بُدکی صاحب کی زندگی کے دلچسپ سفر کو پڑھ کر لطف تو آیا ہی ساتھ میں کشمیر کے حوالے سے معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔

دعا کرتی ہوں کہ ان کی آنے والی زندگی بھی اسی طرح ادب کے دامن کو مالا مال کرتی رہے اور ان کی باقی زندگی خوشیوں اور سکون سے گزرے۔ امید ہے لوحِ حیات کے دوسرے ایڈیشن میں زندگی کے اگلے سفر کا اضافہ ہوگا اور قارئین کی دلچسپی اور معلومات میں مزید اضافہ کیا جائے گا۔

☆☆☆

٭ سوانح عمری لوحِ حیات – ایک جائزہ؛ مبصر: ڈاکٹر رینو بہل، ۱۵۰۵ – پشپک کمپلکس، سیکٹر ۴۹ بی، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۴۷

لوح حیات

-محمد غالب نشتر

دنیا کا ہر شخص اپنے تجربات اور مشاہدات کا اظہار کسی نہ کسی طرح ضرور کرتا ہے۔ کبھی اسے وہ اپنے دوستوں کے سامنے پیش کرتا ہے تو کبھی اپنے اہل وعیال کے یا اگر اس کے مشاہدات میں کوئی حکمت کی بات ہوتی ہے تو اپنے چھوٹوں کو بتانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی بہت سے فنکاروں نے اپنے تجربات اور ان سے متعلق کیفیات کا اظہار بڑی ہی فن کاری کے ساتھ کیا ہے جسے ہم خودنوشت سوانح کہہ سکتے ہیں۔ آپ بیتی کسی بھی شخص کی زندگی کی ایک روداد ہے جو اس نے خود لکھی ہو اور اپنی اچھائیاں، برائیاں، تجربات و مشاہدات، حادثات و واقعات پوری ایمان داری کے ساتھ بیان کیے ہوں۔ آپ بیتی ایک طرح سے حسین یادوں اور پرانی باتوں کو تازہ کرنے کی کوشش ہے۔ آپ بیتی لکھنے کے لیے کوئی مخصوص اصول متعین نہیں ہیں جتنی سنجیدگی اور رنگارنگی زندگی میں ہوتی ہے، اتنی ہی تنوع کے ساتھ ہم آپ بیتی بھی لکھ سکتے ہیں۔ سوانح، خودنوشت اور آپ بیتی کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے اس دور کے سماجی وسیاسی حالات اور معاشرے کے رہن سہن کی اچھی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اردو ادب میں افسانہ نگاروں کی بہت کم خودنوشتیں شائع ہوئی ہیں اور اُن تمام میں دیپک بدکی کی خودنوشت 'لوح حیات' کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے جو کہ ایک خودنوشت کی بنیادی صفت ہے۔ 'یادوں کی برات' کی اشاعت کے بعد عام لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ جس خودنوشت میں دروغ گوئی سے زیادہ کام لیا جائے اُس کی قدر ومنزلت بڑھ جاتی ہے۔ جب کہ یہ خیال غلط ہے۔ جوش کی کتاب حیات کی اہمیت زبان وبیان اور اسلوب کی وجہ سے قائم ہے، دروغ گوئی یا

مبالغہ آرائی کی وجہ سے نہیں۔ بدکی صاحب کی زندگی کا اصول رہا ہے کہ معاشرے میں ایسے کام نہ کریں جنھیں معیوب سمجھا جاتا ہے اور انہی اصول وضوابط کو انھوں نے اپنی تحریروں خصوصاً خودنوشت 'لوح حیات' میں برتا ہے اور جس کا اظہاراُن کی فہرست سازی میں ہوتا ہے مثلاً کشمیر: کچھ کھٹی میٹھی یادیں، بچپن جو کہیں کھو گیا، عہد جوانی روروکاٹا، شادی خانہ بربادی، ڈاک جیون بیمہ: ایک یادگار دور، تدریسی تجربہ: ایک دیرینہ خواب ایسے موضوعات ہیں جن میں زندگی کی تلخ یادیں بھی ہیں اور حقیقی زندگی سے منسلک اہم تجربات بھی۔ زندگی میں خوشیاں کم آتی ہیں اور غموں کی بارش اکثر ہوتی ہیں اور ان تمام عنوانات سے زندگی کی تلخ وشیریں یادوں کی خوشبو آتی ہے۔ اسی لیے اس کتاب کا انتساب بھی انہی یادوں سے ہے۔

دیپک بدکی کی خودنوشت 'لوح حیات' دراصل متاع حیات ہے جس میں زندگی کے سارے رنگ اس طرح سے مدغم ہوگئے ہیں گویا وہ زندگی کے نشیب وفراز کی حقیقی عکاسی کرتے ہوں۔ لوح حیات کے چوبیس زینے ہیں اور ہر زینہ زینے سے روشن اور متحرک کرنے والا ہے۔ ادب کا قاری 'جستجو کیا ہے' سے لے کر 'سفر ابھی جاری ہے' تک کے دورانیے کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس کرسکتا ہے کہ دیپک بدکی نے ادبی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اور حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی اپنے اندر کے ادب کو زندہ رکھا۔ گلی گلی شہر شہر کا طواف کرنے والوں کے لیے یہ بڑی مشکل گھڑی ہوتی ہے کہ وہ ہر حال میں ادب کو زندہ رکھے۔ ملازمت کے معاملات، شب وروز کی مصروفیات اور خانگی زندگی کے نشیب وفراز کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادب کو زندہ رکھنا دیپک بدکی کا کمال ہے۔

دیپک بدکی نے اپنی زندگی کے نشیب وفراز کو اس طرح سے ظاہر کیا ہے کہ وہ ایک معصوم اور بھولے بھالے انسان کے طور پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ زندگی کے انہی تجربات کو بیان کرنے سے قبل وہ لکھتے ہیں کہ ''میری زندگی میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے، کچھ کو تو میں نے زیر کیا اور کچھ نے مجھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نفسیاتی طور پر مجھے ہمیشہ زندگی میں سکون، ٹھہراؤ اور جمود

سے جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی رہی۔ جو ہے میں اس سے خوش نہیں ہوتا اور جو نہیں ہے اُس کی جستجو کرتا رہتا ہوں۔'' اس اقتباس کو پڑھ کر ایک قاری اپنے اندر بھی ہمت اور بلند ہمتی محسوس کرتا ہے اور یہی ایک خودنوشت کا فن بھی ہے کہ لوگ اسے پڑھنے کے بعد ایسی کیفیت سے گزریں جیسے وہ ایک فن پارہ کے طور پر تخلیقی متن کی قرأت کر رہے ہوں۔ ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ دیپک بدکی اپنی خودنوشت میں افسانوی انداز کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ مزے مزے کی حکایتیں پڑھتے ہوئے ہم اُن کے ساتھ اس طرح سے چل رہے ہوتے ہیں گویا ہم بھی شریک سفر ہیں اور اُن کے شانہ بہ شانہ چل رہے ہیں۔ اپنے کشمیری ہونے پر فخر محسوس کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ''مجھے اپنے آپ کو کشمیری کہلانے میں بڑا فخر محسوس ہوتا ہے۔ کشمیری عام طور پر نیک سیرت اور امن پسند ہوتے ہیں، کشمیری سے میرا مطلب وہ لوگ ہیں جو وادیٔ کشمیر میں رہتے ہیں یا رہتے تھے خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔'' اس طرح سے ایسے واقعات دیپک بدکی کی خودنوشت میں بھرے پڑے ہیں جو قاری کے لیے دعوت فکر دیتے ہیں۔ اوّل تا آخر ہر صفحے پر حقیقت پر مبنی واقعات کے مطالعے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ دیپک بدکی کی نثر شگفتہ، سلیس اور عام فہم ہوتی ہے جس کے لیے کسی بھی ڈگری یا علمیت کی ضرورت نہیں ہے۔ امید ہے کہ یہ خودنوشت، ادب کی تاریخ میں اپنی حیثیت منوانے میں کامیاب ہوگی۔

☆☆☆

'لوح حیات' خودنوشت؛ مصنف: دیپک بدکی؛ اشاعت: 2019ء، صفحات: 280، قیمت: 350/روپے؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ؛تبصرہ نگار: محمد غالب نشتر، لین نمبر۔ 3، ستار کالونی، بریاتو، رانچی [جھارکھنڈ] 834009۔ موبائل: 9897858093-91+

لوحِ حیات-تبصرہ

-اے جے پنڈتا

دیپک بدکی کی خودنوشت سوانح عمری 'لوحِ حیات' کی ایک کاپی مجھے مصنف کی طرف سے کئی روز قبل مل گئی۔ چونکہ مجھے سوانح عمریاں پڑھنے کا شوق طالب علمی کے زمانے سے رہا ہے، اس لیے جیسے ہی یہ کتاب ہمہ دست ہوئی میں نے اس کا پرغور مطالعہ کرنا شروع کیا۔لیکن چند اوراق پڑھنے کے بعد کچھ ایسا اہم دفتری کام آن پڑا کہ مجھے اس کا مطالعہ کچھ دنوں کے لیے ملتوی کرنا پڑا۔تاہم فارغ ہوتے ہی اولین فرصت میں اس کا مطالعہ دوبارہ شروع کیا اور چند ہی روز میں مکمل کر دیا۔ یہاں پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بدکی صاحب کے ساتھ میں نے دفتر میں کئی سال کام کیا ہے اور اس طرح ان کے گفتار اور کردار سے کافی حد تک واقف ہوں مگر اس سوانح کو پڑھنے کے بعد مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اتنا کچھ جاننے کے بعد بھی مجھے ان کی حیات کے بہت سارے گوشوں کا علم نہیں تھا۔

بارہویں جماعت میں میری انگریزی کی نصابی کتاب میں ایک باب تھا:'Autobiographies are lies' (سوانح عمریاں جھوٹی ہوتی ہیں) جو مشہور زمانہ انگریزی ادیب جارج برنارڈ شا (George Bernard Shaw) کی کسی تصنیف سے ماخوذ تھا۔مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ کوئی بھی سوانح نگار اپنی سوانح عمری میں زندگی سے جڑے حقائق سچائی سے بیان نہیں کرتا۔ نیک نامی کی خاطر کئی غلط کاموں کی پردہ پوشی کی جاتی ہے اور کئی مثالی کاموں کو بڑھا چڑھا کر لکھا جاتا ہے۔

دیپک بدکی کی سوانح عمری پڑھ کر مجھے کہیں بھی ایسا محسوس نہ ہوا کہ انھوں نے اپنی

زندگی سے جڑی کسی بات کو چھپایا ہے۔مصنف نے اول سے آخر تک سیدھے سادے انداز میں اپنی زندگی کے ہر پہلو کو پیش کیا ہے۔اس میں کسی بھی طرح سے تصنع یا آراستگی کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔کتاب پڑھتے پڑھتے چشم تر ہوتی رہی کیونکہ بظاہر یہ مسرور و مطمئن آدمی اندر سے ٹوٹتا اور بکھرتا رہا ہے۔جن حالات سے گزر کر مصنف کا اب تک کا سفر رہا ہے انھیں قدم قدم پر چنوتیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے حالانکہ انھوں نے کبھی بھی اسے اپنی دفتری یا ادبی زندگی پر حاوی ہونے نہیں دیا۔اپنی پُر جوش حکمت عملی،قوت برداشت اور اصولوں کی پابندی کے سبب وہ ہمیشہ ڈرائیور کی نشست پر بیٹھ کر زندگی کی گاڑی کو آگے ہی آگے بڑھاتے رہے۔اس پر مجھے دیو آنند صاحب کی فلم 'ہم دونوں' کا ایک گانا یاد آتا ہے۔

میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا/ ہر فکر کو دھویں میں اڑاتا چلا گیا/
بربادیوں کا سوگ منانا فضول تھا/ بربادیوں کا جشن مناتا چلا گیا/
جو مل گیا اسی کو مقدر سمجھ لیا/ جو کھو گیا میں اس کو بھلاتا چلا گیا۔

دیپک بدکی نے اپنی زندگی کے ہر پہلو کو صاف گوئی اور دیانت داری سے آپ بیتی میں پیش کیا ہے۔ جہاں تک میرا ماننا ہے اپنی نجی زندگی کے بارے میں سوانح نگار بہت کم لکھتے ہیں۔ مجھے خوشونت سنگھ کی لکھی سوانح حیات کے بعد بدکی صاحب کی سوانح عمری 'لوحِ حیات' میں حقیقت بنی نظر آئی۔اپنے پرائے کیا باتیں کریں گے انھیں اس بات کا کوئی ڈر نہیں۔اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر کسی کو اس پر اعتراض نہ ہو تو میں جارج برنارڈ شا کے مذکورہ مضمون کا عنوان بدلنا چاہوں گا کہ All Autobiographies are not lies (سبھی سوانح عمریاں جھوٹی نہیں ہوتیں)۔

وقت کے پہیے کو پیچھے گھما کر دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نوے کی دہائی کے بعد دنیا میں بہت ساری تبدیلیاں بہت تیزی کے ساتھ آئیں۔لوگوں کے رہن سہن،طور طریق اور عیش و آرام کے وسائل غرض ہر چیز،ہر جانب ترقی ہوئی۔اس سے پہلے زندگی دشوار گزار تھی،زندگی

گزارنا ہر ایک کے لیے چیلنج تھا خواہ وہ طالب علم تھا یا شادی شدہ آدمی ۔ زندگی کے میزان پر کھرا اترنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔ دیپک بُدکی ان دونوں ادوار سے بخوبی گزر چکے ہیں ۔ان کی زندگی کا اب تک کا سفر جو رہا ہے اس پر جاں نثار اختر کا یہ شعر یاد آ رہا ہے ۔

کم سے کم ہم میں یہ حوصلہ رہا　　　　زندگی کاٹ دی امتحانوں کے بیچ

واقعی بُدکی صاحب نے زندگی مسلسل جدو جہد میں بتائی ہے اور اگر دیکھا جائے تو یہی بنیادی طور پر زندگی کا عملی جہاد ہے جس کو دیپک بُدکی نے حوصلہ مندی کے ساتھ اب تک نبھایا ہے۔ ورنہ ایسے حالات میں کئی لوگوں کی گاڑی پنکچر ہو جاتی ہے یا وہ اصولوں اور آدرشوں کو خیر باد کہہ کر اپنی طرزِ زندگی بدل دیتے ہیں یا پھر غاروں میں پناہ لے کر باقی زندگی کاٹتے ہیں ۔ میں انفرادی طور پر دیپک بُدکی کی سوانح حیات پڑھ کر بہت متاثر ہوا اور یہی رائے دے سکتا ہوں کہ اس کتاب کو ہر اسکول و ہر کالج کی لائبریری کی زینت ہونا چاہیے تا کہ طالب علم اس سے استفادہ کر سکیں اور جہد زیست کے صحیح معنی سمجھ سکیں ۔

☆☆☆

اجے پنڈتا، پوسٹل اسٹاف کوارٹرس، باغات برزلہ، سری نگر، کشمیر-۱۹۰۰۰۵ ای میل

kumar.ajaypandita@gmail.com: موبائل/9419539597006744139۔

لوحِ حیات-ازدواجی زندگی کا نوحہ

-شبیر احمد مصباحی

'لوحِ حیات' دیپک بُدکی کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔اس سوانح عمری کے تفصیلی مطالعہ کے بعد ہم پر ان کی زندگی کے متعلق بہت سارے حقائق اور ان گنت مخفی گوشے ظاہر ہوتے ہیں۔جہاں تک اس آپ بیتی کا تعلق ہے دیپک بدکی سوانح عمری کے متعلق تقریباً وہ تمام تقاضے واصول وضوابط پورے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو اہل فن ایک آپ بیتی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔اپنی اس سوانح عمری میں انہوں نے اپنی زندگی کے متعلق چند ایسے حقائق بھی بیان کئے ہیں جن کا ذکر کرنے سے ایک ادیب یا عام آدمی ہمیشہ کتراتا ہے۔ایک طرف انہوں نے بڑی بے باکی سے اپنی زوجہ کے علاوہ دوسری عورتوں سے عشق کے قصوں کو، جو ان کی شادی سے قبل یا بعد وقوع پذیر ہوئے، بیاں کیا ہے۔وہیں دوسری طرف انہوں نے ایک بڑے عہدے پر فرائض انجام دیتے ہوئے سرکاری نظام میں جو خامیاں دیکھی ہیں اور سیاسی وغیر سیاسی شخصیات کی اقرباء پروری اور حکومتی نظام میں کوتاہی یا لاپرواہی کو بھی بڑی بے باکی سے منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔

اپنی ذاتی زندگی میں اپنی زوجہ کی من مانی اور چڑ چڑے پن کی وجہ سے جو ان کے اپنے پریوار کا حال ہوا اور اس کی وجہ سے خود مصنف کے ذہن میں جو انتشار پیدا ہوا ہے یہ اس کتاب کا بہت ہی دردناک اور قابلِ افسوس پہلو ہے۔اس قدر ذہنی انتشار کے باوجود مصنف نے اردو ادب کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔سوچنے والی بات یہ ہے کہ اگر ان کی نجی زندگی میں ایسی افراتفری نہ ہوتی تو کیا کچھ لکھتے؟۔اس بارے میں ان کی خودنوشت سوانح عمری کے یہ الفاظ بہت کچھ کہہ رہے ہیں:

''میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مجھے زندگی میں کامیابی نہیں ملی ۔ کامیابی تو ملی مگر کامرانی نہیں ۔ جس ڈگر پر میں گامزن ہوا وہاں عیش و آرام تھا، عزت تھی، ثروت تھی، مگر جاودانی نہیں تھی ۔ نہ زندگی کی کسک تھی، نہ کشمکش اور نہ ہی کوئی چیلنج ۔ صحرا کا کبھی نہ ختم ہونے والا سفر لگ رہا تھا جہاں افق تا افق نہ کسی کا سراغ نظر آرہا تھا اور نہ ہی کہیں کوئی نخلستان دکھائی دے رہا تھا۔''

ایک خودنوشت سوانح عمری کے لئے یہ ضروری ہے کہ سوانح نگار مکمل طور سے خودستائی اور تعلّی سے گریز کرے ۔ اس اعتبار سے جب ہم 'لوح حیات' کا مطالعہ کرتے ہیں تو مصنف اپنی سوانح عمری میں کہیں بھی کسی بھی جگہ پر راست گوئی کا دامن چھوڑتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں ۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہو رہی ہے کہ میں 'لوح حیات' کو ایک دکھی شخص کی 'غمگین آپ بیتی' کہوں گا کیوں کہ ان کی نجی زندگی الجھنوں بھری ہے، آبائی ریاست میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ بے گھر ہیں، ایک بڑے عہدے پر فائز ہو کر بھی افسران بالا کے ہاتھوں ان کی ایماندار شخصیت کی وجہ سے ہر موڑ پر ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا ہے، وہ جہاں اپنے مادری وطن کشمیر کی حالت پر ماتم کناں ہیں، وہیں گجرات میں جو انسانیت کو ٹھیس پہنچی ہے اس سے بھی کافی دکھی ہیں ۔ میری ان مذکورہ باتوں کی سچائی آپ کو ان کی آپ بیتی کے مکمل مطالعہ کے بعد معلوم ہو جائے گی ۔ اس خودنوشت کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بہت کچھ کتاب پڑھے بغیر بھی آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں ۔

'' اس جنت بے نظیر میں جنم لینا میرے لئے فخر کی بات ہے ۔ البتہ جنم ایسے موسم میں ہوا جب یہ وادی اپنے اوپر دوزخ کی سفید ردا اوڑھے رہتی ہے''

اسی طرح جب مصنف اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں اپنی سوانح کی شروعات کرتے ہیں اس باب کا عنوان 'شادی خانہ بربادی' رکھتے ہیں اور اس میں اپنی شادی و خانہ بربادی کی نامکمل داستاں بیان کرنے کے بعد اپنی کتاب کے آخری صفحے میں اپنی ازدواجی زندگی کی تلخی

کے بارے میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''بینا کے لہجے کی گھن گرج کو دیکھ کر مجھے مداخلت کرنی پڑی اور اس کو اعلانیہ کہنا پڑا کہ ابھی تک تو یہ تماشے میں بچوں کے خاطر برداشت کرتا رہا ہوں مگر اب اور برداشت کرنا مشکل ہے۔ یوں بھی عدالت نے ہمارے طلاق کی منظوری کئی سال پہلے دی ہے۔اس لئے بہتر ہے کہ تم اپنا سامان اُٹھا کر ممبئی چلی جاؤ۔خیر اس نے چپ چاپ اس روز پوجا پاٹ مکمل کیا اور تین دن انتظار کرنے کے بغیر اسی روز سارا سامان یکجا کرلیا اور دوسرے روز واپس ممبئی چلی گئی۔مگر مکان پر اپنا قبضہ بدستور رکھنے کے لئے اپنا ذاتی سامان سٹور روم ہی میں رکھا ہے۔اس طرح میری ازدواجی زندگی کا 'دی اینڈ' ہوگیا۔اب صرف زندگی کے دی اینڈ کا انتظار ہے''۔

اس آپ بیتی کے مکمل مطالعے کے بعد میں ذاتی طور سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اُن کی یہ خودنوشت سوانح عمری اردو ادب کی ایک مایہ ناز و ہرفن مولا شخصیت کی ناکام ازدواجی زندگی کا مرثیہ ہے اور کچھ نہیں ہے۔

☆☆☆

٭'لوح حیات -ازدواجی زندگی کا نوحہ' مضمون نگار شبیر احمد مصباحی ؛دراس، کرگل، لداخ، جموں و کشمیر، موبائل : 8082713692

اب میں وہاں نہیں رہتا

-ڈاکٹر شمع افروز زیدی

'اب میں وہاں نہیں رہتا' دیپک بدکی کا ساتواں افسانوی مجموعہ ہے۔اس سے پہلے چھ افسانوی مجموعے ادبی دنیا میں متعارف ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ادھورے چہرے [سن اشاعت ۱۹۹۹ء]؛ (۲) چنار کے پنجے [۲۰۰۵ء]؛ (۳) زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی [۲۰۰۷ء]؛ (۴) ریزہ ریزہ حیات [۲۰۱۰ء]؛ (۵) روح کا کرب [۲۰۱۵ء]؛ (۶) مٹھی بھر ریت [افسانچے، ۲۰۱۵ء]۔ 'ادھورے چہرے' اور 'چنار کے پنجے' ہندی زبان میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

دیپک بُدکی نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز ۱۹۷۰ء میں افسانہ 'سلمٰی' سے کیا۔ یہ افسانہ سرینگر میں شائع ہونے والے 'ہمدرد' میں شائع ہوا۔اب تک وہ سو سے زائد افسانے تحریر کر چکے ہیں جو ہندوستان، پاکستان اور دیگر مغربی ممالک کے معتبر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کے کئی افسانے انگریزی، ہندی، کشمیری، پہاڑی، مراٹھی اور تلگو میں ترجمہ ہو کر عوام کے بیچ معتبریت حاصل کر چکے ہیں۔

'اب میں وہاں نہیں رہتا' میں بیس افسانے شامل ہیں۔ جو زندگی کے وسیع کینوس کا احاطہ کرتے ہیں۔ان افسانوں میں 'زیست' اپنی نیرنگیوں کے ساتھ سانسیں لیتی اور متحرک نظر آتی ہے۔ دیپک بُدکی نے افسانوں میں الفاظ کا استعمال ایسی فنکارانہ حسیت کے ساتھ کیا ہے جو قاری کو ذہنی طور پر اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ سیاسی و سماجی اور عصری منظرنامے افسانوں کو فطری روانی عطا کرتے ہیں۔

دیپک بُدکی نے اپنے دور کی بدلتی اخلاقی قدروں اور منہدم ہوتے ہوئے عقائد کے تناظر میں اپنے افسانوں کی بُنت کی ہے۔ وہ اپنے خارجی ماحول اور عمرانی گردو پیش سے وابستہ ہوکر داخلی تخلیقی احساس سے رشتہ قائم کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی روداد اور کردار ان کی حقیقی زندگی سے وابستہ ہوکر دستاویز کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

ڈاک خانے کے تعلق سے افسانوں کے منظر نامے، کردار اور روداد سبھی حقیقی اور دستاویز کی صورت ہیں۔ 'ہرکارہ'، 'آگ کا دریا'، 'ڈاک بابو'، اور 'فرض شناس' افسانے انڈین پوسٹل سروس کے مختلف زاویے پیش کرتے ہیں۔ ڈاک خانے کی سروس، ان کے قانون و ضابطے، وہاں کام کرنے والے کردار حقیقی نظر آتے ہیں۔ یہاں کی جزئیات نگاری کے جاندار ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بُدکی صاحب ۱۹۷۶ء سے ۲۰۱۰ تک انڈین پوسٹل سروس سے وابستہ رہے۔

'ایک معصوم کی الم ناک موت' اور 'طالب بہشت' افسانے دو حقیقی واقعات پر مبنی ہیں۔ اول واقعہ ہندوستان میں بریلی کے ایک اسکول میں چوتھی جماعت کی طالبہ کو ٹیچر نے ہوم ورک نہ کرنے کے سبب کلاس روم میں دیوار کی جانب منہ کر کے بینچ پر کھڑے ہونے کی سزا دی۔ شومیٔ قسمت کہ آخری پیریڈ ہونے کی وجہ سے کلاس روم خالی ہوگیا۔ اسکول بھی جلدی خالی ہوگیا اور چوکیدار نے تالا بھی لگا دیا۔ تین دن بعد اسکول کھلنے پر واقعے کی سنگینی اور المنا کی کا اظہار بلیک بورڈ پر چاک سے لکھے ہوئے بچی کے الفاظ سے عیاں تھا۔ بچی مرچکی تھی۔

دوسرا واقعہ پاکستان میں رونما ہوا جہاں دہشت گردوں نے آرمی اسکول پر، جب سارے بچے دعا کے لیے ایک ہال میں جمع تھے، اندھا دھند فائرنگ کر کے کئی سو بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ دونوں المناک واقعے موجودہ دور کی انارکی اور انسانیت کو شرمسار کرنے والے ہیں۔ دیپک بُدکی نے ان واقعات کو افسانوی دستاویز کی شکل دے کر جاوداں کر دیا ہے۔

زندگی کے تجربے دیپک بُدکی کے افسانوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ آدھا سچ یا زندگی کے پورے سچ کی نمائندگی کرتا افسانہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' زندگی کا ایسا المیہ ہے جہاں آدھی

رات میں وطن سے بے دخلی اور ہجرت کا درد ہے تو زندگی کے آخری دور کا وہ کرب بھی جب والدین کی زندگی ان کی اولاد کی تعداد کے مطابق مہینوں میں بٹ کر رہ جاتی ہے۔ بعض درد ایسے ہوتے ہیں جن کا آدھا سچ بیان کرنا بھی ممکن نہیں۔ اس درد و کرب کا مزا وہی جان سکتا ہے جس پر یہ گزرتا ہے۔ دیش اور دنیا سے اتر کر یہ درد و کرب عالمی ہے۔ خواہ وہ ہجرت کا کرب ہو یا بچوں کے درمیاں پینگیں مارتی والدین کی زندگی۔

'گونگے سناٹے' ایک سنگین المناک افسانہ ہے۔ اخلاقی اور سماجی رشتوں کی دھجیاں اڑاتے اس افسانے کے کردار مکروہ ہی نہیں قابلِ نفرت بھی ہیں۔ اس کی المنا کی بیان کرتے الفاظ خنجر جیسی کاٹ رکھتے ہیں:-

> ''ایک معصوم جوان لڑکی کی ضروریات اس کا اوباش باپ میسر رکھتا لیکن ماں اپنی بلوریں دنیا تج نہیں سکتی۔ ماں کا کام تھا حیض کی مانند اس کو بدن سے خارج کرنا سو اس نے کر دیا۔ اب وہ جانے یا اس کا باپ۔''

'میری کہانی کا کردار' ایک آزاد خیال لڑکی کی ذہنی اور جذباتی رو کی عکاسی کرتا ہے۔ ایسا کردار جو صنف مخالف سے دوستی میں ساری حدیں عبور کرنے کے باوجود اپنے بیڈروم میں کسی مرد کے وجود کو برداشت کرنے کا مادہ نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس 'لہو کے گرداب' کی عذرا انتہائی مفلس طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ پانچ بہنوں میں تیسرے نمبر پر۔ تین بھائی اور دو بڑی بہنیں گھر چھوڑ چکے ہیں۔ بیمار باپ کمانے لائق نہیں۔ ماں کی کمائی سے گھر چلتا ہے۔ ماں باپ کا سہارا بننے کا جذبہ اور کم عمری کے سبب ایسے شخص کے جھانسے میں آجاتی ہے جو لڑکیاں بیچنے کا کام کرتا ہے۔ بنگلا دیش سے ممبئی کا سفر۔ بیچ سفر میں دلال پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ ممبئی پہنچ کر اکیلی عذرا حوالدار کے ہاتھ آ گئی۔ افسانے کا اختتام المیہ ہے۔ عذرا حوالدار کے ذریعے کیے گئے جسمانی استحصال کا بدلہ قتل کر کے لیتی ہے۔

کشمیر کے فساد زدہ سیاسی منظر نامے کا بیان کرتا افسانہ 'اپنے اپنے زاویئے' ہندوستان کی

دیگر ریاستوں کی سچائی بھی پیش کرتا ہے۔فساد ایسا ملک گیر المیہ ہے جس کی تباہی و بربادی کی آنچ میں سیاسی جماعتیں اپنا حال اور مستقبل سنوارتی ہیں۔

اس مجموعے کے تمام افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔دیپک بُدکی کا تخلیقی ذہن اور بیانیہ کا رواں دواں انداز قاری کو کہیں بھی اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتا۔

☆☆☆

⟫تبصرہ افسانوی مجموعہ'اب میں وہاں نہیں رہتا'؛ مصنف: دیپک بُدکی؛ ضخامت: ۱۸۰ر صفحات؛ قیمت: ۲۰۰ر روپے؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۹۰۱، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-6؛ تبصرہ نگار: ڈاکٹر شمع افروز زیدی؛ مطبوعہ 'بیسویں صدی' نئی دہلی۔

اب میں وہاں نہیں رہتا

-ڈاکٹر اشوک پٹواری

افسانہ نگاری تخلیقیت کے ساگر کو ایک کوزے میں بند کرنے کا عمل ہے۔ بہ الفاظ دیگر سماج اور معاشرے کا حقیقی سطحِ عمودی مختصر الفاظ میں پڑھنا اور محسوس کرنا جہاں قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان ہے وہیں ایک افسانہ نگار کے لیے نہایت ذمہ داری کا کام ہے کیونکہ افسانہ فقط اس کے خالق کے تخلیقی ذہن اور حساس شخصیت کا ترجمان نہیں ہے اور نہ ہی صرف اس کے شعور اور دانش مندی کا میزان ہے بلکہ الفاظ میں لپٹی ہوئی معاشرے کی روداد ہے۔ ہر دور میں رہنے والے لوگوں کی ذہنیت، فطرت اور عمل کا آئینہ ہے۔ اگر کسی تہذیب یا معاشرے کے بارے میں حقیقت جاننی ہو تو اس دور کے لکھے ہوئے افسانوں کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ تواریخ تو لکھوائی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ مفروضہ تواریخ میں درج ہر واقعہ، ہر صفحہ اور ہر سطر صحیح ہو مگر ایک بے باک افسانہ نگار کی عکاسی حقیقت کے بالکل قریب ہوتی ہے۔ ایک حساس افسانہ نگار وقت کے گزرتے ہوئے ہر لمحے کو قریب سے محسوس کرتا ہے۔ اچھے بُرے منظر بغیر کسی پردے یا بہروپ کے اپنے ذہن میں چسپاں کر دیتا ہے اور پھر ان مناظر کو ایک مصور کی طرح کاغذ پر اُتار دیتا ہے۔ یہ عمل دیپک بُدکی کے تازہ ترین افسانوی مجموعے میں صاف نظر آتا ہے۔

'اب میں وہاں نہیں رہتا' دیپک بُدکی کا ساتواں افسانوی مجموعہ ہے جسے پڑھ کر ذہن میں کوئی شک وشبہ نہیں رہتا کہ ۱۹۹۹ء میں شائع ان کے افسانوی مجموعے 'ادھورے چہرے' کے زمانے کے کردار، ماحول اور حالات بیس برس کے لمبے عرصے میں کس قدر بدل گئے ہیں۔ بدلتے حالات اور نئی پود کی ذہنیت، فطرت اور عمل کے پس پردہ حقیقت کے بالکل قریب کہانیوں کو زندہ

جاوید بنا کر پیش کرنا افسانہ نگاری کا کمال ہے جس کی عکاسی دیپک بُدکی نے نہایت ہی خوبصورتی اور ذمہ داری سے کی ہے۔

بیس افسانوں پر مشتمل اس مجموعے کے ذریعے دیپک بُدکی نے اپنے حساس ذہن کی اُڑان کا ایک وسیع دائرہ کھینچا ہے جس کی رداس میں انسانی ترقی کے سب سے نیچے پائے پر کھڑا 'ہرکارہ' ہے تو دوسری طرف موڈرن ٹیکنالوجی (Modern Technology) کے زیر اثر ترقی یافتہ انسان کو روبوٹک (Robotic) معیار پر آگے بڑھتے اور انسانی قدروں سے نیچے لڑھکتے ہوئے دکھایا ہے۔

ہمارے معاشرے میں اب تک ماں باپ اور استاد کا درجہ کافی اونچا مانا جاتا ہے۔ بدلتے وقت میں یہ رشتے کس قدر، خودغرض اور کمزور ہو گئے ہیں۔اس کا خلاصہ 'گونگے سناٹے' اور 'ایک معصوم کی المناک موت' میں بے حد صاف گوئی سے کیا گیا ہے۔کبھی بھی کسی بچے کو، خاص طور پر ایک لڑکی کو، کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اپنی ماں کی شفقت بھری گود میں سر رکھ کر سہارا مانگتی ہے لیکن آج کی چندریکا کہاں جائے گی.....؟ کس سے مدد مانگے گی جب مالی ہی ایک کمسن کلی کو کچلنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو آج کل کے سماج کے نام پر ایک کرارا تھپڑ ہے۔

'اپنے اپنے زاویئے' ایک علامتی کہانی ہے جو اس حقیقت کو عیاں کر دیتی ہے کہ بنی نوع انسان چاہے کتنی بھی ترقی کرے جب تک اس کے اندر انسانیت کا جذبہ گہرائی تک اس کی شخصیت کا حصہ نہ ہو، وہ کبھی بھی شیطان بن سکتا ہے۔ ہندو پاک کے بٹوارے کے وقت کئی علاقوں میں ہندو مسلم ایک دوسرے کے دشمن بن گئے کیونکہ وہ افواہوں کے شکار ہو گئے تھے۔اپنے روایتی بھائی چارے کو وہ اس لیے بھول گئے کیونکہ وہ لوگ معصوم تھے، بے خبر تھے اور ان کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی حلقے انھیں صرف اس لیے ورغلا سکے کیونکہ ان کے پاس صحیح جانکاری حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔مگر حیف اس بات کا ہے کہ آج کل کے دور میں جب ٹیکنالوجی اپنے

عروج پر پہنچ چکی ہے، سیل فون(Cell phone)، وہاٹس اپ(Whatsapp) اور سوشل میڈیا کے ذریعے پڑھے لکھے لوگوں کو غلط اطلاع دے کر گمراہ کیا جاتا ہے!

'جاگتی آنکھوں کا خواب' ہمیں وقت کی بے رحم سزا سے چھلنی ہمارے ماضی کو ہمارے سامنے کھڑا کر دیتا ہے جب ہمارے سماج میں وہ لوگ شامل تھے جو مادہ پرستی سے زیادہ انسانی قدروں اور جذبوں کو ترجیح دیتے تھے۔ شعبان ڈار کا کردار شاید اس پیڑھی کی آخری نشانی ہے جس کے بعد ایک اور نسل کا آغاز ہوتا ہے جو ہم سے مختلف ہے، جو ترقی حاصل کرنے کے باوجود خوش نہیں ہے کیونکہ اس کے اپنے ہی مسائل ہیں۔ ایسے ہی گرداب میں پھنسے ہوئے کردار 'ایک انقلابی کی سرگذشت' میں نظر آتے ہیں جو مختلف حالات کے زیر اثر خطرناک راستوں پر جانے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔

'میری کہانی کا کردار' میں بُدکی صاحب نے ایک ایسے کردار کو اجاگر کر دیا ہے جس کے بارے میں ہم سب لوگ کئی طرح کے نظریئے رکھتے ہیں جو عام طور پر منفی ہی ہوتے ہیں مگر جب کہانی کا کردار، جو ایک نا کتخدا عورت (Spinster) ہے یہ مانتی ہے کہ ایک جھگڑالو بیوی یا نا اہل ماں بننے سے اچھا ہے کہ شادی ہی نہ کی جائے تو روایتی خیالات رکھنے والے بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح 'لہو کے گرداب' کی کم سن لڑکی' ہم سب سے پوچھتی ہے کہ وہ اپنی روح کی موت کا جنازہ کب تک تھام سکتی ہے؟

افسانہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' جہاں ماضی سے جڑے یادِ ایام ، بدلتے وقت ، معاشرے میں بڑھتی ہوئی تبدیلیوں ، اور انسانی رشتوں کے حساس پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں، وہیں 'یوم حساب'، 'موت کا کنواں'، 'پرت در پرت لوگ'، 'ہرکارہ'، 'ڈاک بابو'، اور کئی اور کہانیاں زندگی کے مختلف حقیقی پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔

'دودھ کا قرض' انسانی رشتوں کے بے لوث خلوص اور محبت کی ایک بہترین مثال ہے جس میں مذہب وملت اور اونچ نیچ کو پرے رکھ کر صرف انسانیت کا جذبہ صاف نظر آتا ہے۔ البتہ

افسانے میں جہاں رحمتی اور سجاد کے کردار توقع کے مطابق مکمل ہیں وہیں اقبال ریشی کے کردار میں کچھ کمی نظر آتی ہے۔جن حالات میں پینتالیس برس پہلے وہ واقعہ پیش آیا تھا جب رحمتی نے ایک ماں کی طرح شفقت سے اقبال کا خیال رکھا تھا اس کے عوض میں صرف ڈاکٹر کی فیس کم کرنا اقبال کے کردار کو ذرا کم تر بنا دیتا ہے۔ بہر حال جس پس منظر میں یہ کہانی لکھی گئی ہے اس کا تصور ہی متاثر کن اور سبق آموز ہے۔

افسانوں کا مجموعہ'اب میں وہاں نہیں رہتا' دیپک بُدکی کے ادبی سفر کا ایک اور اہم سنگ میل ہے۔اس میں شامل ہر کہانی اور ہر کردار موجودہ دور کی خصوصیات اور انفرادیت کی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔ یہ دیکھ کر بے حد مسرت اور اطمینان کا احساس ہوتا ہے کہ بُدکی صاحب کے قلم کی روانی وقت کے ساتھ ساتھ بہتر سے بہترین ہوتی جا رہی ہے۔ان کے حساس ذہن میں پوشیدہ جھیلِ سخن اور گہرا ہوتا جا رہا ہے اور اس جھیل کا پانی روز بروز میٹھا ہوتا جا رہا ہے۔یقیناً ان کے قارئین مستقبل میں ان کے ایسے کئی اور مجموعے منظر عام پر آنے کی امید کرتے ہیں۔

☆☆☆

تبصرہ افسانوی مجموعہ'اب میں وہاں نہیں رہتا'،مصنف: دیپک بدکی، سن اشاعت: ۲۰۱۷ء،ضخامت: ۱۸۰ صفحات، قیمت: ۲۰۰ روپے؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۹۱، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-110006؛ تبصرہ نگار: ڈاکٹر اشوک پٹواری؛ مطبوعہ ماہنامہ صبح بہاراں دولتالہ، پاکستان، جولائی ۲۰۱۸ء؛ ص ۲۲-۲۴۔

اب میں وہاں نہیں رہتا

-اجے پنڈتا

کچھ دن قبل مجھے دیپک بُدکی کی نئی کتاب 'اب میں وہاں نہیں رہتا' دستیاب ہوئی۔ یہ کتاب ۲۰/افسانوں پر مشتمل ہے جس کا میں بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ایک تو مسلسل بارشیں، پھر دہلی سے کشمیر تک پہنچنے کی دقتیں اور اس پر ڈاک محکمے کا تساہل...بہر حال بُدکی صاحب کی کتاب ملتے ہی خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ میں ان کی کہانیوں کو ابتدا ہی سے پڑھتا آ رہا ہوں اور ان سے حظ اٹھاتا رہا ہوں۔میرے انبساط کا پہلا سبب یہ ہے کہ فکر انگیز افسانوں کا یہ مجموعہ اس وقت ہاتھ میں آیا جب خط و کتابت تو دور، انٹرنیٹ کے باعث کالے طبع شدہ حروف سے بھی بہت کم واسطہ پڑتا ہے اور دوسرے جس روز سے میرے کانوں میں اس کتاب کے عنوان کی بھنک پڑی، اسی روز سے وہ میرے من کو بھا گئی۔اس طرح انتظار کے بعد وصل کا مزہ دوگنا ہو گیا۔

عجیب بات یہ رہی کہ میں نے کتاب کے افسانے ترتیب وار نہیں پڑھے بلکہ سب سے پہلے میں نے وہی افسانہ پڑھا جس کو بطور عنوان استعمال کیا گیا ہے۔افسانہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' پڑھ کر یہ بات واضح ہوئی کہ انسان اپنی جنم بھومی سے بھلے ہی بہت دور چلا گیا ہو اور وہ اس جبری قطع تعلق کو اپنی زبان سے کئی بار دہرا چکا ہو لیکن دل کے کسی حساس گوشے میں یہ بات نقشِ کالحجر بنی رہتی ہے کہ ''میں اب بھی وہیں رہتا ہوں''۔نہ جانے کیوں مجھے ایک پل کے لیے لگ رہا تھا کہ اس افسانے کا نام ہونا چاہیے تھا-'میں اب بھی وہیں رہتا ہوں'۔افسانہ کشمیر کے تناظر میں لکھا گیا ہے جس میں ایک جانب مہاجروں کی بے چینیاں بیان کی گئی ہیں اور دوسری جانب مقیم لوگوں کی کسمپرسی کو منعکس کیا گیا ہے۔

دوسرا افسانہ جو میں نے پڑھا وہ تھا۔ 'ایک بے کار آدمی کی کہانی' جو ایک سبق آموز افسانہ ہے۔ اس کو میں افسانہ کم اور حقیقت پر مبنی کہانی زیادہ سمجھتا ہوں۔ یہ اس دور کی نمائندگی کرتا ہے جب بہت سارے لوگ مائیگرنٹ بن کر وادی سے باہر بسنے پر مجبور ہو گئے۔ اس دور کا المیہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو کام کرنے کو اپنا دھرم سمجھتے تھے اور بے کاری کو نحوست مانتے تھے، بے گھری اور بے زمینی نے ان کی نفسیات پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ بے کاری اور نٹھلے پن کو ترجیح دینے لگے اور باقی ماندہ زندگی کو ضائع کرتے رہے۔ کہانی کار نے منفرد انداز میں اس حقیقت کو کامیاب قلمی روپ دیا ہے۔

افسانہ 'جاگتی آنکھوں کے خواب' بھی موجودہ معاشرے کو آئینہ دکھاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ دنیا نے برق رفتاری سے ترقی کی ہے اور آگے بھی ترقی کرتی رہے گی لیکن مسابقت کی زد میں آ کر سماجی زندگی بہت حد تک مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ پرانے زمانے میں جہاں دو وقت کی روٹی کا انتظام ہو جاتا تھا تو لوگ قناعت سے رہنے کو ترجیح دیتے اور موسم ڈھلتے ہی زندگی کے دوسرے آشرم (اسٹیج) کی سعی کرتے۔ نوکری تو نوکری، تجارت، گھر گرہستی، زمین، ہمسایہ اور رشتہ داروں کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن آج کے دور کا یہ حال ہے کہ لوگ صرف اور صرف اپنے کیرئیر پر دھیان دیتے ہیں اور ان کے پاس سماجی زندگی گزارنے کے لیے بہت کم فرصت ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنے خون کے رشتوں کو بھی بھلا دیتے ہیں۔ افسانے کا موضوع اور کردار اسی بظاہر جیتی جاگتی اور دوڑتی بھاگتی مصنوعی زندگی کو درشاتے ہیں جس میں آنکھیں اپنوں کو دیکھنے کے لیے ترستی ہیں۔ 'ایک معصوم کی المناک موت' نظام تعلیم سے جڑی ایک دلسوز کہانی ہے۔ آج کے دور میں ایسے حادثات ہر دوسرے دن نیوز چینلوں اور اخباروں کی زینت بنتے ہیں۔ میری یہ ذاتی رائے ہے کہ ایسی کہانیوں کو اگر اسٹیج یا ٹیلی ویژن پر دکھایا جائے تو ان کا اثر سماج پر کافی مفید اور دیرپا ہوگا۔ افسانہ 'موت کا کنواں' ایک الگ قسم کا علامتی افسانہ ہے۔ افسانوں کی قوس قزح میں اس دلکش افسانے کو سنجیدگی سے پڑھنا ضروری ہے کہ جہاں سطحی لحاظ سے اس میں پیٹ پالنے کے لیے لوگوں کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں کی عکاسی کی گئی ہے وہیں کشمکشِ زندگی سے جڑے کئی مصائب کنایوں اور

علامتوں کے ذریعے پیش کیے گئے ہیں یہاں تک کہ عنوان ہی ایک علامت بن کر ابھرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر دور میں مذہبی رہبروں، دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ دنیا میں مذہبی رواداری اور انسانی بھائی چارہ قائم رہے۔ دیپک بُدکی کے افسانے 'اپنے اپنے زاویئے' کا موضوع بھی یہی ہے کہ مذہب کے نام پر کس طرح مفاد پرست مذہبی اور سیاسی رہزن لوگوں کو بانٹنے کی کوششیں کرتے ہیں جب کہ حقیقت میں لوگ امن پسند اور روادار ہیں۔ 'طالب بہشت' میں افسانہ نگار نے یہ باور کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح وقت کے خودساختہ اور خود مشتہر اسکندر اپنے بدنیت و پوشیدہ مقصد کو پانے کے لیے ان اسکولوں اور کالجوں کو بھی نہیں بخشتے جہاں انسانی زندگی کی اصل نشو ونما ہوتی ہے اور جہاں اچھے اور روشن ذہن انسان تراشے جاتے ہیں۔ ان درس گاہوں کو تخریب کا نشانہ بنانا موجودہ دور کا المیہ ہے۔ 'دودھ کا قرض' بھی مذہبی رواداری پر مبنی جذباتی کہانی ہے جو کہیں نہ کہیں کشمیر کے زندہ جاوید کلچر کی عکاسی کرتی ہے۔ بُدکی صاحب نے ایک تاریخی المیے کو افسانے کے طور پر پیش کیا ہے۔

'ڈاک بابو' ڈاکخانے کے بارے میں لکھی گئی سیدھی سادی غیر رسمی کہانی ہے۔ چونکہ بُدکی صاحب ڈاک محکمے میں بحیثیت افسر کام کرتے رہے اس لیے انسپکشن کے سلسلے میں اکثر چھوٹے بڑے ڈاکخانوں میں جانا پڑتا تھا بالخصوص دور دراز علاقوں کے برانچ آفسوں میں۔ یہ افسانہ محکمے کے ملازموں کی سادہ لوحی اور ایمانداری کا آئینہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لوگوں کو آج بھی اس محکمہ پر بہت بھروسہ ہے جس کا احساس راوی کو بھی ہے۔ اسی محکمے سے جڑی ایک اور کہانی 'آگ کا دریا ' ہے جس کے کردار سرکاری ملازم ہیں۔ افسانے میں روزمرہ کے کاموں میں ایماندار ملازموں کو آرہی مشکلات اور آزمائشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان حالات میں ہر آدمی کو کبھی نہ کبھی غلطی یا جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر ایسے بھی کچھ جیالے ہیں جو اپنے اصولوں کا گلا نہیں گھونٹتے۔ اومکار ناتھ ایسے ملازموں کی مثال بن کر سامنے آتا ہے۔ اصولوں پر پابند انسان اپنی نجی زندگی میں بھی ایک الگ چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔

افسانہ 'ایک انقلابی کی سرگزشت' کو اگر تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو کمیونزم خاص کر نکسلی تحریک کی روداد بن کر سامنے آتا ہے۔ عام روش سے ہٹ کر لکھا ہوا افسانہ ہے۔ برسہا برس ہم نے ایک آزاد قوم بننے کی کلپنا کی تھی لیکن آزاد ہونے کے باوجود اب بھی ہم سیاسی اور اقتصادی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اُدھر 'گونگے سناٹے' بھی ایک سماجی حقیقت ہے جس کی طرف افسانہ نگار نے ابتدا ہی میں اشارہ کیا ہے۔ افسانے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہمارا معاشرہ تنزل، جبر اور عیاشی کی جانب گامزن ہے جو خوش آئند بات نہیں ہے۔

دیپک بُدکی کے ادبی اثاثہ میں کشمیر کا ذکر بار بار آتا ہے۔ ان کے افسانوں کا پُرغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے جموں و کشمیر کے مختلف خطوں میں ۱۹۹۰ء کے بعد رونما ہوئے حالات کو باریکی اور سنجیدگی کے ساتھ قارئین کے سامنے لایا ہے۔ ان واقعات کو، جن میں سچائی بیان کرنے سے آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا خطرہ ہوتا ہے، افسانوی گرفت میں لانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ دیپک بُدکی اس کوشش میں سرخرو ہو چکے ہیں۔ کشمیر کے علاوہ انھوں نے ملک کے دیگر علاقوں یہاں تک کہ سرحد پار پشاور کو بھی اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے پاس ابھی بھی افسانوں کا ایک خزانہ موجود ہے جن کا قارئین کو بے صبری سے انتظار رہے گا۔

☆☆☆

٭تبصرہ افسانوی مجموعہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا'، مصنف : دیپک بُدکی ؛سن اشاعت : ۲۰۱۷ء، ضخامت : ۱۸۰ر صفحات، قیمت : ۲۰۰ر روپے ،ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ، ۳۱۹۱، وکیل اسٹریٹ ،کوچہ پنڈت ، لال کنواں ، دہلی -110006 ؛تبصرہ نگار: اجے پنڈتا ، باغات برزلہ، سرینگر کشمیر؛ مطبوعہ ماہنامہ آج کل دہلی ، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۴۹-۴۸

اب میں وہاں نہیں رہتا

- قاسم رسا

مندرجہ بالا افسانوی مجموعہ عزیز محترم بُدکی صاحب کا اب تک کا آخری مجموعہ ہے جس میں بیس افسانے شامل ہیں۔ یہ سارے افسانے ہندستان کے مؤقر اخباروں ورسائل میں شائع ہو کر اہل ادب وافسانوں کے شائقین کی نظر سے گزر چکے ہیں اور کافی پسند کیے گئے ہیں۔

اس مجموعہ یعنی 'اب میں وہاں نہیں رہتا' کو میں نے بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کیا ہے اور اس میں شامل مندرجہ ذیل افسانوں نے مجھے کافی متاثر کیا ہے مگر اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ مجموعہ کے باقی افسانے معیاری نہیں۔

'گونگے سناٹے'، 'ایک انقلابی کی سرگزشت'، 'اب میں وہاں نہیں رہتا'، 'جاگتی آنکھوں کے خواب'، 'لہو کے گرداب'، 'پرت در پرت لوگ'، اور 'اندھیر نگری'۔

دیپک بُدکی ایک مدت سے افسانوں کی دنیا میں مشہور ہیں اور آج ہندستان ہی میں نہیں بلکہ بیرون ہند میں بھی، جہاں جہاں اردو پڑھی جاتی ہے، آپ کا نام افسانوں کے ذریعے جانا جاتا ہے۔ اہل زبان وادب ان کے افسانوں کے دیوانے ہیں، ان کے افسانوں پر تذکرے ہوتے رہتے ہیں اور معیاری جرائد میں ان کے نام اور کام پر گوشے اور مخصوص شمارے شائع کیے جاتے ہیں۔

زبان وادب پر دیپک بُدکی کو خاصی قدرت حاصل ہے، وہ محض قلم اٹھا کر کاغذ پر افسانہ نہیں بکھیرتے بلکہ عمیق غور وفکر کے بعد افسانہ کو تخلیقی جامہ پہناتے ہیں۔ جو کردار وہ پیش کرتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ وہ اس افسانہ ہی کے لیے صد فیصد موزوں اور مناسب ہے۔ مثال کے طور پر

ان کے افسانہ 'گونگے سناٹے' ہی کو لیجیے، اس میں ان کے خود کے علاوہ چار کردار اور ہیں، ایک مسٹر کھرے، دوسرا کردار ان کی بیوی (یعنی کھرے کی بیوی) تیسرا ان کی نوکرانی اور چوتھا کردار ان کی بیٹی چندریکا۔ چاروں کے کردار کو انھوں نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ انسان کس قدر گھونے ماحول میں زندگی گزار کر خوشی کا اظہار کر سکتا ہے، ماں باپ اور بیٹی کے تعلقات اور جنسی معاملات پر یہ افسانہ سماج کے لیے تازیانے کا کام کرتا ہے۔ پھر نئی تہذیب میں نوکرانی کی عزت سے کھیلنا تو گویا آج کا فیشن ہی بن گیا ہے۔

اسی طرح 'پرت در پرت لوگ' دیپک بُدکی صاحب کا کچھ رومانی، کچھ فریب آمیز رومانی افسانہ ہے۔ انسان نام سے بھلے ہی کچھ ہو مگر فطرت سے اگر شریف ہے تو کہیں نہ کہیں وہ دھوکہ کھا ہی جاتا ہے۔ افسانے کا ہیرو بھی ایک مکار لڑکی کے جال میں پھنس جاتا ہے لیکن بھلا ہو اس کے وکیل کا جو اس کی صلاح پر معاملہ میں بیس لاکھ کی رقم دے کر عدلیہ سے باہمی رضامندی کے ساتھ طلاق منظور کروانے میں کامیاب ہوتا ہے اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس طرح کے فریب آمیز معاملے روز بروز اخباروں کی سرخی بن کر قارئین کی نظر سے گزرتے ہیں۔ پولیس اور عدالتوں تک بات جاتی ہے۔ با اختیار اور متموّل لوگ تو کسی طرح بھاری رقمیں چکا کر چھٹکارا پا لیتے ہیں مگر غربا پولیس اور عدالت کی چکّی میں پس کر اپنی زندگی تک ختم کرتے ہیں۔ یہ افسانہ سبق آموز بھی ہے اور سماج کے لیے احتیاط و فکر کا موضوع بھی۔

میری پسند کے افسانوں میں افسانہ 'اندھیر نگری' بھی ہے جس میں سماج میں پھیلی ہوئی گونا گوں بدعنوانیوں اور ناانصافیوں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس افسانہ میں ایک عورت کا کردار پیش کیا گیا ہے جس کا نام جوگا ساہنی ہے۔ اس پر بُدکی صاحب کا ایک جملہ ہی کافی ہے جو یوں ہے "شکل و صورت سے وہ دانشور کم اور سماجی تتلی زیادہ معلوم ہوتی تھی۔" وہ ایک بار کی مالکہ بھی تھی، اسی بار میں شہر کے ڈان کے بیٹے نے ایک بار گرل Bar Girl کو صرف اس قصور پر کہ اس کے کہنے کے باوجود اس نے دوسرے گراہک کو پہلے جامِ شراب مہیا کر دیا اور اسے نہیں دیا، غصے میں آ کر گولیوں

سے بھون دیا۔مگر اس کے خلاف کوئی شہادت دینے کے لیے تیار نہیں ہوا اور نہ ہی پولیس اپنا فرض نبھانے میں کامیاب ہوئی۔ وہ تو بھلا ہو عدالت عالیہ کا کہ جس نے اپنی نگرانی میں پورے معاملے کی از سرِ نو چھان بین کروائی اور ملزم کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔اس کے بعد جوگا ساہنی، جو بار کی مالکہ تھی، گویا صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔افسانے کے آخر میں ایک جملہ یوں بھی ہے کہ ''کسی دہریے نے سچ کہا ہے کہ ہندستان ایک ایسا ملک ہے جہاں خدا کے وجود پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔'' اس جملہ پر میں کہنا چاہوں گا کہ شاید بُدکی صاحب کے دل کی یہ آواز ہے۔افسانہ کا Conclusion بہت اچھا ہے۔

یہاں ایک بات اور کہوں گا کہ دیپک بُدکی صاحب تقریباً ہر افسانے میں اپنے خود کے کردار کو ضرور جوڑتے ہیں مگر کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ ان کی شمولیت بے معنی ہے بلکہ افسانہ میں ان کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔جیسا پہلے بھی ذکر آچکا ہے، 'اب میں وہاں نہیں رہتا'، 'جاگتی آنکھوں کا خواب'، 'لہو کے گرداب'، 'پرت در پرت لوگ' اور 'اندھیر نگری' ان کے نمایاں افسانے ہیں جنھوں نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ایسے عمدہ افسانوں کی تخلیق پر میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ مستقبل میں بھی وہ اپنے قلم کے جادو سے اہلِ زبان و ادب کو متحیر کرتے رہیں گے۔

آخر میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا کہ انھوں نے زندگی کے سفر میں جو تجربات حاصل کیے ہیں انھیں بھی افسانوں کا جزو بنایا ہے۔ دیگر یہ کہ ان کا وطن کشمیر جیسی حسین وادی ہے جسے دنیا جنت نشان کے نام سے پکارتی ہے۔اس کی یادوں کو وہ کبھی نہیں بھولتے حالانکہ ایک مدت سے وہ اب وہاں نہیں رہتے مگر انھوں نے اپنی یادوں کا عکس جا بجا اپنے افسانوں میں ضرور پیش کیا ہے۔وہ شاعری بھی کرتے ہیں مگر کم لوگوں کو اس کا علم ہے۔اے کاش ان کا شعری مجموعہ بھی منظرِ عام پر آئے تو ادبی حلقوں میں ضرور سراہا جائے گا۔

مضمون کے اختتام پر میں اللہ تبارک و تعالیٰ سے ان کی عمر درازی اور صحتمندی کے ساتھ

ساتھ دعا گو ہوں کہ انھیں اور ان کے قلم کو تا دیر باوقار بنائے رکھے۔ آمین ثم آمین!

☆☆☆

☜تبصرہ افسانوی مجموعہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' - میری نظر میں، مصنف: دیپک بُدکی؛ سن اشاعت: ۲۰۱۷ء، ضخامت: ۱۸۰ رصفحات، قیمت: -/۲۰۰ روپے؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۹۱، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی -۱۱۰۰۰۶؛ تبصرہ نگار: قاسم رسا، گوالیار؛ مطبوعہ: (۱) ہماری زبان، نئی دہلی، جلد ۷۷، شمارہ ۵، ۷-۱ رفروری ۲۰۱۸ء (۲) چشمۂ اردو، رائے پور، جلد ۴، شمارہ ۳؛ جنوری - مارچ، ۲۰۱۸، ص ۳۶-۳۵۔

مٹھی بھر ریت (افسانچے)

-ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی

اُردو فکشن میں داستاں، ناول، ڈرامہ اور افسانہ کی روایت بہت پرانی ہے۔ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان کی ہیئت الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ان میں کوئی نہ کوئی ایک کہانی ہوتی ہے۔ کہانی پن ان میں موجود ہوتا ہے۔ افسانہ کے فن میں پہلے افسانہ، پھر مختصر افسانہ اور پھر افسانچہ نے جنم لیا اور یہ سب تبدیلیاں وقت اور حالات کے ساتھ ہوئیں۔ پہلے طویل، پھر کم طویل اور پھر مختصر سے مختصر ترین یعنی افسانچہ کا وجود ہماری زندگی کی گہما گہمی اور ایجادات کے اثرات سے وابستہ رہا۔ کہانی سننے اور کہنے کے لیے آج کے مصروف انسان کے پاس وقت نہیں ہے۔ اس لیے وہ آدمی فیس بک، لیپ ٹاپ کا سہارا لے کر اپنی فرمائش، خواہش اور ضرورتیں پوری کر رہا ہے۔ اس کو پڑھنے سے زیادہ دیکھنے میں زیادہ آسانی ہے۔ زیادہ پڑھنے کے بجائے تلخیص سے کام لے رہا ہے۔ اسی لیے آج کل افسانچے خوب مشہور ہو رہے ہیں اور پسند بھی کیے جا رہے ہیں۔

دیپک بُدکی اردو ادب کی قابلِ قدر شخصیت ہیں۔ اردو ادب کو نئی راہوں سے ہمکنار کرنے میں آپ کی جدوجہد قابلِ تعریف ہے۔ موجودہ پس منظر میں تخلیقی زبان کیسی ہو اس پر غور و خوض کیا ہے جس کی جھلک اس کتاب میں ملتی ہے۔

بظاہر 'مٹھی بھر ریت' افسانچوں کا مجموعہ ہے لیکن اس میں دیپک بُدکی صاحب نے سپاس نامہ اور پیش لفظ، افسانچہ کا مستقبل اور پوپ کہانی کے بارے میں وضاحت سے بحث کی ہے اور اردو افسانچہ کو فروغ دینے کی سعی کی ہے۔ اس کتاب میں ۱۰۶ افسانچے شامل کیے ہیں۔ یہ افسانچے مختلف اخبار و رسائل، اردو سخن آن لائن، اردو ہاؤس آن لائن، اردو جہاں آن لائن،

اردو گلبن آن لائن سے اردو دنیا تک پہنچ گئے ہیں۔

افسانچے کے مستقبل کے لیے بُدکی صاحب نے اہم تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ جو یقیناً افسانچہ لکھنے والوں کے لیے مفید ہیں۔

دیپک بُدکی کے افسانچے، تجرباتی اور مشاہداتی ہیں۔ موجودہ سماج اور تہذیب کے رویوں کی گہری چھاپ چھوڑتے ہیں۔ دیپک بُدکی کی بے پناہ تخلیقی قوت ان افسانچوں میں مضمر ہے۔ کتاب کا عنوان 'مٹھی بھر ریت' دیگ کے ایک چاول کو چکھنے کے مترادف ہے۔ بدکی صاحب ریگستان میں نخلستان کے قائل ہیں۔ وہ ریت کے زرّوں میں سنگِ زر اور حیاتِ جاودانی تلاشتے ہیں۔ زندگی کی رمق ڈھونڈتے ہیں۔ ریزہ ریزہ زندگی کو حیات جاوداں دیتے ہیں۔

جہاں تک افسانچوں کی زبان و بیان کا تعلق ہے اس میں بھی بُدکی صاحب زبان و بیان کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ یہ اور بات ہے کہ افسانچوں کے کردار ہماری قدروں کو مجروح کرنے والے ہوں تو اس میں بُدکی صاحب زبان کو کیسے بدل سکتے ہیں۔ کتاب میں شامل بہت سے افسانچے ایسے ہیں جن میں قدروں کی پامالی عام ہے۔ جو ہمیں کبھی زبان کھولنے اور کبھی زبان بند کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ بُدکی صاحب نے ایسے مقامات پر بھی بے باکی اور جرأت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے کرداروں کے سچ کو سچ ہی کہا ہے خواہ اس میں کتنا ہی ابتذال ہو۔ ایسے افسانچوں میں مزدور رکشا، ہار جیت، گمشدہ کی تلاش، پردہ فاش، ثبوت، بیوی کی کمائی، تلاش اس لمس کی، کتابی محبت، اجنبیت کا عذاب، تصویر، اندھے کی لاٹھی، مانگے کا اجالا اور فیصلہ قابل ذکر ہیں۔

چند افسانچے ایسے بھی ہیں جو بُدکی صاحب کی زندگی کے دورانِ ملازمت رونما ہوئے۔ انھیں بے کم و کاست افسانچوں میں جگہ دی ہے۔ ایسے افسانچوں میں ڈاک خانے کی ملازمت، مرتبہ، سول سوسائٹی، نذرانہ، پوجا کا چندہ، ملازمت، چوکیدار، ہیلو انکل شامل ہیں۔

بحیثیت مجموعی 'مٹھی بھر ریت' کے افسانچے ہمارے اردگرد کے کردار ہیں جو عام طور پر نظر آجاتے ہیں۔ دیپک بُدکی صاحب نے انھیں ادبی پیرائے میں اپنے تجربات اور مشاہدات

کے ساتھ ہدیۂ قارئین کیے ہیں۔ تمام افسانچوں کے عنوانات دلچسپ اور جدید ہیں جو قاری کو پڑھنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں اور وہ پوری کتاب ایک نشست میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے بھی یہی عمل کیا ہے۔ یہی بُد کی صاحب کی خوبی ہے کہ وہ قاری کو اپنے ہم خیال ہونے، سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ لینے کی قوت عطا کرتا ہے۔ وہ کوئی بات افسانچہ کے ذریعہ تھوپنے کا کام نہیں کرتے بلکہ سوچنے سمجھنے اور اصلاح وعمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ 'مٹھی بھر ریت' کو عملی تخلیق کا درجہ دیا جائے تو کوئی بے جانہیں ہوگا۔

امید ہے کہ 'مٹھی بھر ریت' ادبی حلقہ میں مقبول ہوگی۔

☆☆☆

﴾ تبصرہ 'مٹھی بھر ریت (افسانچے)، مصنف دیپک بُد کی، ضخامت ۱۶۷ صفحات، اشاعت ۲۰۱۵ء، قیمت ۳۰۰ روپے؛ ناشر: میزان پبلشرز و ڈسٹریبوٹرس، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر ۱۹۰۰۰۹؛ تبصرہ نگار ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، فرحت منزل، کالی پلٹن ہزد دیوان جی کا کنواں، ٹونک ۳۰۴۰۰۱ (راجستھان)؛ مطبوعہ ماہنامہ پرواز ادب، پٹیالہ، جلد ۳۸، شمارہ ۱۰-۹، ستمبر-اکتوبر ۲۰۱۶ء

تبصرہ

اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

-ڈاکٹر پریمی رومانی

دیپک بُدکی اردو کے ایک نامور ادیب ہیں۔انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور خاکے بھی۔وہ تبصرہ نگار کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں اور بحیثیت ایک محقق کے بھی انھوں نے اپنی پہچان بنائی ہے۔ان کے افسانے ، افسانچے، مقالات اور خاکے وقتاً فوقتاً صف اول کے اخبارات اور جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔عصری تحریریں، عصری شعور اور عصری تقاضے کے نام سے ان کے تحقیقی وتنقیدی مجموعے اشاعت کی منزلوں سے گزر چکے ہیں اور اس طرح انھوں نے نئے ناقدین اور محققین میں اپنی ایک مستحکم جگہ بنائی ہے۔

'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' ان کا تازہ کار تحقیقی کارنامہ ہے جو ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا ہے۔زیر بحث مجموعے میں اگر چہ بعض محققین نے پہلے بھی خامہ فرسائی کی ہے جس کی طرف خود مصنف نے بھی اپنی کتاب کے سرنامے میں اشارہ کیا ہے۔اس ضمن میں انھوں نے ڈاکٹر نریش، نند بہادر شریواستو، محمد عمران قریشی ، اور نذیر فتح پوری کی کتابوں کے حوالے پیش کیے ہیں لیکن میرے علم میں دو اور اہم کتابیں ہیں جن میں غیر مسلم شاعروں اور قلم کاروں کے حالات اور ان کے تخلیقی کارناموں کی تفصیلات درج ہیں۔ان کتابوں میں 'خمخانۂ جاوید' اور 'بہار گلشن کشمیر' کے نام بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ تذکرہ نگاری کا سلسلہ اردو ادب میں بہت پہلے سے رائج ہے۔خوشی کی بات یہ ہے کہ موجودہ عہد میں بھی لکھنے والے اس طرف اپنی توجہ مبذول کر رہے ہیں اور اس روایت کو زندہ رکھ کر آگے بڑھا رہے ہیں جس کی مثال دیپک بُدکی کی 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' جیسی تصنیف سے ملتی ہے۔

'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' ۲۸۷ صفحات پر مشتمل بُدکی کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے جسے تقریباً ۱۵۷ غیر مسلم اردو افسانہ نگاروں کی تفصیلات فراہم ہوتی ہیں ۔اس کے پیش لفظ میں معروف ادیب اور صحافی نند کشور وکرم رقم طراز ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ انھوں (دیپک بُدکی) نے اس تحقیقی کتاب کے سلسلے میں بے حد محنت کی ہے اور کوشش کی ہے کہ اس میں صرف معروف ہی نہیں بلکہ غیر معروف افسانہ نگاروں کو بھی شامل کیا جائے تا کہ مستقبل میں کوئی جانکاری حاصل کرنا چاہے تو اسے مایوسی نہ ہو۔ (ص ۱۲-۱۱)

'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' کا آغاز 'اردو افسانے کے پیش رو'، 'آزادی سے پہلے کا منظر نامہ'، 'آزادی کے بعد کا منظر نامہ' اور 'اردو ادب کے علاقائی جزیرے' جیسے پر مغز موضوعات سے ہوتی ہے۔ یہ تمام موضوعات تحقیقی نوعیت کے موضوعات ہیں جن پر ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن دیپک نے بڑے احتیاط اور ہنر مندی سے ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور اپنی ژرف نگاری اور ذہن رسا سے ان تمام موضوعات پر معنی خیز بحث کی ہے۔اس طرح سے انہوں نے کوزے میں دریا کو بند کرنے کی مثال قایم کی ہے۔یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

افسانہ نگاروں کے کوائف و تصانیف کے باب میں دیپک بُدکی نے بڑے سلیقے سے ۱۵۷ غیر مسلم افسانہ نگاروں کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ باب کتاب 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے جس کا آغاز بابائے افسانہ منشی پریم چند سے ہوتا ہے اور پھر سلسلہ وار آگے بڑھتا ہے۔اس باب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں برگزیدہ افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ غیر معروف افسانہ نگاروں کو بھی جگہ دی گئی ہے تا کہ قارئین دونوں طرح کے افسانہ نگاروں کے فرق و امتیاز سے واقف ہو جائیں ۔ دیپک نے اس باب میں اپنی علمیت، محنت اور اور تجربے کی بوقلمونی سے نئے رنگ بھر دیے ہیں ۔ زیر بحث باب میں شامل افسانہ نگاروں کے سوانحی اشارے، ان کے افسانوی مجموعوں کی تفصیل، ان پر مختلف علمی و ادبی تحریکات کے اثرات،، وہ کس

مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا ذریعۂ معاش کیا رہا اور ان کے فلسفۂ حیات کے بارے میں بھی پوری تفصیلات فراہم ہوتی ہیں۔ دیپک بُدکی نے یہ فرض بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔

یوں تو میلا رام وفا، ڈاکٹر نریش، بلراج کومل، کمار پاشی، برج موہن دتاتریہ کیفی، بھگوان داس اعجاز، جگت موہن رواں وغیرہ اردو کے برگزیدہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ دیپک بُدکی نے پرانی کتابوں اور رسائل کے ہزار ہا صفحات پلٹ کر قارئین کے سامنے ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں تفصیلات رکھ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس کی طرف آج تک بہت کم تذکرہ نگاروں نے توجہ کی ہے۔ انہوں نے مرد افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین افسانہ نگاروں کو بھی ملحوظ خاطر رکھ کر ایک سچے محقق کا فرض نبھایا ہے۔ دیپک نے کوشلیا اشک، سرلا دیوی، ساوتری گوسوامی، اندو شبنم اندو، آشا پربھات، ڈاکٹر رینو بہل، آشا شیلی وغیرہ کی تفصیلات فراہم کئے ہیں اور ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں سچے دل سے ان کے کوائف پیش کئے ہیں۔ انہوں نے ان خواتین افسانہ نگاروں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے اور اپنے تاثرات نوک قلم پر لائے ہیں۔ اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار، کا ایک حصہ کنہیا لال کپور، گوپال متل، ہمت رائے شرما، شنکر سروپ بھٹناگر، نریش کمار شاد وغیرہ کی افسانہ نگاری پر مشتمل ہے۔ دیپک نے ان کے افسانوں کو بحر ذخائر سے دریافت کر کے ان کے افسانوں کا بھی سچے دل سے تجزیہ کیا ہے۔ اس طرح سے ان کی کوشش سراہنے کے لائق ہے۔ انھوں نے اس پروجیکٹ کی تسوید کے دوران بے شمار کتابوں اور رسائل سے مواد اخذ کر کے نہایت ہی محنت، لگن اور صلاحیت سے ہمارے سامنے غیر مسلم افسانہ نگاروں کی مکمل تاریخ رکھی ہے جو داد دینے کے لائق ہے۔

امید ہے کہ اہل نظر اس کتاب کا مطالعہ کر کے دیپک بُدکی کی محنت کی داد دیں گے۔ انہوں نے ایک سنجیدہ موضوع پر کام کیا ہے اور اپنے دلائل سے اس موضوع کو نئے رنگوں سے مزین کیا ہے۔ کتاب کا گیٹ اپ دیدہ زیب، قیمت مناسب، اور کمپیوٹر لے اوٹ قابل داد

ہے۔ کتاب کے سرورق پر افسانہ نگاروں کی تصاویر شایع کر کے کتاب کے ظاہری حسن میں اضافہ ہو گیا ہے۔ الغرض یہ کہ دیپک کی یہ کوشش مکمل طور پر سرہانے کے لایق ہے اور اس کا ہر ایک لایبریری اور تحقیقی اداروں میں ہونا لازمی ہے تاکہ تحقیق کرنے والے دیپک بُدکی کے اس کارنامے سے مستفید ہو جائیں۔

☆☆☆

✍تبصرہ؛'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار'(تحقیق)،مصنف: دیپک بُدکی؛سن اشاعت: ۲۰۱۷ء؛ضخامت: ۲۸۸ رصفحات، قیمت: تین سو پچاس روپے[-/۳۵۰ روپے]،(لائبریری ایڈیشن ۴۹۵روپے)؛ناشر: میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، سرینگر، کشمیر۔۱۹۰۰۰۹؛تبصرہ نگار: ڈاکٹر پریمی رومانی؛سنگھڈ روڈ۔ پونے (مہاراشٹر)؛مطبوعہ:: ماہنامہ آج کل دہلی، اگست ۲۰۱۸ء،جلد ۷۷،شمارہ ۱؛ص ۴۹-۴۷۔

تبصرہ

اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

-محمد غالب نشتر

ناقدین کا اصرار ہے کہ اردو فکشن کی تاریخ میں صنف افسانہ کی عمر سب سے کم ہے لیکن جملۂ معترضہ کے طور پر یہ کہتا چلوں کہ کسی بھی صنف کی تاریخی حیثیت کا اندازہ، اُس کی عمر سے لگانا بالکل لغو ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو داستان اور ناول کے مقابلے افسانے کی کوئی وقعت ہی نہیں رہے گی۔یہ ایک بے بنیاد دلیل ہے جس سے قطع نظر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ صنف ہذا میں کن کن فنی کمالات کا ظہار ہوا ہے۔افسانہ ایک ایسی صنف ہے جو اپنی کم عمری کے باوجود، دوسری اصناف سے معیار و مقدار میں کئی گنا آگے بڑھ گیا ہے جس سے صرف نظر ممکن ہی نہیں۔اب میں اپنی اصل بات کی طرف رجوع کر رہا ہوں کہ آج کے معاشرے میں 'اردو زبان' تعصب کا شکار ہے اور عوام کے ذہنوں میں یہ بات نقش کر گئی ہے کہ یہ زبان کسی ایک خاص حلقے کی زبان ہے۔ذاتی خیال یہ ہے کہ اس افواہ میں اردو والوں کا قصور بھی برابر کا ہے۔انھوں نے ایسی صورتحال پید کر دی ہے کہ مخالفین کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ اردو زبان کسی ایک خاص حلقے کی زبان ہے اور یہ زبان سکڑتی جا رہی ہے۔ایک زمانہ تھا جب اردو ادب میں غیر مسلموں کی ادبی خدمات کا اعتراف شان و شوکت سے کیا جاتا تھا اور انھیں بھی اس ادب کا حصہ سمجھا جاتا تھا لیکن آزادی کے بعد حالات اس طور پر تبدیل ہوئے کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اردو زبان کی شیرینی اس طرح محلول ہو کر ہمارے معاشرے کے دلوں سے محو ہو جائے گی۔دیپک بدکی کی تنقیدی و تحقیقی کاوش ''اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار'' میں بھی یہ صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔اس تحقیقی کاوش میں انھوں نے کم و بیش ایک سو ساٹھ افسانہ نگاروں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔اس سے قبل مضامین کی شکل میں تو کئی ناقدین

نے غیر مسلم افسانہ نگاروں کے اعتراف میں تاثراتی مضامین لکھے ہیں۔علاوہ ازیں دوحہ/قطر سے شائع ہونے والا رسالہ ''دستاویز'' نے بھی کسی ایک شمارے کو''اردو کے غیر مسلم ادبا وشعرا'' کے نام مختص کیا تھا لیکن بدکی صاحب نے اس کتاب میں افسانہ نگاروں کی ایک کہکشاں کو یکجا کر کے پورے ادبی منظر نامے کو واضح کیا ہے۔ان کی یہ تحقیقی کتاب،مضمون کی شکل ہی میں سہ ماہی 'فکر و تحقیق' میں شائع ہوا تھا اور یہی مضمون کتابی شکل میں قلمبند کرنے کا محرک بنا۔یہ کتاب دیپک بدکی کی تین سالہ تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔کتاب کا پیش لفظ اردو کے معروف محقق،ناقد اور اردو دوست ادیب نند کشور وکرم نے تحریر کیا ہے۔ساتھ ہی انھوں نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ اکیسویں صدی میں مسلم اور غیر مسلم کی تخصیص کچھ عجیب سی لگتی ہے۔اس کے ساتھ ہی تخصیص پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ [۱] ''اگر دیپک بدکی اردو کے تمام افسانہ نویسوں کو شامل کرتے تو اس تحقیق میں مزید دس بیس برس اور بھی لگ جاتے۔'' [۲] ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آئندہ دنوں میں غیر مسلم افسانہ نگار ناپید ہو جائیں اور شاید ہی کوئی اُن پر تحقیق کرنے والا باقی رہے۔''

نند کشور وکرم کے نکات میں نوے فیصد سچائی ہے کیوں کہ اکیسویں صدی میں ہم محسوس کررہے ہیں کہ اردو میں غیر مسلم فنکاروں اور ناقدین کی تعداد ناپید ہوتی جارہی ہے۔ایس سی/ایس ٹی کے وہی طالب علم اردو پڑھتے ہیں جنھیں ملازمت حاصل کرنی ہوتی ہے۔ظاہر ہے ایسے اساتذہ کو ادیب تو بہر حال نہیں کہا جاسکتا۔ہمارے درمیان اردو میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے والے کم ہی فنکار ہیں۔جو باقی بچے ہیں،وہ پرانی نسل کی پیداوار ہیں اور اُن کی ذہنی تربیت میں گھریلو ماحول کا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے۔اس کے ذمے دار خود اُردو والے ہیں۔وہ غیر مسلم فنکاروں کے اعزاز میں تقاریب کا انعقاد کرنے سے جی چراتے ہیں اور اُن کی عظمت کا اعتراف بھی نہیں کرتے۔وہ تو شکر ہے کہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والے طالب علموں کے پاس موضوعات گھسے پٹے ہوتے ہیں تو وہ غیر مسلموں پر بھی کام کرلیتے ہیں۔مقالے کی بات آئی ہے تو بتا تا چلوں کہ ابھی تازہ ترین ایم فل کا مقالہ پاکستان کے فیصل آباد خواتین کالج سے طاہرہ یاسمین

نے مکمل کیا ہے۔ اگر اردو والے اپنے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرنا جانتے تو پریم چند، بلونت سنگھ اور اوپندر ناتھ اشک جیسے ادیب اردو سے کنارہ کشی اختیار کر کے ہندی کے دامن میں پناہ نہیں لیتے۔

دیپک بدکی نے حرف آغاز کے تحت اپنی کتاب کا پس منظر بیان کیا ہے اور اپنا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''پیش نظر کتاب کے ذریعے میری یہ کوشش رہی ہے کہ موجودہ نسل اور آنے والی نسل کو کم سے کم اتنا تو احساس دلایا جائے کہ اردو گنگ وجمن کی شہزادی ہے، اس کے گیسو ہر مذہب کے فنکاروں نے سنوارے ہیں، افسانوی ادب کی نشو ونما میں غیر مسلموں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے، بقول شخصے: اردو افسانوی ادب سے پریم چند، کرشن چندر اور بیدی کو نکالا جائے تو باقی رہ ہی کیا جاتا ہے۔'' بدکی بہ ذات خود افسانہ نگار ہیں اور افسانے کے رمز واشارے سے خوب واقف ہیں۔ اس کتاب کو بھلا اُن سے بہتر کون لکھ سکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک فنکار سے بڑا کوئی بھی ناقد نہیں ہے کیوں کہ فنکار جب تخلیق کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے تو وہ فنکار کے ساتھ ناقد ہی ہوتا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ فنکار سے زیادہ نقاد کا کام کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے دیپک بدکی کے اکثر جملے تخلیقی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے تخلیقی ادب میں تحقیقی نکات کو شامل کر کے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پورے تحقیقی مقالے کی قرأت کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کسی بھی غیر مسلم افسانہ نگار کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی نام سہواً رہ گیا ہو تو الگ بات ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے غیر معروف فنکاروں کی تخلیقات کو جمع کرنے وان پر تحقیق کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ چند نام تو ایسے ہیں جو ہر خاص و عام پر زبان زد ہیں لیکن اکثریت ایسے افسانہ نگاروں کی ہے جن کے نام سے بھی عام قاری واقف نہیں ہے۔ اگر ایسے فنکاروں پر الگ الگ تحقیق ہوتی ہے، تب ہی اُن کی فنی صلاحیتوں کے ساتھ انصاف ہو سکے گا۔ پوری کتاب میں انھوں نے افسانہ نگار کی سوانح کے ساتھ تصانیف کا ذکر کیا ہے اور فنی اختصاص کو قائم کرتے ہوئے مشاہیر کی آرا بھی جمع کر دی ہے۔ اس طرح ایک افسانہ نگار کا خاکہ بہت حد

تک واضح ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیپک بدکی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک سہولت فراہم کر دی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب ایک حوالہ جاتی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆☆☆

تبصرہ 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' (تحقیق)؛ مصنف: دیپک بدکی؛ سن اشاعت: ۲۰۱۷ء، ضخامت: ۲۸۸ صفحات، قیمت: تین سو پچاس روپے [-/۳۵۰ روپے]؛ (لائبریری ایڈیشن ۴۹۵ روپے)؛ پبلشر: میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، سرینگر، کشمیر ۱۹۰۰۰۹؛ تبصرہ نگار: محمد غالب نشتر، رانچی؛ مطبوعہ: ماہنامہ زبان و ادب پٹنہ بہار، نومبر ۲۰۱۷ء؛ ص ۶۵-۶۳

اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

-ڈاکٹر رینو بہل

دیپک بُدکی کی تحقیقی تصنیف 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' حال ہی میں منظر عام پر آچکی ہے جو دیپک بُدکی کی ہمہ جہت شخصیت کا آئینہ ہے۔ ہم تو انھیں افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے تھے، پھر انھوں نے تنقید کے میدان میں گل کھلائے اور اب انھوں نے تحقیق کے میدان میں بھی ثمر آور قدم رکھا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں زیر نظر کتاب پر کچھ تاثرات قلم بند کرلوں، میں اس نایاب تحقیقی دستاویز پر دیپک بُدکی کو دِلی مبارکباد دینا چاہتی ہوں۔ 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' ایک ایسا موضوع ہے جس کی تحقیق کے لیے کڑی محنت اور وقت درکار ہے۔ مصنف نے جس طرح اس کتاب کو مرتب کیا ہے اس سے ان کی محنت اور ان کی لگن صاف نظر آتی ہے۔ بُدکی صاحب کا یہ کام تو پی ایچ ڈی کی نوعیت کا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ باضابطہ طور پر ان کو ڈگری نہیں دی جاسکتی ہے کہ وہ کسی یونیورسٹی کے رجسٹرڈ طالب علم نہیں ہیں۔ میرے خیال میں جب کسی ادیب کی کاوش اپنی پہچان بنالیتی ہے تو وہ اپنے آپ میں کسی ڈگری سے کم نہیں ہوتی۔ اس کامیاب کاوش کے لیے دیپک بُدکی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مصنف کی اس بات سے میں متفق ہوں کہ ''ادیب صرف ادیب ہوتا ہے، نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان، نہ سکھ ہوتا ہے نہ عیسائی، ادب کو نسل، مذہب، مسلک اور علاقے کی بنیاد پر تقسیم کرنا سراسر بے ادبی ہے۔'' پھر بھی موجودہ دور میں ادیب کو ہم کبھی خواتین اور مرد کے زمرے میں یا علاقائی درجے کے حساب سے بانٹتے رہتے ہیں۔ شاید یہ اس لیے بھی ضروری ہوگیا ہے کہ ادب کا

دامن بڑا وسیع ہے اور سمندر کو کوزے میں بند کرنا آسان کام نہیں ہے۔

پیش لفظ میں نند کشور وکرم صاحب اس بات پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ کن کن نقادوں نے افسانے کی تاریخ پر اہم تنقیدی کام کیا ہے اور مصنف کی یہ کتاب بھی اسی صف میں کھڑی ہے۔ بقول نند کشور وکرم:

> ''تحقیق ایک کاوش وجستجو کا نام ہے اور اس میں برسوں لگ جانے پر بھی اسے مکمل نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس میں بہت تلاش وجستجو کے باوجود بھی کچھ نہ کچھ چھوٹ ہی جاتا ہے۔ تاہم دیپک بُدکی صاحب نے زیرنظر کتاب میں اپنی جانب سے پوری کوشش کی ہے کہ اسے جہاں تک ممکن ہو مکمل صورت میں پیش کیا جائے اور میرے خیال میں وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ثابت ہوئے ہیں۔

دیپک بُدکی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں اور اب تنقید وتحقیق کے میدان میں بھی انھوں نے پوری آب وتاب کے ساتھ قدم رکھ لیا ہے جس کی غمازی کتاب میں مشمول ان کا مضمون 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار-ایک تعارف' کرتا ہے-- تفصیلی اور معلوماتی مضمون، جس میں غیر مسلم شعرا کی خدمات کا ذکر کیا ہے اور پھر نثر کو دو حصوں میں بانٹ کر اس کی وضاحت کی ہے۔ شاعری وافسانہ نگاری کے علاوہ اردو صحافت میں ہندو وسکھ صحافیوں کے یوگدان کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اردو فکشن میں غیر مسلم افسانہ نگاروں کی تفصیل دینے سے پہلے انھوں نے اردو افسانے کے پیش رو پنڈت رتن ناتھ سرشار اور منشی جوالا پرشاد برق کی خدمات کو اجاگر کیا ہے۔ آزادی سے پہلے کے منظر نامے اور آزادی کے بعد کے منظر نامے پر بھی انھوں نے بھر پور روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں 'اردو ادب کے علاقائی جزیرے' کے تحت ان افسانہ نگاروں کا ذکر بھی کیا ہے جو قومی منظر نامے میں جگہ نہ پا سکے لیکن اپنے محدود علاقوں میں خوب نام کماتے رہے۔ اسی طرح ملک سے باہر مقیم غیر مسلم اردو ادیبوں کے ناموں کا ذکر کیے بنا نہیں رہ سکے ہیں۔ غرض یہ کہ انھوں نے 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار-ایک تعارف' کے تحت ہی بھرپور تفصیل دی ہے جو اپنے آپ میں مکمل ہے۔ افسانہ نگاروں کی

تفصیل کے علاوہ 'اردو افسانے کے پیش رو'، 'آزادی سے پہلے کا منظر نامہ'، 'آزادی کے بعد کا منظر نامہ' اور 'اردو ادب کے علاقائی جزیرے' عنوانات کے تحت بہت کچھ زیر بحث آچکا ہے۔

دیپک بُدکی نے غیر مسلم افسانہ نگاروں کی جو تفصیل بڑی جد و جہد سے جمع کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ہر افسانہ نگار کا سن ولادت، تعارف، اور تصانیف کی تفصیل دے کر ایک ایسی دستاویز تیار کی ہے جو آئندہ نسل کے لیے بڑا کارگر ثابت ہوگا۔ زیر نظر کتاب میں تقریباً ۱۶۰/افسانہ نگاروں کی تفصیل شامل ہے جو خود میں ایک بہت بڑا کام ہے۔ اس کے علاوہ ۱۲۸/افسانہ نگاروں کا ذکر باب ' کچھ نام اور' میں درج کیا گیا ہے۔

میں امید کرتی ہوں کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں نہ صرف اپنی شناخت قائم کرے گی بلکہ مصنف کے تحقیقی کام کی پذیرائی بھی ہوگی اور یہ آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا کام بھی کرے گی۔ میری نیک دعائیں بُدکی صاحب کے ساتھ ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

☆☆☆

تبصرہ 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' (تحقیق)، مصنف: دیپک بُدکی؛ سن اشاعت: ۲۰۱۷، ضخامت: ۲۸۸ صفحات، قیمت: تین سو پچاس روپے [-/۴۵۰]، (لائبریری ایڈیشن ۴۹۵/روپے)؛ ناشر: میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر-190009؛ تبصرہ نگار: ڈاکٹر رینو بہل، چنڈی گڑھ؛ مطبوعہ ہماری زبان دہلی، ۲۱-۱۵ جنوری ۲۰۱۸، جلد ۷۷، شمارہ ۳؛

اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

-ڈاکٹر ذکی طارق

ہندستان ایک بہت بڑا ملک ہے، آبادی کے اعتبار سے بھی اور رقبے کے لحاظ سے بھی۔ آبادی تقریباً سوا ارب ہو چکی ہے جو مختلف مذہبوں پر مشتمل ہے۔ زبانوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو مغرب سے مشرق اور جنوب سے شمال تک تقریباً ۱۶۵۲ رزبانیں اور بولیاں یہاں کے باشندے بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہیں۔

یہ ان زبانوں کا ہی اعجاز ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروکار ہونے کے باوجود یہاں کے باشندوں میں آپس میں اتحاد، یگانگت اور ایکتا کا ایک مشترک احساس پایا جاتا ہے جو دوسرے ممالک میں شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہو۔ ابتدا ہی سے یہاں کے باشندوں میں یہ مشترک احساس فروغ پاتا رہا ہے۔ مختلف علاقوں اور مذاہب کے پیروکار اپنی ضروریات کے ساتھ جب ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں تو ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات اور اپنی بات کو مضبوطی سے اپنے سامنے والے فریق کو سمجھانے کے لیے جس شدّت، محبت اور یگانگت سے پیش آتے ہیں اس سے دھیرے دھیرے ایک نئی زبان وجود میں آنے لگتی ہے۔ اردو زبان بھی اسی طرح وجود میں آئی اور آہستہ آہستہ نہ صرف ایک مخلوط و مشترکہ زبان (Lingua franca) بنتی چلی گئی بلکہ یہاں کے عوام کے دلوں پر اپنی شیرینی اور لطافت کے سبب ان کے دلوں پر راج کرنے لگی۔ چنانچہ جب اردو زبان میں شاعری اور نثر لکھنے کا رواج شروع ہوا تو نہ صرف مسلمان بلکہ وہ غیر مسلم حضرات بھی اس زبان میں اپنے تجربات، احساسات اور جذبات قلم بند کرنے لگے جو اس زبان کے معترف ہو چکے تھے۔

دیپک بُدکی ایک معروف افسانہ نگار ہیں ۔ اپنے افسانوں میں وہ جس تخلیقی زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ ان کو ہم عصروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ اب تک ان کے سات افسانوں کے مجموعے شائع ہوکر اہل نظر سے خراج تحسین وصول چکے ہیں۔ وہ نرے افسانہ نگار ہی نہیں ہیں بلکہ ایک بالغ نظر نقاد اور محقق بھی ہیں۔ اس ضمن میں ان کی تین تنقیدی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں مختلف ادبا اور شعرا کی تخلیقات پر انھوں نے اپنی بے لاگ اور بے باک رائے کا اظہار مکمل دلائل اور براہین کے ساتھ سپر د قلم کیا ہے۔ اب تازہ تصنیف 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار'، جو ایک تحقیقی کام ہے، پر انھوں نے بڑی سنجیدگی اور عرق ریزی کے ساتھ کام کیا ہے جس میں ایسے ایسے کہانی کاروں کو تلاش کیا ہے جن کو اردو کے قارئین ہی نہیں بلکہ ان کے احفاد بھی بھلا چکے ہیں۔ ان کہانی کاروں نے تقسیم ملک کے بعد جب اردو زبان بیگانہ ہوکر رہ گئی تھی، تب بیانگ دہل دشمنان اردو کو یہ یقین دلایا کہ اس زبان نے ہندستان کی مٹی سے جنم لیا ہے اور بڑی بے خوفی کے ساتھ اردو کا پرچم لے کر اردو زندہ باد کے نعرے ہی نہیں لگائے بلکہ اپنے جذبات و احساسات کو اس زبان میں قلم بند کر کے صفحۂ قرطاس کی زینت بنا کر اردو زبان و ادب کو مالا مال کر دیا۔ زیر نظر تصنیف میں شامل بہت سے قلم کار بے حد معروف ہوئے اور ادب کا حصہ بنے۔ اگر ہم افسانے کے مصنفین پر ہی غور کریں تو پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، دیویندر ستیارتھی، اوپندر ناتھ اشک، سدرشن اور جمنا داس اختر ایک طویل فہرست ہے جن کے ذکر کے بغیر افسانے کی تاریخ مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن بُدکی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ڈھیر سارے ایسے نام بھی کھوج نکالے جنھوں نے کم لکھا، لیکن کارآمد لکھا اور وہ اس قابل تھے کہ افسانے کی تاریخ میں شامل ہو سکیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے ایسے گمنام افسانہ نگاروں کا بھی ذکر کیا ہے جن کا مجموعہ تو نہیں شائع ہو سکا البتہ ان کی کہانیاں مختلف رسائل، کالج میگزینوں یا مجلّوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ مرد مصنفین کے ساتھ انھوں نے خواتین کہانی کاروں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔

بُدکی صاحب نے مشمول افسانہ نگاروں کے کوائف کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقات پر مختصر

گفتگو کرتے ہوئے مشاہیر کی آرا بھی درج کی ہیں جس سے یہ ایک حوالہ جاتی کتاب تیار ہوگئی ہے جو آنے والے وقت میں ان طلبہ کے کام آئے گی جو ان مصنفین پر کوئی تحقیقی کام کرنا چاہیں گے۔ ان طلبہ کو خام مواد اور اشاریہ بھی دستیاب ہوگا۔

کتاب میں شامل افسانہ نگاروں کے حوالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تصانیف میں عالمی انسانیت کا حوالہ ہے، سماجی اور ثقافتی تذکروں کے ساتھ آدم و حوا کی جذباتی کیفیت کا ذکر ہے۔عورتوں کے تئیں ہمدردی کا اظہار بھی ہے اور مرد کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والی گفتگو بھی۔ روایت کی پاسداری بھی ہے اور مشرقی قدروں کا احترام بھی۔بعض کہانی کار متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں تو بعض نے سماج کے ایسے لوگوں کو اپنے قلم کا نشانہ بنایا ہے جو سماج کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

غرض کہ دیپک بُدکی کی یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔افسانے کے حوالے سے اس کتاب میں وہ تمام مواد موجود ہے جس کی افسانے کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ایک تاریخ داں کو ضرورت پڑسکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ’اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار‘ اردو دنیا میں نہ صرف پسند کی جائے گی بلکہ اردو کی ہر لائبریری کی زینت بنے گی۔

☆☆☆

تبصرہ ’اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار‘ (تحقیق)، مصنف: دیپک بُدکی؛ سن اشاعت: ۲۰۱۷ء، ضخامت: ۲۸۸/صفحات؛ قیمت: تین سو پچاس روپے [۳۵۰/روپے]، (لائبریری ایڈیشن ۴۹۵/روپے)؛ ناشر: میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، بالمقابل فائر سروس ہیڈ کوارٹر، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر-190009؛ تبصرہ نگار: ڈاکٹر ذکی طارق، مطبوعہ ماہنامہ ’نیا دور‘، لکھنؤ، نومبر ۲۰۱۷ء (ص ۵۱)

اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

-احمد عثمانی

دیپک بُدکی مشہور ومعروف افسانہ نگار ہیں ۔ان کے پانچ افسانوی مجموعہ شائع ہوکر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ان کے دو افسانوی مجموعے 'ادھورے چہرے' کے تین ایڈیشن اور 'چنار کے پنجے' کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب، اورایک افسانچوں کا مجموعہ 'مٹھی بھر ریت' بھی کافی سراہے گئے۔

بدکی نہ صرف افسانہ نگار ہیں بلکہ تحقیق ،تنقید اور تبصرے پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ عصری تحریریں ،عصری شعور،عصری تقاضے اور زیر تبصرہ کتاب 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' ان کی معرکتہ الآرا کتاب ہے۔اس تحقیقی کتاب میں انھوں نے بہت عرق ریزی کی اور اردو افسانے کے باوا آدم پریم چند سے لےکر پریم عالم بعد پدم ناتھ شرما اس تحقیقی کتاب کے آخری افسانہ نگار ہیں۔

افسانے کی تحقیق اور تنقید پر بقول نند کشور وکرم سو سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن تنقیدی کتاب دیپک بُدکی کی ہے۔نند کشور وکرم نے 'غیر مسلم' پر اعتراض کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تمام افسانہ نگاروں کو سمیٹا جاتا تو اس کتاب کی کئی جلدیں شائع کرنی پڑتیں اور برسوں لگ جاتے ۔اس لیے دیپک بُدکی نے صرف ایک شعبہ پر کام کیا اور جم کر کیا۔اتنے سارے غیر مسلم افسانہ نگاروں کو ایک جگہ جمع کرنا بھی ایک بہت بڑا کام ہے جو دیپک بُدکی نے کیا۔ دیپک بُدکی نے بھی حرف آغاز میں لکھا:

> "...موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کو کم سے کم اتنا تو احساس دلایا جائے کہ اردو گنگ وجمن کی شہزادی ہے ۔اس کے گیسو ہر مذہب کے فن کاروں نے سنوارے

ہیں۔‘‘

دیپک بُدکی نے ہر افسانہ نگار سے انصاف کیا۔ جس طرح انھوں نے پریم چند پر لکھا اس طرح ہر افسانہ نگار پر لکھا۔ نام، اصل نام، مقام پیدائش، تعلیم، پیشہ اور افسانہ نگار کے پورے کوائف رقم کیے۔ کسی کے کم نہ کسی کے زیادہ۔

ہم اردو پڑھنے والے چند ہی غیر مسلم افسانہ نگاروں کو جانتے پہچانتے تھے۔ ان میں تین بڑے نام: پریم چند، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی سے مل چکا ہوں۔ بلدیو شانت سے میری خط و کتابت رہی ہے۔ بہت سے افسانہ نگاروں کو پڑھا۔ دیپک بُدکی نے جس تفصیل سے یہ کتاب ترتیب دی ہے اسے میں کمال کہتا ہوں کیونکہ اب تک جن محقق حضرات نے تحقیق و تنقید پر کتابیں لکھی ہیں بس وہ اس گلی سے گزرے ہیں ۔ گلی کے مکینوں سے رشتہ نہیں جوڑا۔ یہ کام دیپک بُدکی نے کیا کہ نہ صرف رشتہ جوڑا بلکہ ان کے خاندانی کوائف اور زندگی گزارنے کے طریقہ پر کافی مواد مستقبل میں تشخیص کرنے والوں کے لیے چھوڑا ہے۔

☆☆☆

☜ ’اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار (تحقیق)، تبصرہ نگار: احمد عثمانی، ماہنامہ بیباک، مالیگاؤں، جلد ۱۳، شمارہ ۱۵۳؛ جون ۲۰۱۹ء

تبصرہ

اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

-ڈاکٹر اشرف آثاری

اردو فکشن میں دیپک بُدکی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آج تک ان کے لگ بھگ چھ افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ تحقیق و تنقید وغیرہ پر بھی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں زیر تبصرہ بھی ایک ہے اور ایک اہم موضوع پر لکھی گئی ہے۔ گو کہ اس سے قبل بھی اس موضوع پر کئی قلم کاروں نے حتیٰ المقدور لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن دیپک بُدکی نے محققانہ ذہن کو استعمال میں لا کر اس موضوع پر ایک نئے ڈھنگ سے کچھ کہنے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش و کاوش میں کمیاب بھی نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب واقعی مستقبل میں اس موضوع پر کام کرنے والے طالب علموں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی اور ایک انسائیکلوپیڈیا سے کم نہیں ہے۔ اس میں کافی لوگ رہ بھی گئے ہوں گے جیسے منوج شیری جو ریاستی پولیس میں آفیسر ہیں اور جن کے ڈراموں کے مجموعے پر تبصرہ بھی 'نگینہ' کے زیر نظر شمارے میں شامل ہے۔ کتاب عمدہ چھپی ہے۔ سرورق، کمپیوٹر کمپوزنگ، گیٹ اپ اور کاغذ وغیرہ سب ٹھیک ہے اور قیمت بھی مناسب اور واجبی ہے۔ لیکن اس طرح کی ریفرنشل کتاب کا مجلد ہونا ضروری ہے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ مصنف نے کتاب کو اپنے پوتوں سے منسوب کیا ہے۔ سپاس نامہ میں اس تحقیقی کام کو منظر عام پر لانے میں معاونت کے لیے کئی لوگوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔

پریم چند سے شروع کر کے دیپک بُدکی نے کاہن سنگھ جمال تک اردو افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے جن میں معروف اور گمنام فکشن نگار بھی شامل ہیں۔ ظاہر بات ہے ان سب کے متعلق معلومات حاصل کرنا واقعی ایک کار دارد والا معاملہ ہے جو سخت محنت اور فرصت کا متقاضی بھی ہے۔

اس کے لیے مصنف کو کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے اور متعدد کتابوں کا مطالعہ بھی کرنا پڑتا ہے جس کا اندازہ کتاب کے آخر میں لکھے گئے حوالہ جات اور کتابیات وغیرہ کی فہرستوں سے ہوتا ہے۔

اختتامیہ میں کچھ متضاد باتوں کا اظہار ملتا ہے۔اول یہ کہ بلالحاظ مذہب وملت اردو داں طبقہ اردو فکشن نگاری میں پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور رام لعل کی اہمیت اور افادیت اور مقام ومرتبے سے منحرف نہیں ہیں۔اور کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھا رہا ہے۔اظہار رائے کی آزادی ہے۔پسند ناپسند اور ترجیحات یکساں نہیں الگ الگ ہوسکتے ہیں۔مصنف خود فرماتے ہیں کہ آزادی سے قبل آریہ سماج نے بھی ہندوؤں میں بیداری پھیلانے کے لیے اردو زبان کا کھل کر استعمال کیا۔ اتنا ہی نہیں جنگ آزادی کے دوران بھی اردو شعرا کے انقلابی نعروں اور وطن پرستی کے نغموں نے لوگوں کا لہو گرمایا اور ان کے ذہن وضمیر کو بیدار کیا۔

مصنف فرماتے ہیں کہ ”...ابتدائی دور میں تبلیغی کاموں کے لیے نثر کا کافی استعمال ہوتا رہا اور اسے (اس سے) بہت کام لیے گئے، جیسے دینی ارشادات، اخلاقی درس، پند ونصائح، قوم پرستی اور روحانی مباحث۔یہاں تک کہ آزادی سے قبل آریہ سماج نے بھی ہندوؤں میں بیداری پھیلانے کے لیے اردو زبان کا کھل کر استعمال کیا۔اطلاعاً عرض ہے کہ آج بھی اگر ہندوستان میں فرقہ پرستی کی وجہ سے دم توڑتی ہوئی اردو زبان زندہ ہے تو یہ صرف ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں صرف دینی مدارس کی وجہ سے ہے جہاں یہ زبان اب تک بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔جب کہ سرکاری اسکولوں اور اداروں میں دانستہ طور پر اسے کب کا جلاوطن کیا جا چکا ہے۔جب کہ پاکستان میں مدارس، کالجوں، یونیورسٹیز، پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا وغیر پر زندہ و پائندہ ہے۔“

کیا وجہ ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اس کی اتنی بُری حالت ہوگئی؟ رہی بات دیپک بُدکی کے کوٹ (quote) کیے ہوئے نامور پروفیسر امرناتھ جہا، سابقہ وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی کے تحریر کیے ہوئے پنڈت جگ موہن ناتھ رینہ شوقؔ کے شعری مجموعے 'پیام شوقؔ' کے

پیش لفظ کے اقتباس سے کہ ''صد ہا ہندو خصوصاً کشمیری، کھتری، کائستھ صاحبان، شہروں کے رہنے والے اور حکومت کی مشین کے پرزے، غزل، مثنوی، قصیدہ حتیٰ کہ مرثیہ کی تصنیف میں شب و روز منہمک رہتے تھے۔ باوجود اس کے ان میں سے ایک بھی مسلمہ استاد کا پایہ حاصل نہ کرسکا۔ آج بھی اردو لٹریچر کی تاریخ میں کسی ہندو کا نام اردو کے مسلمہ بانیان کی فہرست میں نہیں ملتا۔ نسیمؔ، چکبستؔ یا سرشارؔ کے کلام کی تعریف میں بادل نخواستہ کسی کی زبان سے ایک آدھ لفظ نکل گیا تو وہ کسی شمار میں نہیں۔ خیال تو فرمائیے کہ ڈھائی سو برس کی طویل مدت اور دوسرے درجے کے شعرا کی صنف میں صرف تین نام۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کو کبھی ہندوستانی فطرت سے لگاؤ نہیں رہا۔ وہ ہندی ذہنیت کے لیے بدیسی ہی رہی۔'' یا پھر پریم چند کے دیا نرائن نگم، ایڈیٹر 'زمانہ' کانپور کو لکھے گئے خاکے کے اس اقتباس سے کہ '' آج تک اردو میں کسی ہندو کو فیض حاصل ہوا جو مجھے ہوگا۔'' میری ذاتی رائے ہے کہ ان دونوں اقتباسات سے پروفیسر صاحب اور پریم چند کی قدر و منزلت کم ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

اول تو یہ کہ جس زبان کو آریہ سماج نے مذہبی پرچار کے لیے چنا، ہندوستان کی جنگ آزادی میں اہم اور کلیدی رول ادا کیا، بھانت بھانت کی زبانیں بولنے والے الگ الگ رنگ و نسل، مذہب و مسلک کے لوگوں کو جوڑے رکھا اور یہ اُن میں رابطے کی زبان رہی وغیرہ، اس زبان کو بقول پروفیسر صاحب کے ''ہندوستانی فطرت سے لگاؤ کیوں نہیں رہا'' اور منشی پریم چند کو منشی پریم چند اردو زبان میں لکھے گئے اُن کے افسانوں نے ہی بنایا۔ اگر اردو زبان کو وہ اپنا وسیلۂ اظہار نہ بناتے اور صرف ہندی سے ہی جڑے رہتے تو شاید اُنھیں کوئی نہیں جانتا اور وہ دھنپت رائے ہی رہتے۔ اس طرح کی باتیں اقتباسات یا آرا کو گیان چند جین کے عمر بھر اردو کی روزی روٹی کھانے اور ایک ارفع مقام تک پہنچنے کے بعد آخری وقت میں محض فرقہ واریت کی بنا پر اس کا رسم الخط اس لیے تبدیل کرنے کی بات کرنے کے تناظر میں دیکھنا چاہیے کہ یہ عربی اور فارسی آمیز ہے جس کے ساتھ مسلمان جڑے ہوئے ہیں۔ دیپک بُدکی پریم چند کو اردو افسانے کے اولین ستون قرار دیتے

ہیں جب کہ پریم چند کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ ”آج تک اردو میں کسی ہندو کو فیض حاصل ہوا جو مجھے ہوگا؟“ خود مصنف بھی یہ کہہ کر اس کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ”اردو مراکز دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور بھوپال کے سوتے خشک ہو چکے ہیں“ لاہور، کراچی، ملتان، راولپنڈی، اسلام آباد وغیرہ پاکستانی شہر اس میں شامل نہیں۔

☆☆☆

﴿تبصرہ 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' (تحقیق)؛ مصنف: دیپک بُدکی؛ سن اشاعت: ۲۰۱۷ء، ضخامت: ۲۸۸ صفحات؛ قیمت: تین سو پچاس روپے [۳۵۰ روپے] (لائبریری ایڈیشن ۴۹۵ روپے)، ناشر: میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر۔ تبصرہ نگار: ڈاکٹر اشرف آثاری؛ مطبوعہ نگینہ انٹرنیشنل، سرینگر کشمیر؛ (گولڈن جوبلی نمبر)؛ جلد ۵۰، شمارہ ۲۰۱؛ جنوری تا اگست ۲۰۱۸ء۔

اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

-محمد متین ندوی

دیپک بُدکی افسانے کی دنیا کا ایک معتبر اور معروف نام ہے، بہت سے مشاہیر اہل قلم نے ان کی افسانہ نگاری پر بڑے اچھے اچھے اور طویل مضامین لکھے ہیں، جن میں ان کی کہانیوں میں موجود خوبیوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ سہ ماہی انتساب عالمی نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں چند سال پہلے انتساب کا ایک ضخیم نمبر (دیپک بُدکی نمبر) نکالا تھا۔ جسے ادبی دنیا میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ 'شاعر' اور 'اسباق' کے بھی خصوصی شمارے نکل چکے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ دو کتابیں (۱) ورق ورق آئینہ، اور (۲) دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری، بھی ان پر شائع ہوئی ہے۔

دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری کے تعلق سے قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''میری فہم یہ ہے کہ آپ نہایت عقلی ذہن اور روشن سوچ رکھتے ہیں جو لگ بھگ آپ کی ہر کہانی سے مترشح ہوتی ہے، اس لیے جس مجلّہ میں کہیں آپ کی کہانی نظر آتی ہے کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح اسے پڑھ کر لطف اٹھاؤں۔ پچھلے دنوں 'زیبرا کراسنگ...' والی کہانی اسی طرح لپک کر پڑھ ڈالی تھی۔ اس کی نازک اور معنی خیز رمزیت نے شدت سے متاثر کیا تھا۔ آپ کے تخلیقی ذہن کی انفرادیت، دکھوں اور محرومیوں سے نڈھال انسانی روح کی تلاش میں ہی ملتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ کسی دوسرے کہانی کار کے یہاں ایسا رچاؤ، compassionate رویہ اور pathos کم از کم مجھے نظر نہیں آیا۔ کہیں ہے بھی تو سرسری۔ قاری کے دل میں تیر کی طرح نہیں اترتا۔''

دیپک بُدکی صرف مشہور افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ اچھے محقق اور نقاد بھی ہیں، اس وقت

میرے سامنے ان کی جو کتاب ہے اس کا تعلق فکشن سے نہیں بلکہ تنقید و تحقیق سے ہے جس کا نام ہے 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار'۔ یہ تحقیقی و تنقیدی کتاب ان کے برسوں کی محنت کے نتیجہ میں منظر عام پر آئی ہے، جو اپنے انداز کی ایک منفرد کتاب ہے، ابھی تک غیر مسلم افسانہ نگاروں پر اس نوعیت کا کام نہیں ہوا تھا حالانکہ اس موضوع پر لکھنے کی اشد ضرورت تھی، اس کتاب کی اہمیت اور اس کی ادبی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب مستقبل کا مورخ غیر مسلم افسانہ نگاروں کا ذکر کرنا چاہے گا تو یہ کتاب اس کے لیے امداد غیبی ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس کتاب میں صرف معروف غیر مسلم افسانہ نگاروں کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ بہت سے غیر معروف افسانہ نگار بھی موجود ہیں۔ جن کی صرف ادبی حیثیت کو ہی نہیں اجاگر کیا گیا بلکہ ان کی شخصیت اور ان کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈیڑھ سو سے زائد معروف و غیر معروف غیر مسلم افسانہ نگاروں کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ جن کی شخصیت اور ادبی خدمات پر دیپک بُدکی صاحب نے کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ چند افسانہ نگاروں کے نام یہ ہیں: پریم چند، رنبیر سنگھ، دولت رام گپتا، دھرم ویر، راجندر سنگھ بیدی، جمنا داس اختر، مانک ٹالا، امر سنگھ، نند کشور وکرم، کرشن گوپال عابد، ساگر سرحدی، بلراج بخشی، آشا پربھات، آنند لہر، ڈاکٹر کیول دھیر، طالب کاشمیری، پریم عالم، گلشن کھنہ وغیرہ۔

م م راجندر کے متعلق کتاب کے صفحہ نمبر ۱۰۶ پر دیپک بُدکی لکھتے ہیں:

"م م راجندر نہ صرف افسانہ نگار ہیں بلکہ دوسری ادبی اصناف میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانی حقیقت پسندی ملتی ہے جو بارہا ان کی تصوراتی دنیا کو چھو لیتی ہے۔ ایک تہذیب یافتہ معاشرہ جہاں نسل، مذہب، رنگ اور طبقہ کا بھید بھاؤ نہ ہو، جہاں اخلاص و اخلاق کی فراوانی ہو اور جہاں انسان میں انسانیت نظر آئے، ان کا آئیڈیل ہے۔ ان کے افسانوں میں گاؤں و شہروں کی زندگی اور ہندو مسلم کردار، جو عموماً غریب اور متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر افسانے کرداری ہیں۔"

دیپک بُدکی کی اس کتاب کی جتنی اہمیت آج ہے اس سے کہیں زیادہ اس کی اہمیت اور ضرورت مستقبل میں ہوگی۔ اس لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ ان کا ایسا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ ہے جس کی اردو ادب کو ہمیشہ ضرورت ہوگی۔ کتاب کا پیش لفظ مشہور فکشن نگار نند کشور وکرم نے لکھا ہے، جس میں انھوں نے کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ حوالہ جاتی کتاب جوان کا تنقیدی و تحقیقی کارنامہ ہے، ان کی دیگر کتابوں کی طرح ادبی دنیا میں مقبول ہوگی، ایسا میرا یقین ہے۔

☆☆☆

تبصرہ 'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار'، مصنف دیپک بُدکی؛ سن اشاعت: ۲۰۱۷ء، ضخامت:: ۲۸۸/صفحات؛ قیمت: تین سو پچاس روپے [۳۵۰/روپے] (لائبریری ایڈیشن ۴۹۵/روپے)، ناشر: میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر۔ تبصرہ نگار محمد متین ندوی، مطبوعہ سہ ماہی انتساب عالمی سرونج، جلد ۶، شمارہ ۲، اپریل- جون ۲۰۱۸ء، ص ۳۸۱-۳۸۰۔

افسانہ 'ڈاکٹر آنٹی' - ایک جائزہ

-ڈاکٹر صفیہ بانوائے شیخ

اردو افسانہ جب سے وجود میں آیا ہے بحث و مباحث کا موضوع رہا ہے۔ ابتدا میں قدیم داستانوی بیج سے پھوٹے روایتی افسانے لکھنے کا رواج عام تھا مگر آگے چل کر وہ افسانے چہرہ اور ہیئت بدل بدل کرنت نئے ناموں سے ہمارے روبرو پیش ہوتے رہے۔ رومانی، حقیقت پسند، نفسیاتی، ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید...! گو افسانے کی عمر محض سوا سو سال ہے پھر بھی اس قلیل وقت میں اس نے لمبے لمبے ڈگ بھر کر عالمی افسانے سے قدم ملانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں بہت سارے افسانہ نگاروں نے شرکت کی۔ موجودہ دور میں بھی کئی افسانہ نگار اس میدان میں فعال ہیں جن میں دیپک بُدکی ایک اہم نام ہے۔

دیپک بدکی کے چوتھے افسانوی مجموعے 'ریزہ ریزہ حیات' کا پہلا افسانہ 'ڈاکٹر آنٹی' ایک ایسا منفرد کرداری افسانہ ہے جو بہترین افسانوں کی کسوٹی پر کھرا اُترتا ہے۔ یہ ایک کثیر الجہت افسانہ ہے جس میں ڈاکٹر آنٹی کے کردار کو الگ الگ زاویوں سے دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ اس مجموعے میں ۱۸/افسانے شامل ہیں۔ مذکورہ افسانے کا مرکزی کردار کملا دیوی عرف ڈاکٹر آنٹی ہے جو نسوانی امراض کی ماہر (Gynecologist) ہے۔ وہ اصول پرست وانسانیت کی خیر خواہ ہے اور مریض کی زندگی بچانے اور اس کو صحتیاب کرنے کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔ افسانے کی ابتدا میں سریندر اپنے دوست کی بہن للتا کے، جو بی ایڈ کرنے کی غرض سے سرینگر میں عارضی طور پر مقیم ہے، گھر اکثر آتا جاتا ہے۔ ایک روز اتفاق سے وہاں اس کی ملاقات کملا دیوی اور اس کی گود لی ہوئی بیٹی سریتا سے ہوتی ہے۔ کملا دیوی اور سریتا کشمیر کی سیاحت کے لیے چند دنوں کے لیے آئے ہیں۔

ولادت سے وفات تک انسان کئی رشتوں میں بندھ جاتا ہے مگر ان تمام رشتوں میں اعلیٰ اور ارفع ماں کا رشتہ ہوتا ہے۔ ماں کی ممتا تمام تر محبتوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ یہ کبھی انتہائی لاڈ پیار کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی غصے، نفرت اور ناراضی کے روپ میں۔ سچ تو یہ ہے کہ ماں کے لاڈ پیار کا جذبہ دائمی ہوتا ہے جبکہ ناراضی، غصہ اور نفرت کا جذبہ عارضی ہوتا ہے۔ دراصل ماں کے لاڈ پیار میں شفقت اور اخلاص کا جذبہ ہمیشہ غالب رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سریندر جونہی ڈاکٹر آنٹی کے تعلق میں آتا ہے وہ اس میں اپنی کھوئی ہوئی ماں کو تلاشتا ہے۔ اس کی اپنی ماں بچپن ہی میں سورگباش ہو چکی ہے اس لیے اپنے نفسیاتی خلا کو پُر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے افسانے سے ایک اقتباس:

> ''آنٹی سیدھی سادی، درمیانہ قد کی، معمولی سوتی ساڑی میں ملبوس خلوص اور دردمندی کا پیکر لگ رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر کسی کو یہ گماں بھی نہ گزرتا کہ وہ نسائی امراض کی مشہور اور کامیاب ڈاکٹر ہے۔ میں پہلی ہی ملاقات میں اس کی شخصیت سے مرعوب ہو گیا اور اس میں اپنی کھوئی ہوئی ماں ڈھونڈنے لگا۔'' (ص ۱۳)

مذکورہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر آنٹی کی وہ شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے جس سے ماں کے خلوص، جذبات اور احساسات کی شدّت اور اپنائیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو نہ صرف سریندر کو بلکہ قاری کو بھی متاثر کرتا ہے۔ ویسے بھی ڈاکٹر آنٹی نے سریتا کو اپنے بڑے بھائی سے مانگ کر گود لیا ہے اور پھر ماں کی طرح پالا ہے۔ ماں کے جذبات ہمیشہ سچے اور پاک ہوتے ہیں اور ڈاکٹر آنٹی ماں کی بہترین مثال بن کر ابھرتی ہے۔ کملا دیوی کو سریندر اپنی ماں کے روپ میں دیکھتا ہے چنانچہ کہتا ہے: ''آنٹی آپ تو میری ماں سمان ہیں۔'' (ص ۱۳)

کملا دیوی چنانچہ نسوانی امراض کی ماہر ہے، جب وہ سریندر کے گھر جاتی ہے وہاں پر وہ سریندر کی پھوپھی کو بیمار دیکھ کر اس کی جانچ کرتی ہے اور کچھ دوائیاں لکھ دیتی ہے۔ کوئی فیس نہیں لیتی اور گھر کے فرد کی طرح حسنِ سلوک سے کام لیتی ہے۔ اس کی شرافت اور حلیمی کا اندازہ اس سے

بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ موجودہ صارفی سماج میں ڈاکٹر تاجر بن کر رہ گئے ہیں، اگر وہ چاہتی تو کشمیر کی سیر و تفریح کر کے چلی جاتی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور تفریح کے دوران بھی پیشہ ورانہ فرض نبھالیا۔ ڈاکٹر آنٹی کی ان عنایتوں کو دیکھ کر سریندر کا جذبۂ تعظیم و احترام اور بھی پختہ ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ دور میں ڈاکٹر غیر قانونی اسقاط حمل کر کے یا پھر رحم میں لڑکیوں کو مارنے کا کام کر کے خوب دولت بٹورتے ہیں۔ حال ہی میں ایک سروے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہمارے ملک کی کئی ریاستوں میں لڑکوں کے مقابلے لڑکیوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے کیونکہ ہمارے سماج میں دختر کشی کی بری عادت عام ہوچکی ہے۔ مگر ڈاکٹر کملا دیوی نے ایسا گھناؤنا کام کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔

کملا دیوی کشمیر سے دہلی واپس چلی جاتی ہے اور اپنے کام میں روزمرّہ کی طرح جٹ جاتی ہے۔ اُدھر سریندر بھی کشمیر کی ملازمت چھوڑ کر دہلی چلا جاتا ہے اور ڈاکٹر آنٹی کے گھر و کلینک پہنچ جاتا ہے۔ وہاں اس کو ڈاکٹر آنٹی کی نیک سیرت کے بارے میں مزید معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر آنٹی کا مکان اور کلینک ایک دوسرے سے ملحق ہوتے ہیں۔ وہ اکیلی نہیں رہتی ہے بلکہ سریتا کے علاوہ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی امرناتھ اور چھوٹی بہن شاردا رہتی ہیں۔ تینوں ناکتخدا ہیں۔ پدرسری سماج کی روایت کے خلاف اس گھر میں ڈاکٹر آنٹی کے کندھوں پر سارے کنبے کا بوجھ ہے۔ سریتا کی دیکھ بھال میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑتی، وہ ڈاکٹری کی تعلیم پا رہی ہے۔ دوسری جانب وہ اپنے چھوٹے بے کار بھائی امرناتھ اور چھوٹی بہن شاردا، جو دانتوں کی ڈاکٹر تو ہے مگر نام کے لیے، کی ذمہ داری بھی اٹھاتی ہے۔ یہ ساری باتیں سریندر کے ذہن میں ماں کے تصوراتی رشتے کو مزید مستحکم بناتی ہیں۔ سریندر کی حیرانی اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جب وہ ڈاکٹر آنٹی کے ماضی کے بارے میں یعنی تقسیم ہند کے دوران ان بھائی بہنوں کی نقل مکانی کرنے کے بارے میں ساری کہانی ہمہ تن گوش ہو کر سنتا ہے۔ راوی بیان کرتا ہے کہ:

''ہجرت کی داستان سناتے سناتے آنٹی نہ روئی، اور نہ آہیں بھریں اور نہ جذبات

میں بہہ گئی۔'' (ص ۱۶)

افسانہ نگار ڈاکٹر آنٹی کی قوت برداشت، صبر و تحمل، ایثار، استقامت اور عالی ہمتی کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ کملا دیوی عام عورتوں سے بالکل مختلف ہے، وہ اپنی آپ بیتی اور اس کے ساتھ لپٹے کرب کو بردباری اور متانت سے بیان کرتی ہے۔ ہجرت کا کرب سہنا آسان ہوتا ہے نہ کہنا۔ وہ دوسری عورتوں کی مانند گھٹ گھٹ کر اور گریہ وزاری کر کے جی سکتی تھی مگر اس نے ماضی کے تاریکیوں میں کھونے کے بجائے انھیں یکسر بھلا لیا اور اپنی زندگی کو روشنی اور تابانی بخشنے کی ہر دم کوشش کی جس کا نور وہ اپنے معاشرے میں بھی پھیلاتی چلی گئی۔

تقسیم ہند کے حالات سے سریندر پہلے ہی واقف تھا مگر جب اُس نے ڈاکٹر آنٹی سے اس کی آپ بیتی اور آنکھوں دیکھی سن لی تو سراپا غم ہو گیا۔ تقسیم ہند ایک بڑا سانحہ تھا جس میں لاکھوں زندگیاں تباہ و برباد ہو گئیں، ہزاروں معصوم لڑکیوں اور عورتوں کی عزت تار تار ہو گئی، لاکھوں بچے، جوان اور بوڑھے اپنے گھر بار چھوڑ کر نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے اور ہزاروں لوگ ہجرت کے دوران موت کی نیند سو گئے۔ اس مختصر دورانیے میں نہ جانے کتنوں کے خواب ٹوٹ گئے اور کتنوں کی خواہشیں دفن ہو گئیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر آنٹی اور اس کے بھائی بہن کے کنوارے رہنے کی وجہ کے بارے جو کچھ سریندر سوچتا ہے اُس کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے:

> ''کون جانے آنٹی کے کتنے خواب ادھورے رہ چکے ہوں۔ کتنے شیش محل ٹوٹ چکے ہوں۔...اسی کابوس کے ڈر سے تینوں نے یہ فیصلہ لیا تھا کہ وہ شادی نہیں کریں گے۔ تاہم اپنے خلا کو پُر کرنے کے لیے کملا دیوی ہی فعال تھی۔'' (ص ۱۶)

تقسیم کے ایسے دلخراش سانحے سے گزرنے کے بعد ڈاکٹر آنٹی کا خاموش اور صابر رہنا اُس کے کردار کی اعلیٰ ظرفی کو ظاہر کرتا ہے۔ غم حیات کے پہاڑ کی نیچے دبے ہونے کے باوجود ڈاکٹر آنٹی نے خود کو کبھی کمزور اور بے سہارا نہیں سمجھا اور نہ ہی بے بسی کے عالم میں مبتلا ہو گئی۔ وہ درد و غم اور رنج و الم کو بھلا کر خود کو فعال رکھتی اور اس فعل میں اس کی رجائیت کا بہت بڑا ہاتھ رہا۔ بقول

شاعر:

؎ کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت　　　جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

ڈاکٹری کا پیشہ سراپا خدمت ہے، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر کے پاس مریض وقت بے وقت اپنا علاج کرانے کی غرض سے آتے ہیں۔ بہ ایں ہمہ وقت و حالات کے ساتھ انسان کی ضرورتوں میں بدلاؤ آ چکا ہے۔ پہلے جس طرح چھوٹی چھوٹی بیماریوں کے لیے گھریلو نسخے اپنائے جاتے تھے وہ طریقۂ کار بالکل ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو جس کو دیکھو وہ چھوٹی سی بیماری کے لیے بھی ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے اور اپنی صحت کے لیے لاکھوں روپے خرچ کرنے کو ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر آنٹی کو مجبوراً تھوڑی سی فیس لینی پڑتی ہے تاکہ لوگ معمولی بیماریوں کے لیے اس کے دروازے پر دستک نہ دیں اور اس کو وقت بے وقت پریشان نہ کریں۔ ڈاکٹری پیشے سے متعلق آنٹی کئی سوالوں کا جواب یوں دیتی ہے:

☆ ''سریندر بیٹے، تم کیا جانو ہم ڈاکٹروں کی زندگی بڑی عجیب سی ہوتی ہے۔ نہ دن کو چین اور نہ رات کو آرام۔'' (ص ۱۷)

☆ ''ہمارے زمانے میں نزلہ زکام ہو جاتا تھا تو گھر پر ہی کوئی دیسی علاج کر لیتے تھے۔ اب کسی کو چھینک بھی آ جائے تو ڈاکٹر طلب ہوتا ہے۔ فیس دے کر وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر کو خرید لیا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو، جو بات بات پر ڈاکٹر کے پاس چلے آتے ہیں، دور رکھنے کے لیے مجھے فیس لینا پڑتی ہے۔'' (ص ۱۷)

اس افسانے کے ہر پہلو میں پیغام چھپا ہے اور افسانہ نگار اپنا مقصد بڑی فنکاری اور ہنرمندی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ کملا دیوی امراضِ نسواں کی ایک مشہور، کامیاب اور ایماندار ڈاکٹر ہے جس کے یہاں اکثر و بیشتر مریضوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ڈاکٹر آنٹی کے پاس ایک روز ایک کنواری لڑکی اپنا حمل گروانے کی غرض سے آتی ہے۔ وہ جوشِ جوانی میں ایک ناقابلِ معافی لغزش کی مرتکب ہو چکی ہے۔ اب ٹھہرے ہوئے حمل کا اسقاط کروانے چلی آئی ہے۔ وہ ڈاکٹر آنٹی سے

بہت منت سماجت کرتی ہے۔اس کو اپنی ماں کا واسطہ دیتی ہے کہ میری ماں آپ کی بہت بڑی فین ہے، آپ میرے لیے دیوی ہیں، پھر شادی سے قبل بھول ہونے کی بات کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہے مگر لاکھ جتن کرنے کے باوجود ڈاکٹر آنٹی اپنی بات پر اٹل رہتی ہے۔ڈاکٹر آنٹی کو یہ کام کسی جرم سے کم نہیں لگتا ہے۔وہ قانون کے حدود بتانے اور لڑکی کو غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کرتی ہے:

> ''بیٹی، یہ میرا کام نہیں ہے۔تم نے جو غلطی کی ہے اس کا تمہیں احساس ہو گیا، یہی کیا کم ہے۔میری اپنی کچھ سیمائیں ہیں۔ میں نے پوری عمر کبھی ایسا کام نہیں کیا۔''
> (ص ۱۸)

حد تو تب ہو جاتی ہے جب لڑکی منہ مانگا دام دینے کا لالچ دیتی ہے جس کے سبب ڈاکٹر آنٹی کا غصہ اُبال پر آجاتا ہے۔حالانکہ ڈاکٹر آنٹی کی رگِ حمیت پھڑک اٹھتی ہے، پھر بھی وہ اپنی پیشہ ورانہ خصوصیت کا دامن نہیں چھوڑتی اور اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتی ہے۔ یہاں پر ڈاکٹر آنٹی میں انصاف پسندی کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے وہ انصاف کرتی ہے اور بذات خود عورت ہونے کی حیثیت سے بھی۔ گناہ خود کیا ہو یا کسی کے بہکاوے میں آکر کیا ہو، دونوں صورتوں میں گناہ کرنے والا گناہگار ہوتا ہے۔اس افسانے میں موجودہ سماج میں بہت تیزی سے پھیلنے والی حرامکاری اور 'ابارشن' (Abortion) کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ڈاکٹر آنٹی ابارشن Abortion کو گناہ کہنے سے گریز نہیں کرتی: ''میرے خیال میں ابارشن کرنے سے بڑا پاپ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔'' (ص ۱۸)

ڈاکٹر کا کام خدمت خلق ہے اور آنٹی اپنے کام کو عبادت سمجھتے ہوئے وہ باتیں کہہ جاتی ہے جو اکثر و بیشتر ڈاکٹر فراموش کرتے ہیں بلکہ وہ اپنے کام سے زیادہ روپے کمانے کو ترجیح دیتے ہیں۔انھیں خدمت خلق سے زیادہ دولت کمانے کی پڑی رہتی ہے۔اس کے برعکس کملا دیوی عمدہ اخلاقِ حمیدہ کی مجسم پیکر ہے، سریندر کی بے تکی و نامعقول باتوں پر گو وہ برانگیختہ نہیں ہوتی مگر اپنی

بات کو سیدھے سادے الفاظ میں یوں کہتی ہے:

> ''بیٹے زندگی میں دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اگر میں چاہتی تو یہاں آنے کے بعد ایسے کاموں سے لاکھوں روپے کما سکتی تھی۔ مگر نہیں۔ میرے سنسکار مجھے یہ سب کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ بیٹے، میں نے زندگی دینے کے لیے جنم لیا ہے ،زندگی لینے کے لیے نہیں۔ زندگی لینے کا اختیار تو صرف اوپر والے کو ہے اور کسی کو نہیں۔'' (ص ۱۸)

ظاہر ہے کہ افسانہ نگار نے ڈاکٹر آنٹی کے منہ سے وہ فقرے کہلوائے ہیں جو دوسرے ڈاکٹروں کے لیے مشعل راہ ہو سکتے ہیں یعنی ڈاکٹر کا پیشہ زندگی لینے کا نہیں ہے بلکہ زندگی دینے کا ہے۔ وہ مزید فرماتی ہے:

> ''میرے خیال میں اسقاط حمل صرف اس صورت میں جائز ہے جب بچے اور ماں کی زندگی پر کوئی خطرہ منڈلا رہا ہو اور پھر ابھی حمل ٹھہرا ہی ہو، بچے کی شکل اختیار نہ کر چکا ہو۔ ورنہ اسے قتل سے کم نہیں سمجھتی۔'' (ص ۱۹)

موت کے خوف سے یا پھر بدنامی کے ڈر سے لوگ ڈاکٹروں سے رجوع کرتے ہیں۔ مریض اپنی غلطیوں کو چھپانے کے واسطے کسی بھی حد تک جاتے ہیں جبکہ بکاؤ ڈاکٹروں کا رویّہ انسانیت کے بالکل خلاف ہوتا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر آنٹی کا مزاج منفرد ہے، وہ ہر بات پر بہت سنجیدگی اور سلیقہ مندی سے سوچتی ہے اور اس پر اپنا خیال ظاہر کرتی ہے چاہے وہ بات سامع پر ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔ اپنی مثبت سوچ کی وضاحت کرنے کے لیے ڈاکٹر آنٹی سریندر کو ایک اور واقعہ سناتی ہے۔ بہت عرصہ پہلے اس کے پاس ایک شادی شدہ جوڑا آیا تھا جو سولہ برسوں سے بے اولاد تھا اور بچے کی خواہش میں سپیشلسٹ ڈاکٹروں سے لے کر سنتوں وفقیروں تک پہنچ گیا تھا مگر مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ آخر کار کسی کی صلاح پر دونوں ڈاکٹر آنٹی کے پاس آئے تھے۔ ڈاکٹر مریضہ کے رحم کی اچھے طریقے سے صفائی کر کے اور کچھ دوائیاں دے کر اس کا علاج کرتی ہے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد وہ عورت استقرار حمل کی خوشخبری دیتی ہے اور پھر نو مہینے گزر جانے کے بعد ایک ننھے

منے بچے کو جنم دیتی ہے۔تب ڈاکٹر آنٹی کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا ہے چنانچہ کہتی ہے کہ: ''یہ میری زندگی کی معراج تھی۔'' (ص ۱۹)

اس موقع پر ڈاکٹر آنٹی کی اپنے پیشے کی بابت دیانت داری اور ایمانداری نمایاں ہو جاتی ہے۔اس کرداری افسانہ کا آخری حصہ منتہا (Climax) پر پہنچ کر اختتام پذیر ہوتا ہے۔کملا دیوی اپنے پاکیزہ خیالات اور اچھے کاموں کے باعث مر کر بھی امر ہو جاتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے جبکہ اکثر انسان زندہ ہو کر بھی مردوں کی مانند بے نام و نشان رہتے ہیں۔ ڈاکٹر آنٹی مر چکی ہے لیکن اس کی انسانیت اور اعلیٰ قدریں اسے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ڈاکٹر آنٹی جیسے لوگ بہ ظاہر موت سے ہم آغوش ہو کر اس فانی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر وہ اپنے بلند ترین مخصوص کردار کے سبب ہمیشہ کے لیے زندہ و جاوید ہوتے ہے۔اس بات کا اعادہ راوی یوں کرتا ہے:

> ''یہ وہی گھر تھا جہاں میں نے جہد زیست کا پہلا سبق حاصل کیا تھا، جہاں میں نے زندگی جینے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا اور جہاں میں نے نیکی اور بدی کے درمیان تمیز کرنا سیکھا تھا۔آج اس گھر میں ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ اس گھر سے روح ہی نکل چکی ہے۔'' (ص ۲۰)

مذکورہ افسانہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کا آئینہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔زبان و بیان بھی سادہ و سلیس ہے۔چھوٹے چھوٹے مکالمے بہترین انداز بیان میں پیش کیے گئے ہیں۔مختصر یہ کہ اس افسانے میں دیپک بدکی نے کملا دیوی (ڈاکٹر آنٹی) کے کردار کو پیش کر کے کردار نگاری کا بہترین ثبوت دیا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر صفیہ بانوا ے شیخ، اے سی گراونڈ فلور، تاج پیلس، کمبھر والا، جمال پور، احمد آباد ۳۸۰۰۰۱؛ مطبوعہ ماہنامہ بیباک، مالیگاؤں [ناسک]، جلد ۱۳، شمارہ ۱۵۰، مارچ ۲۰۱۹

افسانہ 'جڑوں کی تلاش' کا تجزیہ

-ڈاکٹر صفیہ بانوائے شیخ

ہمارے ملک بھارت میں کُل ۲۹ ریاستیں ہیں ۔ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب مختلف مذاہب، اور مختلف زبانوں کی مخلوط و متحدہ تہذیب ہے۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک مختلف معاشروں اور ان سے وابستہ ذیلی ثقافتوں کی رنگا رنگ جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ملک کی آزادی کے وقت کشمیر کا ہندوستان میں شامل ہو کر متنازع مسئلہ بن جانا اور قریب چالیس سال بعد کشمیری پنڈتوں کی کشمیر سے ہجرت کرنا نا قابل فراموش المیہ کہا جا سکتا ہے۔

افسانہ نگار دیپک بدکی کشمیر میں پیدا ہوئے ، وہیں تعلیم حاصل کی ، وہیں کا پانی پیا اور وہیں کی روح افزا وادیوں میں پلے بڑھے۔ ان کا افسانوی سفر کشمیر ہی سے شروع ہوا۔ اس لیے ان کے افسانوں میں کشمیر کی زندگی کی رعنائیاں بکھری پڑی ہیں۔ حال ہی میں دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'ایوان اردو' کے جون ۲۰۱۸ء کے شمارے میں اُن کا دلسوز افسانہ 'جڑوں کی تلاش' شائع ہوا۔

ناگ رائے سوپور کا رہنے والا تھا۔ بی اے، بی ایڈ کی تعلیم حاصل کر کے جب وہ بارہمولہ کے ایک اسکول میں استاد مقرر ہوا تو وہاں کے ایک مقامی استاد نے اُسے اپنی ذمہ داری پر جس مکان میں ٹھہرایا اُس کے مالک کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ ہیمال ان میں سے ایک تھی۔ اُس نے دسویں کے بعد تعلیم چھوڑ دی تھی ۔ ہیمال پہلے ہی دن ناگ رائے کو اپنا دل دے بیٹھی تھی ۔ ہیمال کا کنبہ مکان کی نیچے والی دو منزلوں میں رہتا تھا جب کہ ناگ رائے کو تیسری منزل پر جگہ دی گئی ۔ ناگ رائے جب موسم سرما کی چھٹیوں میں سوپور چلا جاتا تو ہیمال کو ایک دن ایک سال کے برابر لگتا

تھا۔وہ دن بھرحبہ خاتون اورارنی مال کے برہ کے گیت گایا کرتی جن کے ہر شعر میں ہجرو انتظار کی باز گشت سنائی دیتی تھی ۔ بہار آتے ہی ناگ رائے کا ٹرانسفر سوپور میں ہوگیا۔اُس نے بارہمولہ کا گھر تو خالی کردیا مگر ہیمال کا دل خالی نہ کرسکا۔ایک سال بیت گیا۔ان دونوں کے لیے گویا ایک صدی بیت گئی۔ہیمال دلیر اور بے باک تھی ۔اُس نے اپنے عشق کے معاملے کو اپنی ماں سے گوش گزار کیا۔آخر کار دونوں کی شادی ہوگئی۔لیکن شیتل کے پیدا ہوتے ہی انہیں ہجرت کا کرب جھیلنا پڑا۔

ہیمال اُٹھتے بیٹھتے اپنی بیٹی شیتل کے سامنے اپنے عزیز وطن کشمیر کا ذکر کیا کرتی تھی۔اس کے والد وسیع المشرب انسان تھے۔اُن کی نظر میں نہ کوئی چھوٹا تھا نہ بڑا، نہ ہندو تھا نہ کوئی مسلمان، نہ کوئی ادنیٰ تھا نہ کوئی اعلیٰ۔وہ اعلیٰ اخلاق حمیدہ کے مالک تھے۔وہ سب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے۔سب انہیں چاہتے تھے۔نامساعد حالات کے سبب انہیں وادی کو خیر باد کرنا پڑا تھا مگر انہیں پختہ یقین تھا یہ بارودی کلچر بہت جلد ختم ہوجائے گا،اور ہم سارے مہاجر اپنی پیاری دھرتی کو لوٹ جائیں گے۔دیکھتے ہی دیکھتے بائیس (۲۲) سال کا طویل عرصہ گزر چکا۔شیتل کی ماں نے کئی بار اپنا آبائی وطن دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔وہ اُسے بتاتی تھی کہ آج کے حساب سے اُن کی جائیداد دو تین کروڑ سے کم نہ تھی ۔سیبوں کے باغات،،اخروٹ اور بادام کے درخت، دھان کے کھیت اور خوبصورت چار منزلہ عالیشان مکان تھا۔شیتل نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا کہ حالات اور صحت سے مجبور ہوکر اُس کی ماں اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔شیتل کی ماں جب بھی موقع ملتا اپنے ماضی کو یوں کُریدا کرتی:

> ☆ میرا میکہ وتستا کے کنارے واقع تھا، کھڑکی سے باہر نظر ڈالتی تو آہستہ رو وتستا کا نظارہ بہت ہی خوشنما لگتا تھا۔ دریا پار دوسرے کنارے پر گنیش جی کا خوبصورت مندر دعوت نظارہ دیتا۔ پھر افق تا افق پہاڑوں کا سلسلہ۔۔۔ برف سے اٹے ہوئے ۔۔۔ نیلے نیلے، اودے پہاڑ ۔دامن چیڑ اور دیودار کے درختوں سے بھرا ہوا۔۔۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ۔۔۔صبح سویرے ایک جانب مسجدوں سے

اذانیں گونجتیں اور دوسری جانب مندروں کی گھنٹیاں سُنائی دیتیں۔'' (ص ۳۷۔ ۳۶: افسانہ: جڑوں کی تلاش از دیپک بدکی، ماہنامہ 'ایوان اردو': اردو اکادمی دہلی، جلد:۳۲، شمارہ:۲، جون ۲۰۱۸ء)

☆ ''ہندو مسلم ایک دوسرے سے مل کر رہتے۔ ہمارے گھر کے سامنے بہت بڑا آنگن تھا جس میں ایک چنار کا درخت اپنی شاہانہ عظمت کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی عمر اندازاً ڈیڑھ سو سال تھی۔'' (ص ۳۷: افسانہ: جڑوں کی تلاش از دیپک بدکی، ماہنامہ 'ایوان اردو': اردو اکادمی دہلی، جلد:۳۲، شمارہ:۲، جون ۲۰۱۸ء)

☆ ''وہ چنار نہیں تھا بلکہ ہماری دھروہر تھی۔ والدین سے سنا تھا کہ اس کو میرے دادا نے اُس وقت لگایا تھا جب اُس کی امید بر آئی تھی اور اُس کی شادی اپنی بچپن کی ہمجولی سے ہوئی تھی ۔ داداجی نے شادی کے ترنت بعد نشانی کے طور پر وہ چنار کا پودا لگایا تھا۔ پھر تو ایک عجیب سی روایت قائم ہو گئی۔ گھر کی کنواری لڑکیاں چپکے سے اس چنار سے منت مانگتیں کہ انھیں بھی اپنے پریمی سے ملا دے۔ ہیمال نے بھی اس چنار سے کئی بار منت مانگی تھی۔'' (ص ۳۷: افسانہ: جڑوں کی تلاش از دیپک بدکی، ماہنامہ 'ایوان اردو' : اردو اکادمی دہلی، جلد:۳۲، شمارہ:۲، جون ۲۰۱۸ء)

اس افسانہ کا موضوع 'ماضی کی پرانی یادیں' ہیں۔ شیتل ہی اس کا مرکزی کردار ہے۔ شیتل کشمیر کے ضلع سوپور میں پیدا ہوتی ہے۔ کشمیر کے بگڑتے حالات کے پیشِ نظر وادیِ کشمیر چھوڑ کر اس کے ماں باپ کو جموں آنا پڑا تھا۔ اُس نے اپنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم جموں میں ہی حاصل کی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے اُس نے دہلی میں واقع ذاکر حسین کالج آف ماس کمیونیکشن سے جرنلزم کا کورس کیا۔ شیتل بچپن ہی سے ایک لاابالی قسم کی لڑکی تھی۔ وہ ایک آزاد خیال مغرور لڑکی تھی جو ایک خود کفیل زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ وہ جب کبھی عالمی سطح کے صحافیوں کو لڑائی کے میدانوں میں بے باکانہ اور حقیقت پسندانہ رپورٹنگ کرتے دیکھتی تو اُس کا جی مچل جاتا تھا۔ اس کے والدین روشن ذہن اور مثبت فکر رکھتے تھے لہٰذا وہ بارہا یہ سوچتی تھی کہ کبھی وہ بھی ان جاں باز جرنلسٹوں کی طرح

فلسطین، بغداد، افغانستان، شام جیسے شورش زدہ علاقوں سے چینل کے لیے کہانیاں بھیجے۔ ماں کے انتقال کو پانچ سال گزر چکے تھے تبھی شیتل نے اپنے آبائی وطن جانے کا ارادہ کیا۔ اس کا نصیبا جاگا۔ اُس کی جرنلزم میں حاصل کردہ ماسٹرس ڈگری اس کے کام آگئی۔ اُسے دہلی کے ایک انٹرنیشنل ٹیلی ویژن (I TV) میں بحیثیت رپورٹر کا کام مل گیا۔ شیتل کی تمنا تھی کہ وہ اس گھر کو دیکھ لے جہاں اس کے والدین کا پیار پروان چڑھا تھا اس کے علاوہ وہ جگہیں دیکھنے کی آرزو تھی جہاں اس کی تہذیب اب بھی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ ایک اقتباس:

> ☆ ''اونتی پور اور مارتنڈ کے آثار قدیمہ، ہاری پربت کا قلعہ، شارکا دیوی کا مندر، پہاڑی کے دامن میں گنیش جی کا مندر اور مخدوم صاحب کی زیارت، شاہ ہمدان، دستگیر صاحب اور چرار شریف کی خانقاہیں، شنکر آچاریہ کا شو مندر، کھیر بھوانی، ریشی پیر کا استھان، ڈل، ولر، اور مانسبل جھیلیں، مغل باغات، چار چنار، سرینگر، بارہمولہ سڑک جس کے دونوں طرف سفیدے کے درخت خوبصورت نظارہ پیش کرتے ہیں اور دور دراز کے صحت افزا مقامات، پہل گام، گلمرگ، سون مرگ، یوس مرگ۔'' (ص ۳۸، ۴۰: افسانہ: جڑوں کی تلاش از دیپک بدکی، ماہنامہ ُایوان اردو' :اردو اکادمی دہلی، جلد: ۳۲، شمارہ: ۲، جون ۲۰۱۸ء)

شیتل اپنی جڑوں کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ وہ بذریعہ ہوائی جہاز جموں پہنچتی ہے۔ وادی کا یہ اُس کا پہلا سفر تھا۔ کشمیر کے حوالے سے چینل پر ہو رہے مباحث نے اس کے تجسس کو مہمیز لگائی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کو جیسے ہی اس نے بارہمولہ جانے کا حکم دیا تبھی اس نے کہا میڈم اب اِسے بارہمولہ نہیں بلکہ ورمول کہتے ہے۔ شیتل کے لیے یہ پہلا شاک تھا۔ وہ ڈرائیور سے یوں مخاطب ہوئی:

> '' ہم لوگ آپس میں مل جل کر نہیں رہ سکتے، مگر اپنی بھڑاس ان بے جان اور بے زبان اشیا پر نکالتے ہیں۔ بمبئی کو ممبئی کر لیا، مدراس کو چنئی کر لیا، اورنگ زیب روڈ کو عبدالا کلام روڈ کر لیا، کناٹ پلیس کو راجیو چوک بنا لیا، اور اب تاج محل کے پیچھے

پڑھ گئے ہیں۔'' (ص ۳۹: افسانہ: جڑوں کی تلاش از دیپک بدکی، ماہنامہ 'ایوان اردو': اردو اکادمی دہلی، جلد: ۳۲، شمارہ: ۲، جون ۲۰۱۸ء)

شیتل کی باتوں پر چٹکی لیتے ہوئے ڈرائیور کہتا ہے کہ:

''ہاں میڈم یہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ لگ رہا ہے۔ ہر جگہ نام بدلنے کی ہوڑسی لگی ہوئی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ شنکر آچار یہ کو کوہ سلیمان اور ہاری پربت کو کوہ ماران کہنے لگے ہیں۔ گلی کوچوں کے نام تک بدل دیے گئے کشمیری ناموں کو نظر انداز کر کے عربی ناموں کو ترجیح دی گئی۔ وہ کیا ہے کہ کشمیری میں ایک کہاوت ہے 'پتر حسدِ کور کھترنال' (پڑوسی کو نیچا دکھانے کے لیے لڑکی کا ختنہ کرنا)۔ ان سیاست دونوں نے لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے لیے نئے نئے حربے ایجاد کیے ہیں۔ نام بدل لو، تعلیم بدل لو، نصاب بدل لو۔۔۔ نہ جانے اور بھی کیا کیا بدل دیں گے۔'' (ص ۳۹: افسانہ: جڑوں کی تلاش از دیپک بدکی، ماہنامہ 'ایوان اردو': اردو اکادمی دہلی، جلد: ۳۲، شمارہ: ۲، جون ۲۰۱۸ء)

ٹیکسی ڈرائیور عبدالرشید بانڈے ایم اے پاس تھا بہت کوشش کے باوجود نوکری نہیں ملی تھی۔ دفتر میں کلرک لگنے کے لیے ایک لاکھ روپے کی رشوت نہ دے سکا، کچھ روپیہ اپنے ابو سے اور کچھ بنک سے قرضہ لے کر ٹیکسی خریدی اور ٹیکسی ڈرائیور بن گیا۔

شیتل اپنے پہلے پڑاؤ ہیمال (ماں) کے میکے پہنچ جاتی ہے۔ جہلم کے کنارے وہی تین منزلہ آبائی مکان اپنی آب و تاب کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے موجودہ مکینوں کی عورتوں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اس کے بزرگوں کی تعریفیں کرنے لگیں۔ شیتل کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر جب خاتون خانہ پوچھتی ہے کہ بیٹی کچھ دیکھنا چاہتی ہو؟ تو شیتل کہتی ہے ''ہاں آنٹی''، ماں کہتی تھی وہاں آنگن میں ایک بہت بڑا ڈیڑھ سو سال پرانا چنار کا درخت ہے جو کنواری لڑکیوں کی منتیں پوری کرتا ہے۔ میری ماں نے بھی اس چنار کے درخت سے منت مانگی تھی اور وہ پوری بھی ہوئی تھی۔ جب خاتون خانہ کہتی ہے کہ ''بیٹی وہ بوڑھا چنار کھوکھلا ہو کر ایک دن زمین پر دھڑام سے گر گیا، یہ سن

کر شیتل کے چہرے پر مایوسی چھا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دراصل وہ چنار اس کی قدیم تہذیب کا علامیہ تھا جو زمین بوس ہو گیا تھا۔

شیتل کا دوسرا پڑاؤ سوپور تھا جہاں اس کا باپ رہتا تھا۔ ڈرائیور نے شیتل کے بتائے ہوئے پتے پر ٹیکسی روک لی۔ ڈرائیور کے ایڈریس پوچھنے پر دکان دار نے جواب دیا:

''بھائی کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔ یہ علاقہ دو بار نذرِ آتش ہوا تھا۔ بیسیوں مکانات جل کر خاک ہو گئے تھے۔ کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ بہت برس گزر جانے کے بعد معلوم ہوا کہ کسی مقامی سرمایہ دار نے یہاں سڑک کے ساتھ ساتھ کئی زمینیں خرید لی ہیں اور پھر اس پر یہ مال کھڑا کر لیا۔ کوئی موروثی امیر نہیں تھا، مگر سنا ہے اس نے نامساعد حالات کا فائدہ اٹھا کر املاک کی تجارت اور منشیات کا کاروبار کر کے بہت دولت کمائی۔'' (ص ۴۰: افسانہ: جڑوں کی تلاش از دیپک بدکی، ماہنامہ 'ایوان اردو' : اردو اکادمی دہلی، جلد: ۳۲، شمارہ: ۲، جون ۲۰۱۸ء)

اپنی جڑوں کی تلاش میں نکلی شیتل نہایت افسردہ ہو گئی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ سب کیا، کیسے اور کیونکر ہو گیا؟ ٹیکسی ڈرائیور رشید کے الوداعی جملے اُس کے وجود کو جھنجوڑنے لگے:

☆ ''میڈم، ان باتوں کو دل پر نہیں لینا چاہیے۔ تخریب اور تعمیر دونوں انسانی سرشت کا حصہ ہیں۔ تہذیبیں بنتی ہیں، بگڑتی ہیں۔ تعمیری انسان اپنی تخلیقی صلاحیت کا اظہار شہروں کو بسا کر، عمارتوں اور باغات کو بنا کر یا پھر مجسموں کو تراش کر کرتا ہے جبکہ تخریبی انسان ان تخلیقات کو تہس نہس کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ یہاں گزشتہ کئی سالوں سے یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔'' (ص ۴۰: افسانہ: جڑوں کی تلاش از دیپک بدکی، ماہنامہ 'ایوان اردو' : اردو اکادمی دہلی، جلد: ۳۲، شمارہ: ۲، جون ۲۰۱۸ء)

ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رُکتی ہے۔ شیتل ماضی کے جھروکوں میں کھوئی ہوئی بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ بے دلی سے وہ رات کا کھانا نہیں کھا پاتی ہے۔ وہ سونے کی

کوشش کرتی ہے مگر سو نہیں پاتی ہے۔ دوسرے روز وہ انڈی گو ایئر لائنس کی ذریعے دہلی لوٹ آتی ہے۔

دنیا میں جب تک تعمیرات اور تخریبات کے سلسلے جاری رہیں گے تب تک دیپک بدکی جیسے افسانہ نگار اپنی تخلیقات کے ذریعے اُن پر کاری ضربیں لگاتے رہیں گے اور وارث اپنی جڑوں کی تلاش یوں ہی کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

✍ ڈاکٹر صفیہ بانو اے شیخ، اے سی گراونڈ فلور، تاج پیلس، کُمبھر والا، جمال پور، احمد آباد ۳۸۰۰۰۱

'ایک معصوم کی المناک موت'- تجزیہ

-ڈاکٹر صفیہ بانوا ے شیخ

اس دور میں تعلیم ہے امراض ملّت کی دوا

ہے خونِ فاسد کے لیے تعلیم مثلِ نیشتر (علامہ اقبالؔ)

تعلیم زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ جس طرح جسم کو نشتر لگا کر اُسے خرابیوں اور بیماریوں سے بچایا جاسکتا ہیں اُسی طرح تعلیم کے ذریعے سماجی برائیوں کو مٹایا جاسکتا ہے۔ بقول اقبالؔ تعلیم برائیوں سے نجات پانے کا نشتر ہے۔ ایک شاعر اپنے جذبات اشعار کے ذریعے پیش کرتا ہے جب کہ ایک ادیب اپنے خیالات کا اظہار مضامین، ناول یا افسانوں کے ذریعے کرتا ہے۔ دیپک بدکی عصر حاضر کے ایک ایسے ہی تخلیق کار ہیں، اپنے اردگرد جو کچھ بھی دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اُسے اپنے ذہن کے نہاں خانے میں ذخیرہ کرتے ہیں اور پھر اپنے ضمیر کی آواز سن کر اُسے نا قابلِ فراموش کہانی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ چونکہ وہ انٹرنیٹ سے بھی کافی دلچسپی رکھتے ہیں لہٰذا اپنے گردو پیش کے علاوہ ملکی اور عالمی سطح پر بدلتے ہوئے منظرنامے پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور یہی خوبی ان کے افسانوں کو عصری زندگی کا آئینہ بنا دیتی ہے۔

افسانہ 'ایک معصوم کی المناک موت' موجودہ نظامِ تعلیم میں پائی جانے والی بد انتظامیوں اور کوتاہیوں پر طنز کرتا ہیں۔ یہ افسانہ ہمارے تعلیمی اداروں کے ذریعے طلبہ اوران کے والدین کے استحصال کو بیان کرتا ہے اور تعلیم وتربیت پر افسانہ نگار کے فکری جہات کو پیش کرتا ہے۔ افسانہ تحریر کرتے وقت دیپک بُدکی تھیم، پلاٹ، ماحول، کرداروں اور مقصد کو دھیان میں رکھتے ہوئے کہانی کے زیرو بم، کلائمکس، اور انجام پر فوکس کرتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ'اب میں وہاں نہیں

رہتا' میں مشمول افسانہ 'ایک معصوم کی المناک موت'، جو اس سے قبل 'سوری میڈم' کے عنوان سے انتساب کے خصوصی شمارے (دیپک بُدکی نمبر) میں شائع ہوا تھا، کے آغاز میں وہ اپنی ذہنی کیفیت اور احساسات اپنے قاری کے ساتھ اس انداز میں بانٹتے ہیں گویا کہ وہ بھی افسانے ہی کا جزو ہیں۔ مذکورہ خصوصی نمبر میں ڈاکٹر سیفی سرونجی نے بُدکی صاحب سے پوچھا کہ آپ چھوٹی اور معمولی وارداتوں پر افسانہ کیسے تحریر کر لیتے ہیں، آپ افسانہ کب اور کس وقت لکھتے ہیں نیز آپ کہانی کو ایک بیٹھک میں مکمل کرتے ہیں ہیں یا کئی دن میں؟ جواب میں دیپک بدکی نے فرمایا کہ ''یہ کہانی اور میرے موڈ پر منحصر ہوتا ہے۔ کئی کہانیاں تو ایک ہی نشست میں ختم ہوتی ہیں حالانکہ اس کے بعد انھیں کئی بار پھر سے پڑھنا پڑتا ہے تا کہ کوئی کسر باقی نہ رہے مگر اکثر کہانیاں لکھنے میں کئی دن لگتے ہیں۔ اس میں مصلحت بھی کام کرتی ہے۔ کہانی کو ایک بار لکھ کر اگر اس کو بار بار پڑھا جائے تو کبھی کبھی کچھ تبدیلیاں کرنے کو جی چاہتا ہے۔''[1] اسی سلسلے میں وہ اپنے چوتھے افسانوی مجموعے 'ریزہ ریزہ حیات' کے حرفِ اوّل میں تحریر کرتے ہیں:

> ''کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں کہانیاں کیوں لکھتا ہوں؟ کیا فرق پڑتا ہے ان کہانیوں سے؟ پریم چند نے اپنی پوری زندگی سماج سدھار کے لیے وقف کی تھی۔ بال وِواہ، بیواؤں کی از سر نو شادی، مہاجنی تہذیب، توہم پرستی، طبقاتی اونچ نیچ اور مذہبی تعصب کے خلاف اس نے عمر بھر اپنا قلم اٹھایا مگر آج ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی ہمارے معاشرے میں یہ بدعتیں ترویج پا رہی ہیں اور ہمارے رہنما مصلحتاً ان کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مذہبی کٹر پرستی تقلیبِ ماہیت کر کے دہشت گردی میں تبدیل ہو چکی ہے۔ آدمی کو صبح گھر سے نکلتے وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ شام کو واپس آئے گا بھی یا نہیں۔ آئے دن ذرائع ابلاغ میں رشوت خوری، اغوا، زنا بالجبر، تزویجِ محرمات، سادھو سنتوں کے ہاتھوں ضعیف الاعتقادوں کا استحصال اور اشیائے خوردنی میں زہریلی ملاوٹوں کی خبریں نشر ہوتی رہتی ہیں۔ دولت منداور اثر و رسوخ والے لوگ جرم کر کے بھی بچ نکلتے ہیں۔

کروڑوں غریب لوگ اپنے خون پسینے کی کمائی کرکٹ میچوں کی ٹکٹیں خریدنے یا پھر رُیلیٹی شوز کو ایس ایم ایس بھیجنے پر صرف کرتے ہیں۔ان کی جیبیں خالی ہو جاتی ہیں جبکہ کرکٹ کھلاڑیوں اور رُیلیٹی شوز کے منتظمین کی تجوریاں کروڑوں روپے سے بھر جاتی ہیں۔غریب کسان بھوک مری اور قرضے کی تاب نہ لاکر خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جبکہ سرمایا داروں کے لیے ہر سال بجٹ میں رعایتوں پر رعایتیں دی جاتی ہیں۔جب میں ان باتوں پر سوچ بچار کرتا ہوں تو دل میں طوفان سا اٹھتا ہے اور قلم خود بخود حرکت کرنے لگتا ہے۔ چونتیس سال گورنمنٹ نوکری کرنے کے باوجود میں نے ہمیشہ نڈر ہو کر نازک اور زود حس موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور بے باکانہ طور پر اپنے محسوسات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔''۲

افسانہ 'ایک معصوم کی المناک موت' کی ابتدا ہی میں ہمیں دیپک بُدکی کا بچوں کے تئیں محبت اور خلوص کا جذبہ نظر آتا ہے۔وہ ان کی معصومیت کے دلدادہ ہیں، بالغ کرداروں کی ساتھ ساتھ وہ بچوں کے کردار بھی اپنے افسانوں میں بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔علاوہ ازیں دیپک بدکی حساس طبیعت کے مالک ہیں، زندگی کے نفسیاتی پہلوؤں پر خوب دسترس رکھتے ہیں یہاں تک کہ انھیں انسانی نفسیات پر یدطولیٰ حاصل ہے۔چند اقتباسات:

☆البتہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس حادثے کو کئی بار قلم بند کرنے کی شعوری کوشش کی مگر جب بھی قلم ہاتھ میں اٹھاتا ہوں سارا وجود لرز جاتا ہے۔ کچھ مہیب سے سائے میرے دل و دماغ کا احاطہ کرتے ہیں اور ایک ننھی منی پیاری سی بچی بانہیں پھیلا کر میرے سامنے ظاہر ہو جاتی ہے۔وہ مدد کے لیے چیختی ہے، چلاّتی ہے اور پھر بے بس ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔وہ زبان سے کچھ بولنے کی مسلسل کوشش کرتی ہے مگر خوف و وحشت کے باعث بول نہیں پاتی ۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آتا ہے اور انگلیاں کانپنے لگتی ہیں۔''۳

☆''میری آنکھوں کے سامنے بلیو بیلز سیکنڈری سکول کی چوتھی جماعت کا بڑا سا کمرہ نمودار ہوا۔ ڈیسکوں کے پیچھے چھوٹی چھوٹی کرسیوں پر سفید اور نیلی اسکرٹ

میں ملبوس پریوں ایسی نرم ونازک لڑکیاں براجمان تھیں۔ چوٹیاں بندھی ہوئیں، کسی کی دو اور کسی کی ایک ، ہنستی کھیلتی معصوم بچیاں ، بالکل گلاب کی کلیوں جیسی ، خوبصورت اور بے ریا۔ سبھی لڑکیاں چڑیوں کی مانند چہچہا رہی تھیں۔ شورغل اتنا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ؎

زیرِنظر افسانے میں نیہا اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہوتی ہے، اس کے والدین جیسے تیسے اس کا داخلہ نامور بلیو بیل اسکول میں کراتے ہیں۔ایک دن اچانک اس کی دادی نہاتے ہوئے گر جاتی ہے اور اس کی داہنی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے جس کے سبب اس کے والدین کو اپنا سارا وقت اسپتال میں گزارنا پڑتا ہے۔ یہ سارا واقعہ نیہا کے کلاس ٹیسٹ سے ایک روز پہلے پیش آتا ہے اور اسی کشمکش میں وہ ٹیسٹ کی تیاری نہیں کر پاتی ہے اور کئی سوالوں کے جواب نہیں لکھ پاتی ہے۔ اتفاق سے وہ آخری پیریڈ ہوتا ہے جب مالتی تومر چوتھی جماعت کا ٹیسٹ لیتی ہے۔ مالتی تومر نیہا کے جواب نہ دینے اور نوٹ بک میں کچھ نہ لکھنے پر بہت ناراض ہو کر اُسے بینچ پر کھڑے رہنے کی سزا دیتی ہے اور بے چاری نیہا ڈر کے مارے دیوار کی طرف منہ کر کے بنا چوں وچرا کھڑی ہو جاتی ہے تا کہ میڈم اور زیادہ ناراض نہ ہو۔اُدھر مالتی تومر مسوری جانے کے پروگرام کی دُھن میں مگن ہوتی ہے اور اسکول سے گھر لے جانے کے لیے اپنے پتی کے انکار سے پہلے ہی خار کھائی ہوتی ہے۔ اسکول کی چھٹی ہونے پر سارے بچے باہر نکل جاتے ہے مگر نیہا وہیں بینچ پر کھڑی رہتی ہے۔اسکول چار دن بند رہتا ہے اور کسی کو اس بات کا خیال نہیں آتا کہ نیہا کلاس میں ہی قید ہو چکی ہے۔آخر کار ڈری، سہمی اور موت کے ساتھ جوجھتی نیہا بلیک بورڈ پر کئی مرتبہ ہندی میں معافی نامہ لکھتی ہے 'ممی..ممی مجھے ڈر لگ رہا ہے! پاپا.. پاپا..مجھے ڈر لگ رہا ہے! سوری میڈم اب میں پاٹھ یاد کر کے آیا کروں گی' اور پھر غش کھا کر فرش پر گر جاتی ہے اور ابدی نیند سو جاتی ہے۔اس کی لاش کئی دنوں بعد اسکول کھلنے پر مل جاتی ہے۔

اس افسانے میں تین کردار پیش کیے گئے ہیں۔ایک تعلیم یافتہ استانی مالتی تومر ہے جو موڈرن

زمانے کی ٹیچر ہے اور نو دولتیا گھرانے میں شادی ہونے کے باعث وقت گزاری اور بالائی آمدنی کے لیے اسکول میں پڑھاتی ہے۔ دوسرا کردار ایک معصوم بچی نیہا کا ہے جو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ تیسرا کردار بذاتِ خود مصنف کا ہے جو راوی کا رول ادا کرتا ہے، موڈرن تعلیمی نظام میں پائی جانے والی بدعنوانیوں سے اچھی طرح واقف ہے اور بے باکانہ طور پر ان کی نشاندہی کرتا ہے۔ افسانے میں نیہا کے متوسط طبقے کے والدین اپنی بچی کو اچھی تعلیم دلوانے کی غرض سے اچھے اسکول کا انتخاب، انٹرویو، فیس اور تعمیری فنڈ کا خرچہ جھیلتے ہیں۔ اس سلسلے میں افسانہ نگار یوں رقمطراز ہیں:

''ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی نیہا۔ بڑے نازوں میں پلی ہوئی۔ والدین نے کتنے خواب سنجوئے تھے اپنی بیٹی کے لیے۔ حالانکہ متوسط طبقے کی اڑانیں محدود ہوتی ہیں۔ بیٹی اچھی تعلیم پائے، اچھی نوکری کرے اور پھر اچھے گھر میں بیاہ کر کے چلی جائے۔ اس سے آگے تو کبھی سوچتے بھی نہیں۔.... نیہا کو سکول بھیجنے میں جو خرچہ برداشت کرنا پڑ رہا تھا اس کے لیے والدین کو اپنا پیٹ کاٹنا پڑا۔ سب ضروری اور غیر ضروری اخراجات میں کٹوتی ہونے لگی۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا اور نیہا چوتھی جماعت تک پہنچ گئی۔'' [5]

معصوم نیہا سخت گیر تعلیمی نظام کی شکار ہو جاتی ہے اور دم توڑنے سے پہلے ذہنی اور نفسیاتی انتشار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بے چاری نیہا کے ذہن پر مالتی تومر (استانی) کا خوف اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ آخر کار اس معصوم بچی کو موت کے آغوش میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ آزادی کے بعد تعلیمی نظام کو سدھارنے کے لیے کئی قانون بنائے گئے مگر سب برائے نام ہی رہے۔ قانون بنانے سے سماج نہیں سدھرتا بلکہ قانون کو عمل میں لا کر ہی مدعا پایا جا سکتا ہے۔ ایک استاد کے غلط طور طریق سے نظامِ تعلیم گڑبڑا جاتا ہے جیسا کہ اس افسانے میں مالتی تومر کے رویے سے ہوتا ہے۔ مالتی کا کردار مندرجہ ذیل اقتباسات سے عیاں ہوتا ہے:

☆ ''سامنے دروازے سے ایک فربہ اندام، رعب دار چہرے مہرے والی، ساڑی

میں ملبوس ، بال جوڑے میں گندھے ہوئے ، آنکھوں پر ایک بڑی سی عینک چڑھائے ، ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک لگائے ، ایک ہاتھ میں پرس اور دوسرے ہاتھ میں چند کاپیاں لیے، تیس پینتیس سال کی عورت اندر آئی۔'' ۶

☆'' کچھ برس گزرنے کے بعد مالتی کے بدن میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ بوریت سی محسوس کرنے لگی۔ شام کو کٹی پارٹیوں میں جایا کرتی تھی مگر وہاں سبھی سہیلیوں سے یہی سننے کو ملتا تھا کہ عورت کو گھر میں قید نہیں ہونا چاہیے، دن میں کوئی کام کرنا چاہیے ۔موجودہ زمانے میں عورت کسی کی غلام نہیں ہے، اسے اپنے ڈھنگ سے جینے کا پورا پورا حق ہے۔ پانی کی بوند بوند گرنے سے تو پتھر پر بھی نشان پڑ جاتا ہے۔ مالتی نے بھی فیصلہ کرلیا کہ تفریح کے لیے ہی سہی، وہ کسی اسکول میں ضرور نوکری کر لے گی ۔ اثر و رسوخ تو تھا ہی ، ادھر دماغ میں خیال آیا ، اُدھر بلیو بیل اسکول کے انتظامیہ نے جوائن کرنے کی دعوت دی۔ سکول میں بھی وہ اپنی ہی دنیا میں مست رہتی تھی۔ بچے تو بس اس کے لیے کھلونے تھے، ان کے ساتھ کچھ گھنٹے کھیل لیتی اور پھر واپس اپنے گھر۔'' ۷

مالتی تومر ایک نو دولتیا گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، بی اے، بی ایڈ کی تعلیم حاصل کر چکی ہے اور والدین ایک اچھا سا لڑکا ڈھونڈ کر اس کی شادی کر دیتے ہیں۔ سسرال میں سبھی اس کو آنکھوں پر بٹھا دیتے ہیں جبکہ اس کے بچوں کی ذمہ داری نوکروں کے حوالے ہوتی ہے۔ اسلئے وہ اپنا وقت اسکول اور اپنی سہیلیوں میں گزارتی ہے۔ ایک جانب مصنف بدلتے معاشرے کی تصویر مالتی تومر کے کردار کے ذریعے پیش کرتے ہیں تو دوسری جانب موجودہ زمانے میں خواتین کی بے راہ روی اور انسانی رشتوں کی شکست و ریخت کی طرف ظریفانہ انداز میں اشارہ کرتے ہیں ۔ نئے زمانے میں خواتین کو کئی سہولتیں مہیا ہوتی جارہی ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی زندگی کو بے مقصد جینے پر مجبور ہیں جیسا کہ مالتی تومر۔ مصنف نے مالتی تومر نامی کردار کے ذریعے نئے زمانے کی متوسط عمر خواتین کے نفسیاتی پہلوؤں پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ افسانے کے چند اقتباس:

☆اس پر طرّہ یہ کہ مالتی کو بچوں کے بڑھنے کا احساس ہوا نہ تجربہ۔ چند مہینے دودھ پلایا پھر اشرافی ماؤں کی طرح وہی لیکٹوجن اور سیری لیک ڈبے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔''

۸

☆''عورت کو گھر میں قید نہیں ہونا چاہیے، دن میں کوئی کام کرنا چاہیے۔ موجودہ زمانے میں عورت کسی کی غلام نہیں ہے، اسے اپنے ڈھنگ سے جینے کا پورا پورا حق ہے۔''۹

☆'' سکول میں بھی وہ اپنی دنیا میں مست رہتی تھی۔ بچے تو بس اس کے لیے کھلونے تھے، ان کے ساتھ کچھ گھنٹے کھیل لیتی اور پھر واپس اپنے گھر۔''۱۰

☆''مالتی تومر کا پارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔ ویسے ہی وہ جھلائی ہوئی تھی۔ صبح گھر سے نکلتے وقت اس نے اپنے پتی کو سکول سے گھر لے جانے کے لیے کہا تھا مگر اس نے منع کیا۔ شام کو ریل گاڑی سے ڈیرہ دون جانا تھا۔ ٹکٹیں بک ہو چکی تھیں۔ وہاں سے مسوری جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔''۱۱

نئے زمانے کے حالات نے اس قدر اخلاقی گراوٹ کر دی ہے کہ ہر رشتہ عبوری اور ناپائیدار بن کر رہ گیا ہے۔ عصر حاضر کی مائیں اپنے جسمانی سڈول پن کی فکر مند ہو کر اپنے بچے کو پستانوں کا دودھ پلانے سے محروم رکھتی ہیں جس کی طرف دیپک بدکی نے لیکٹوجن اور سیری لیک ڈبے کے توسل سے اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح مالتی تومر اُن اساتذہ کی نمائندہ ہے جو اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے برائے نام نوکری کرتی ہیں اور اپنی سسرال اور شوہر کا غصہ اسکول کے بچوں پر نکالتی ہیں اور پھر نیہا جیسی معصوم بچی کو سزا دینے پر ایک بار بھی نہیں سوچتی ہیں۔ افسانہ کے اس اقتباس پر غور فرمائیں:

''اچھا ٹیچر کے سپیلنگ بتاؤ''معلّمہ نے اپنی آواز کو زیادہ بھاری اور کرخت بنا کر پوچھ لیا۔ نیہا پھر بھی خاموش اپنی ٹیچر کو دیکھتی رہی اور اس کے منہ سے کوئی لفظ بھی نکل نہیں پا رہا تھا۔ .... نیہا کی مسلسل چُپّی نے اس کے ذہن کو مختل کر دیا۔ مالتی تومر نے اس معصوم بچی کو پھٹکارتے ہوئے کہا۔'لاسٹ رو میں چلی جاؤ اور دیوار کی

طرف منہ کر کے وہاں بنچ پر کھڑی ہو جاؤ۔ جب تک میں نہ کہوں گی، نیچے نہیں اترنا۔"[۱۲]

اس افسانے کا مرکزی کردار نیہا اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہوتی ہے، اس کا داخلہ نامور بلیو بیل اسکول میں کرایا جاتا ہے حالانکہ نیہا ایک سہمی ہوئی معصوم بچی ہے جو اس وقت ڈر جاتی ہے جب اس کی ماں دادی کے ساتھ رات بھر اسپتال میں رہتی ہے اور اس وقت بھی جب مالتی تو مر اس سے سوال پہ سوال کرتی ہے۔ یہاں نیہا کی چپّی اس کے ڈر کے سائے کو اور نفسیاتی و ذہنی کیفیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ جیسا کہ افسانے میں درج ہے:

☆ نیہا نے تو کمال ہی کر دیا تھا۔ نوٹ بک پر کچھ لکھا ہی نہ تھا۔ مالتی اسے بہت ناراض ہوگئی۔ پہلے کھڑے ہونے کو کہا۔ نیہا کھڑی ہوگئی پھر اسے سوال پوچھا۔" نالج کی سپیلنگ بتاؤ؟" نیہا چپ چاپ کھڑی رہی اور کچھ نہ بولی۔ اس نے آج بھی سبق یاد نہیں کیا تھا۔ کرتی بھی کیسے؟ ٹیسٹ سے ایک روز پہلے دادی گھر پر باتھ روم میں نہاتے نہاتے گر پڑی تھی اور اس کی داہنی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ وہ کراہ رہی تھی۔ والدین اسے فوراً اسپتال لے گئے جب کہ پریشان نیہا اکیلی ہمسائے کے گھر میں پڑی رہی۔ کچھ پڑھ ہی نہ پائی۔ پھر سکول کا کام کرنے میں ماں اس کی رہنمائی کرتی تھی مگر وہ تو رات بھر اسپتال میں رہی۔ دادی اب بھی پلستر باندے ہسپتال میں پڑی ہوئی ہے۔[۱۳]

☆ نیہا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر امڈ آیا۔ مارے خوف کے وہ کچھ بھی نہ کہہ پائی۔ چپ چاپ اپنی قطار سے باہر نکل کر آخری بینچ پر چڑھ کر کھڑی ہوگئی اور دیوار کی طرف اپنا منہ کر لیا۔"[۱۴]

بچے بڑے معصوم ہوتے ہے، ذہنی و نفسیاتی طور پر بڑے حساس ہوتے ہے۔ بچوں کی مسکراہٹ جہاں بڑوں کے دکھ درد کو زائل کر دیتی ہے وہیں تکلیف، چوٹ، خوف، ہراس، وحشت اور ہولناکیاں، غلیظ باتوں اور مناظر کا اثر ان کی دماغی و نفسیاتی حالت پر بری طرح اثر انداز ہوتا

ہے۔لہٰذا بچوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت،مہربانی،رحم اور محبت سے پیش آنا چاہیے۔ایسا کرنے سے ہی ہم ان کے ہمدرد اور غم خوار بن سکتے ہیں۔اس کے برعکس معصوم نیہا کے لیے الٹی تدبیریں ہو گئیں۔غرض یہ کہ نیہا پر اس کی استانی مالتی تومر کے برے برتاؤ نے ایسا اثر ڈالا کہ وہ بلیک بورڈ پر لکھ لکھ کر اپنا ڈر و خوف کم کرنے کی کوشش کرتی رہی اور آخر کار داعی اجل کو لبیک کہہ گئی۔اقتباس:

''آہستہ آہستہ کلاس روم میں اندھیرا بڑھتا گیا اور نیہا گھبرانے لگی۔تھوڑی بہت چاندنی کی روشنی چھن چھن کر کمرے میں اب بھی آ رہی تھی۔اسے ڈر لگنے لگا۔بہت کوشش کے باوجود وہ زیادہ دیر تک بینچ پر کھڑی نہ رہ سکی۔وہ رونے لگی۔زار و قطار رونے لگی۔'' [۱۵]

اور پھر اس دردناک کیفیت کی منظر نگاری دیکھیے:

''معصوم نیہا نے ہاتھ میں چاک اٹھایا اور کرسی پر چڑھ کر بلیک بورڈ پر ہندی میں لکھنے لگی۔

''ممی...ممی...مجھے ڈر لگ رہا ہے!''

''پاپا..پاپا...مجھے ڈر لگ رہا ہے!''

سوری میڈم...سوری میڈم...اب میں پاٹھ یاد کر کے آیا کروں گی...میڈم مجھے معاف کر دو....سوری میڈم.....سوری میڈم...میں کل سے کبھی بنا پاٹھ یاد کیے نہیں آؤں گی..سوری میڈم...سوری میڈم...سوری میڈم...مجھے گھر جانے دو...میڈم مجھے گھر جانا ہے...میڈم مجھے ڈر لگ رہا ہے...سوری میڈم....سوری میڈم...!''

''ممی مجھے بچاؤ.....پاپا مجھے یہاں سے لے جاؤ۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پاپا۔آپ کہاں ہو؟''

''پاپا جلدی آ جاؤ...!'' [۱۶]

اُدھر نیہا کے ماں باپ جنھوں نے اس کو تعلیم دِلانے کی غرض سے ہر تکلیف جھیلی ہے، اس کے گھر نہ لوٹنے اور گم ہونے پر انتہائی درد و کرب سے گزر جاتے ہیں جب کہ اس کی ٹیچر بڑے مزے سے عیش کرتی رہتی ہے۔اس پر طرہ یہ کہ پرنسپل بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا اور سرسری طور پر

اپنی ہمدردی ظاہر کرتا ہے۔اُس کیفیت کی عکاسی دیپک بدکی نے دلگداز انداز میں یوں کی ہے:

☆''اُدھر گھر میں ماں باپ دونوں پریشان ہوئے کہ نیہا سکول سے واپس کیوں نہیں آئی؟ جس رکشا پر وہ گھر لوٹتی تھی اس سے رابطہ کیا مگر رکشا والے نے بتایا کہ بٹیا تو میرے ساتھ واپس گھر نہیں آئی۔'' ۱۷

☆''جس معلّمہ نے سزا سنائی تھی وہ خود مسوری کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔والدین کو سزا کے بارے میں کسی نے بتایا بھی نہیں۔ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ مایوس ہو کر والدین نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔'' ۱۸

☆''ماں باپ نے ایک ایک لمحہ، ایک ایک گھڑی اور ایک ایک دن کیسے گزارے اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔البتہ انھیں موہوم سی امید تھی کہ کوئی نہ کوئی نیہا کی خبر ضرور لے کر آئے گا۔وہ اپنی ساری جائیداد اغوا کرنے والے کو سونپنے کے لیے تیار تھے اگر وہ ان کی نیہا لوٹا دیتا۔مگر کہیں سے کوئی فون نہیں آیا۔نیہا کے پتا جی ہر گھنٹے پولیس سٹیشن فون کر کے پوچھ لیتے اور دن میں ایک دو بار خود بھی پولیس سٹیشن چلے جاتے۔وہ پولیس کے اعلیٰ افسروں سے بھی ملے لیکن ناکام رہے۔'' ۱۹

☆''پرنسپل سے رابطہ کیا تو اس نے بھی کورا سا جواب دیا کہ سارے بچے چھٹی ہونے کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔کوئی سکول میں کیسے رہ سکتا ہے اور پھر رہے گا بھی کیوں؟ کسی کے وہم و گماں میں بھی نہ تھا کہ معصوم بچی سکول میں سزا کاٹ رہی ہے۔'' ۲۰

قاری افسانہ پڑھ کر نیہا اور اس کے والدین سے ہمدردی جتاتا ہے لیکن جہاں اُسے اس احساس سے گزرنا پڑتا ہے کہ تعلیم و تربیت حاصل کرنا ہر انسان کے لیے ضروری ہے وہیں اس کو تعلیمی نظام سے کدورت ہوتی ہے۔بڑھتا ہوا اسکولی خرچ اس کی راتوں کی نیند حرام کر دیتا ہے کیوں کہ اچھی تعلیم کی خواہش میں لوگ اپنا سب کچھ بیچ ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔دوسری طرف نظامِ تعلیم کی بدانتظامیوں کے نتیجہ میں بچے اپنی جان گنوا دیتے ہیں۔اس کے ذہن میں کئی سوال اٹھتے ہیں جو اس کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھتے ہیں جیسے نیہا جیسی لڑکیوں کی موت کب تک ہوتی

رہے گی یا پھر ان کی موت کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا واقعی نیہا کی عمر کی لڑکیاں سزا کی حقدار ہیں؟ ان کے ماں باپ جو اچھی تعلیم دِلانے کی ریس میں غلطاں ہیں یا پھر وہ استاد جو بچوں کی دیکھ بھال نہیں کر پاتے اور ان کو بات بات پر سخت سزائیں دیتے ہیں۔

افسانہ نگار نے زیر نظر افسانے میں موجودہ دور کے نظامِ تعلیم کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی اپنے بے باکانہ نقطۂ نظر سے ان والدین اور اساتذہ کو حدف کا نشانہ بنایا ہے جو اپنے فرائض کو بالائے طاق رکھ کر اپنی سہولتوں اور آسائشوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں دیپک بدکی کے خیالات، رجحانات اور محسوسات کو افسانہ 'سوری میڈم' میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے جیسے:

☆''متوسط طبقے کی اڑانیں محدود ہوتی ہیں۔ بیٹی اچھی تعلیم پائے، اچھی نوکری کرے اور پھر اچھے گھر میں بیاہ کر کے چلی جائے۔ اس سے آگے تو کبھی سوچتے بھی نہیں۔'' ۲۱

☆''روپیہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا لیکن تسلی اس بات کی تھی کہ سال کے اخیر میں سند مل جاتی تھی جس میں لکھا ہوتا تھا کہ امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئی ہے۔'' ۲۲

☆''اس دن کا وہ آخری پیریڈ تھا۔ دوسرے روز سے چار دن کے لے سکول بند ہونے والا تھا۔ سنیچر، اتوار اور دو چھٹیاں۔ چھٹیوں کا کیا، ہندوستان میں ہر روز کوئی نہ کوئی تیوہار منایا جاتا ہے۔'' ۲۳

☆''قریب تیس منٹ کے بعد سکول کی آخری گھنٹی بج گئی اور ساری لڑکیاں کمرے سے یوں دوڑتی ہوئی باہر نکل گئیں جیسے کسی جیل خانے میں قیدی چھوٹ گئے ہوں۔'' ۲۴

☆''نیہا کلاس کے آخری بینچ پر دیوار کی طرف منہ کر کے خاموش ایسے کھڑی رہی جیسے ڈروتھی براؤن ہیمانز کی نظم میں کسابلانکا جلتے ہوئے عرشۂ جہاز پر کھڑا رہا تھا۔'' ۲۵

☆ ''اُدھر نیہا بے ہوش ہو کر فرش پر کیا پڑی پھر کبھی نہیں اٹھی ۔ چار روز پڑے پڑے اس کا بدن اینٹھ گیا تھا۔ جسم کا رنگ کچھ عجیب سا زرد ہو گیا تھا۔ اس کی بند مٹھی میں وہی چاک تھا جسے اس نے سیاہ تختے پر لکھ لکھ کر اپنی جان گنوائی تھی۔''۲۶

دیپک بدکی کی اس کہانی سے ہمارے معاشرے کی کھوکھلی اقدار، بناوٹی اطاعت شعاری اور جبری طرزِ تعلم کا پردہ فاش ہو جاتا ہے۔ جہاں تک افسانے کی زبان کا تعلق ہے اس میں روزمرہ کے الفاظ برتے گئے ہیں اور اردو کے علاوہ انگریزی و ہندی کے الفاظ کو بھی بڑی خوبی سے استعمال کیا گیا ہے۔ اس افسانے کو معاصر افسانوں کا ایک نمائندہ افسانہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

☆☆☆

﴾ ڈاکٹر صفیہ بانوا ے شیخ، اے سی گراونڈ فلور، تاج پیلس، کمبھر والا، جمال پور، احمد آباد ۳۸۰۰۰۱

﴾ اس افسانے کا عنوان پہلے 'سوری میڈم' تھا جس کا تجزیہ ڈاکٹر صفیہ بانوا ے شیخ نے کیا تھا اور ماہنامہ پیش رفت، نئی دہلی، جلد ۲۵، شمارہ ۵، دسمبر ۲۰۱۷ (ص ۳۰-۲۶) میں چھپوایا تھا۔

حواشی:

(۱) 'دیپک بدکی سے سیفی سرونجی کی بات چیت'، از ڈاکٹر سیفی سرونجی ، مشمولہ: سہ ماہی رسالہ انتساب (دیپک بدکی نمبر): جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶، ص۔ ۲۰

(۲) 'حرف اول'، ریزہ ریزہ حیات' (افسانوی مجموعہ) از دیپک بدکی، ص ۱۱۔۱۲

(۳) 'ایک معصوم کی المناک موت' دیپک بدکی؛ مشمولہ مجموعہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا'؛ ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ص۔ ۶۰

(۴) ایضاً، ص۔ ۶۱

(۵) ایضاً، ص۔ ۶۳

(۶) ایضاً، ص۔ ۶۲

(۷) ایضاً، ص۔ ۶۲

(۸) ایضاً، ص۔ ۶۲

(۹) ایضاً، ص۔ ۶۲

(۱۰)ایضاً،ص۔۶۲

(۱۱)ایضاً،ص۔۶۴

(۱۲)ایضاً،ص۔۶۴

(۱۳)ایضاً،ص۔۶۳

(۱۴)ایضاً،ص۔۶۴

(۱۵)ایضاً،ص۔۶۵

(۱۶)ایضاً،ص۔۶۶-۶۵

(۱۷)ایضاً،ص۔۶۶

(۱۸)ایضاً،ص۔۶۷

(۱۹)ایضاً،ص۔۶۷

(۲۰)ایضاً،ص۔۶۶

(۲۱)ایضاً،ص۔۶۳

(۲۲)ایضاً،ص۔۶۴

(۲۳)ایضاً،ص۔۶۲

(۲۴)ایضاً،ص۔۶۴

(۲۵)ایضاً،ص۔۶۵

(۲۶)ایضاً،ص۔۶۷

☆☆☆

افسانہ ’دودھ کا قرض‘ - تجزیہ

-ڈاکٹر صفیہ بانوائے شیخ

روشنی بھی نہیں ہوا بھی نہیں
ماں کا نعم البدل خدا بھی نہیں (انجم سلیمی)

ماں کے بارے میں نہ صرف انجم سلیمی کا خیال عمدہ ہے بلکہ دیپک بدکی کا افسانہ ’دودھ کا قرض‘ بھی اُسی بنیادی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ شاعر نے ماں سے جڑے جذبات کو دو مصروں میں کہہ دیا ہے لیکن یہی بات جب نثر نگار تحریر کرتا ہے اس میں مزید وضاحت اور ایقان کی ضرورت پڑتی ہے۔ افسانے کا پہلا ہی فقرہ، ’’ساری بستی شعلوں میں لپٹی ہوئی تھی۔‘‘ قاری کے ذہن میں تباہی اور آتش زدگی کی تصویر کھینچتا ہے نیز اس کے تجسس کو انگیز کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کسی فساد یا لڑائی جھگڑے کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر بات جب کھل کر سامنے آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پس منظر کشمیر ہے جہاں آئے دن دہشت گردی کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ دراصل اس افسانے کا مرکزی خیال امریکی ڈاکٹر ہووارڈ کیلی کی سچی گھٹنا سے مستعار لیا گیا ہے مگر اس کو کشمیر کے تناظر میں اس خوش اسلوبی سے نبھایا گیا ہے کہ بالکل نیا، حقیقی اور اچھوتا تھیم لگتا ہے۔ افسانے کا مدعا اس بات پر زور دینا ہے کہ انسانیت آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اس کہانی کا مرکزی کردار اقبال ریشی ہے جو ایک کشمیری پنڈت ہے اور جس کا نام اس کے والد نے، جو اردو شاعر تھا، ’اقبال‘ رکھا ہے جبکہ ’ریشی‘ اُس کی عرفیت ہے۔ کشمیر میں ’ریشی‘ صوفیوں سنتوں کو کہتے ہیں اور یہ کئی گھرانوں کی عرفیت بھی ہے۔ وادیٔ کشمیر کو ’ریشی وآر‘ بھی کہا جاتا ہے جس کا مطلب ’صوفیوں سنتوں کا چمن‘ ہے۔ اس لیے لگتا ہے کہ کرداروں کے نام بھی ان کے

اعمال کے حوالے سے چن کر رکھے گئے ہیں۔ دراصل بچپن میں پیش آئے حادثے نے اقبال کے نظریے کو بدل کر رکھ دیا، یہ اُس وقت کی بات ہے جب وہ صرف دس گیارہ برس کا تھا اور دہشت گردی کے سبب اُسے اپنے گھر اور اپنے والدین سے جدا ہونا پڑا۔ وہ لگاتار اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں بھاگتا رہا جس کو افسانے میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"اس کمسن لڑکے کو کہاں جانا تھا، اسے معلوم نہ تھا۔
فقط دوڑے جا رہا تھا۔ مہیب اندھیروں کو پیچھے چھوڑ
کر وہ روشنی کی تلاش میں بھاگ رہا تھا۔"[۲]

انسان چاہے کیسے بھی برے حالات سے کیوں نہ گزرے، کوئی نہ کوئی امید کی کرن اُسے راستہ دکھاتی ضرور ہے۔ افسانے میں جب اقبال اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا ہے بالآخر وہ ایک نئی بستی میں داخل ہو جاتا ہے جہاں اُس کی ملاقات رحمتی نامی ایک نیک خاتون سے ہوتی ہے۔ رحمتی بذاتِ خود ایک ماں ہے جس کی نگاہ اچانک کمسن اقبال پر پڑتی ہے اس لیے وہ اپنے آپ کو روک نہیں پاتی۔ رحمتی کی ممتا ایسے اُمڈ پڑتی ہے جیسے اُس نے اپنے بیٹے کو دیکھ لیا ہو جو پناہ کا خواست گار ہے، وہ فوراً نیچے اترتی ہے اور اُسے سنبھالنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے۔ ماں کے دل میں قدرتی طور پر ممتا کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اس کا اپنے بچے سے ایسا واحد رشتہ ہوتا ہے جو ہر رشتے سے بالا ہوتا ہے۔ یہی ممتا اس کو اقبال کی طرف فوراً کھینچتی ہے جس کے بارے میں افسانہ نگار تحریر کرتے ہیں:

"جونہی اس کی نظر لڑکھڑاتے ہوئے اس ننھے لڑکے
پر پڑی اس کی ممتا نے کروٹ لی اور وہ کچن سے پانی
کا لوٹا اٹھا کر کودتی پھاندتی نیچے سڑک پر پہنچ گئی۔"[۳]

افسانے کا پہلا مرحلہ تب سامنے آتا ہے جب اقبال کو رحمتی اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے اور اپنے گھر میں اطمینان سے بٹھلاتی ہے۔ اقبال خوف و ڈر میں مبتلا ہوتا ہے اُس کے باوجود

رحمتی کے حُسن سلوک کو دیکھ کر اُسے اپنی ماں کی یاد آتی ہے جو کچھ ہی گھنٹے پہلے شوہر، پریم ناتھ پرتیم سمیت دہشت گردی کا شکار ہو چکی تھی۔ رات بھر ان خوفناک حالات سے جوجھ کر وہ ذہنی طور پر صدمے کا شکار ہو جاتا ہے اور بار بار ان کے بارے میں اور اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہوتا ہے۔ اُس کی یہ حالت کسی ذہنی مریض سے کم نہیں ہوتی۔ وہ رحمتی کو اپنے اور اپنے والدین کے بارے میں جس اضطراب کے ساتھ سارا واقع بیان کرتا ہے اس کی وجہ سے کبھی غش کھا کر گر پڑتا ہے اور کبھی کانپنے لگتا ہے۔ دیپک بدکی نے اس کی نفسیاتی کیفیت کو بڑے ہی ہمدردانہ اور ہنرمندانہ انداز میں بیان کیا ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کو انسانی نفسیات اور جذبات کی تصویر کشی کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''اقبال تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کا ماتھا پسینے پسینے
> ہو رہا تھا۔ اندر گھستے ہی وہ پھر سے بے ہوش ہو گیا
> اور فرش پر دھڑام سے گر گیا۔ بدن میں کپکپاہٹ
> بدستور جاری تھی۔ رحمتی جلدی سے ٹھنڈے پانی کا
> ایک اور لوٹا لے آئی اور اس پر چھڑکنے لگی۔ چند لمحوں
> میں وہ سنبھل گیا۔''[۴]

اس وقت اقبال کا ہر لمحہ یادوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اُسے اپنی ماں کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اسے وہ واقعہ یاد آیا جب ایک روز اُس کے گھر رحمتی کی صورت جیسی ایک خاتون رابعہ آئی تھی، وہ اُس کی ماں کے ساتھ ہی اسکول میں پڑھاتی تھی۔ رحمتی اور رابعہ دونوں مسلمان تھیں مگر اسے ان میں اور اپنی ماں میں زیادہ کوئی فرق معلوم نہیں ہوا تھا۔ کشمیر کی مخلوط تہذیب کی اس طرح افسانہ نگار نے بڑی خوبی سے عکاسی کی ہے۔ افسانہ کا مندرجہ ذیل اقتباس اس بات کی گواہی دیتا ہے:

> '' ہمارے رہن سہن میں زیادہ فرق نہیں تاہم
> پوشاک سے ہم پہچان سکتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے یا
> ہندو؟ اب تو مغربی کلچر کے سبب وہ امتیاز بھی مٹتا

جارہا ہے۔ہاں اتنا ہے کہ ہم مندروں میں جاتے
ہیں اور یہ مسجدوں میں۔" ۵

اقبال رحمتی کو رات کے واقعات کی تفصیل سناتا ہے کہ کس طرح اُس کے والدین دہشت گردوں کو رات بھر پناہ دینے کے لیے مجبور ہو گئے تھے، اُس کی والدہ نے انھیں کھانا پکا کر کھلایا تھا مگر جونہی ان کو پولیس کے چاروں طرف سے گھیر لینے کی خبر ملی، انھوں نے اقبال کے والدین کو ڈھال بنا کر کے بھاگ نکلنے کی کوشش کر لی اور اس کوشش میں والدین گولیوں کا نشانہ بن گئے۔اس دوران آگ اور دھوئیں کی آڑ میں اقبال اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، صبح کا انتظار خوف و وحشت میں کرتا ہے اور جوں توں کر کے نئی بستی میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ رحمتی کے گھر میں پناہ لیتا ہے۔ان دل دہلانے والے واقعات کے باوجود وہ رحمتی کے پیار کے زیر اثر اپنی ماں کے نیک خیالات کو یاد کرتا ہے اور ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اقتباس:

"بیٹے ہم سب انسان ہیں اور ہم میں کوئی فرق نہیں
ہے۔سب کا بھگوان ایک ہے، صرف پوجا کرنے
کے طریقے الگ الگ ہیں۔ہمیں سب سے محبت
کرنی چاہیے۔اور حاجت مندوں کی حاجت رفع
کرنی چاہیے۔" ۶

یہ کہانی کا دوسرا سنگ میل ہے۔اقبال رحمتی کو اپنی بیتی باتیں سناتا ہے، رحمتی ایک نیک خاتون ہے جس کا خود اپنا بیٹا سجاّد ہے۔رحمتی کے پوچھنے پر اقبال نے اسے بتایا کہ اُس کا ماما جنرل پوسٹ آفس سرینگر میں کام کرتا ہے، اُس کی ایک بہن بھی ہے جس کی شادی ہو چکی ہے اور اب وہ اپنی سسرال چنڈی گڑھ میں رہتی ہے۔اقبال رحمتی سے التجا کرتا ہے کہ اسے کسی طرح اس کے ماما کے پاس پہنچا دیا جائے۔رحمتی اپنے بیٹے سجاّد کو حکم دیتی ہے کہ وہ جلدی سے اقبال کو اپنے ماما کے حوالے کر کے واپس چلا آئے۔جانے سے پہلے رحمتی اقبال کو بڑے پیار سے دودھ کا ایک گلاس

پلاتی ہے تا کہ اس کی گھبراہٹ دور ہو اور اس کی قوت بحال ہو جائے۔ وہ کشمیری میں اس کو اپنا لخت جگر کہہ کر مخاطب ہوتی ہے اور ڈھیر ساری دعائیں دیتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''چومیانہ لالہ (پیو میرے لال)، ماں کے ہاتھ کا
> دودھ پی کر جاؤ۔ خدا تمھیں لمبی عمر اور روشن مستقبل
> سے نوازے۔ میں تمھارے لیے ہر دم دعائیں کرتی
> رہوں گی۔'' ۷

اس طرح اقبال ماما کی وساطت سے اپنی بہن کے پاس چنڈی گڑھ پہنچ جاتا ہے اور خوب محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کرتا ہے۔ وہ ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر کے ماسٹر آف سرجری (ایم ایس) کی پڑھائی مکمل کرتا ہے۔ تعلیم کے بعد وہ امریکہ جاتا ہے جہاں وہ سرطان کے مرض کے بارے میں سپیشلائزیشن کرتا ہے اور پھر واپس آ کر دہلی کے شہرت یافتہ کینسر اسپتال میں لوگوں کا علاج کرتا ہے۔ یہ افسانے کا وہ موڑ ہے جہاں کہانی میں سسپنس آ جاتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور پھر کلائمکس بھی سامنے آتا ہے۔ اقبال محض اقبال نہیں رہتا بلکہ وہ ہمارے سامنے ڈاکٹر اقبال ریشی بن کر نمودار ہوتا ہے۔

قسمت کی ستم ظریفی سمجھ لیجیے کہ رحمتی کو کینسر ہو جاتا ہے اور اسے آپریشن کرانے کی لیے دہلی بھیجا جاتا ہے۔ اس کا داخلہ اسی اسپتال میں ہوتا ہے جہاں ڈاکٹر اقبال ریشی سرجن سپیشلسٹ ہوتا ہے اور اسی کام پر معمور ہوتا ہے۔ مشورے کے دوران ڈاکٹر اقبال مریضہ کو پہچان جاتا ہے مگر اپنے بارے میں کچھ نہیں بولتا۔ اسے وہ دن یاد آتا ہے جب ایک عورت نے اس کو موت کے منہ سے بچایا تھا، اسے ماں کا پیار دیا تھا اور اس کو بہ حفاظت اپنے ماما کے پاس پہنچوایا تھا۔ اِدھر اسپتال میں آپریشن کے اخراجات کو لے کر رحمتی اور اُس کا بیٹا سجّاد پریشاں ہو رہے تھے۔ کئی بار پوچھنے کے بعد اسپتال نے تین لاکھ کا مجموعی تخمینہ بتایا۔ جوں توں کر کے سجاد نے رقم کا بندوبست کر لیا اور اس طرح رحمتی کا آپریشن ہو گیا۔ آپریشن کامیاب ہو جاتا ہے اور رحمتی رفتہ رفتہ ہوش میں آ جاتی ہے

۔کچھ دن بعد اس کے ڈسچارج کا حکم دیا جاتا ہے جس سے قبل سجاد اسپتال کی ساری بلیں ادا کرنے کے لیے دفتر میں چلا جاتا ہے۔ وہاں اس کو بل دیکھ کر حیرانی ہوجاتی ہے کہ تخمینے سے بہت کم رقم اسے مانگی جاتی ہے، وہ بار بار ان سے پوچھتا ہے کہ کہیں کوئی غلطی تو نہیں کر رہے ہیں جس پر دفتر کا منیجر اس کو فائل دکھا دیتا ہے۔ فائل پر ڈاکٹر کے ہاتھ سے لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر اس پر اصلیت کا انکشاف ہوجاتا ہے۔ عبارت یوں ہوتی ہے:

> ''ہسپتال اور ادویات کا جو بھی خرچہ ہو، وہ مریضہ
> سے وصول کرلیا جائے۔ جہاں تک ڈاکٹر کی فیس کی
> رقم کا تعلق ہے وہ پینتیس سال پہلے ایک دودھ کے
> گلاس کی شکل میں وصول ہوچکی ہے۔ میں رحمتی کی
> صحتیابی کی دعا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر اقبال ریشی۔''۸

افسانہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ ڈاکٹر اقبال رحمتی یا اس کے لواحقین پر کوئی احسان نہیں جتانا چاہتا ہے اس لیے بنا کچھ بتائے ہوئے اور بغیر رحمتی سے ملے وہ اسی روز پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت امریکا کے ٹور پر چلا جاتا ہے۔ رحمتی اور اس کی فیملی کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوتا ہے۔

افسانے کی منظر نگاری کشمیر کے کشیدہ ماحول کے حوالے سے بڑی حساسیت سے کی گئی ہے، نہ اس میں کہیں کئی جنونیت ملتی ہے اور نہ ہی کوئی غیر ضروری جذباتیت۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں پر مثبت سوچ اور باہمی رواداری کے منظر بھی سامنے آتے ہیں۔ جہاں تک کرداروں کا تعلق ہے اس افسانے کے دو کردار، رحمتی اور اقبال قاری پر دائمی اثر چھوڑ جاتے ہیں، رحمتی کی رحمت اور ڈاکٹر اقبال کے بلند اقبال کا ثانی ملنا مشکل ہے، اس لیے دونوں کردار امر ہوجاتے ہیں۔ مکالمے بھی اثر انگیز اور برمحل ہیں۔

دیپک بدکی ہر بار ہمیں ایسے افسانے دے کر سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اس افسانہ میں مصنف کا نقطۂ نظر قابلِ تعریف ہے۔ کشمیر کے تناظر اور موجودہ ہندستانی معاشرے میں جو فرقہ

وارانہ منافرت کا زہر پھیل چکا ہے اس میں ضروری ہے کہ ہم ایسے کرداروں کو ڈھونڈ نکالیں جن کی سوچ مثبت ہو اور جو انسانیت کے علم بردار ہوں۔ انسانیت ہی زندگی کی امیدیں قائم رکھتی ہے۔ ضمنی طور پر یہ بھی عرض کروں کہ تخریب سے بڑھ کر تخلیق اور ناخواندگی سے بڑھ کر تعلیم پر قلم کار نے زور دیا ہے نہیں تو ڈاکٹر اقبال ریشی جیسے انسان معاشرے میں ناپید ہو جائیں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر صفیہ بانوا ے شیخ، اے سی گراونڈ فلور، تاج پیلس، کمبھر والا، جمال پور، احمد آباد ۳۸۰۰۰۱

حواشی :

(۱) افسانوی مجموعہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا'؛ مصنف: دیپک بدکی؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶؛ پہلا ایڈیشن: ۲۰۱۶ء؛ صفحہ: ۳۲

(۲) ایضاً صفحہ : ۳۲

(۳) ایضاً صفحہ : ۳۲ تا ۳۳

(۴) ایضاً صفحہ : ۳۴

(۵) ایضاً صفحہ : ۳۴

(۶) ایضاً صفحہ : ۳۶

(۷) ایضاً صفحہ : ۳۸

(۸) ایضاً صفحہ : ۴۱

☆☆☆

افسانہ 'زخموں کے اُجالے' کا تجزیہ

-شبیر احمد مصباحی

دیپک بُدکی ایک عالمی شہرت کے حامل مصنف و افسانہ نگار ہیں۔ اپنی خداداد صلاحیتوں ومشاہدات سے وہ اپنے افسانوں میں قارئین کے ادبی ذوق کو تسکین بخشنے کے لئے بہت کچھ رکھ دیتے ہیں۔ زیر تبصرہ افسانہ بھی اُن کے مشاہدات و بہترین بیانیہ کی عکاسی کرتا ہے۔

''زخموں کے اُجالے'' بھی معروف افسانہ نگار دیپک کمار بُدکی صاحب کا ایک افسانہ ہے جو اپنی بنت میں اگر چہ ایک افسانہ ہے مگر افسانے میں بیاں ہمارے سماج کی ایک دل خراش حقیقت کی وجہ سے قارئین کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس افسانے میں معروف افسانہ نگار نے ہمارے سماج کی ایک ایسی حقیقت کو اپنے فن سے ایسے اپنے قاریوں کے لئے اتنا دلچسپ بنایا کہ قاری جہاں افسانہ پڑھ کر افسانے کا لطف حاصل کرتا ہے وہیں دوسری طرف اُس پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آج سچ بولنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے شخص پر تشکیل پایا ہے جو اپنی صدق بیانی سے نہ صرف بہت پریشان ہے بلکہ نفسیاتی طور سے صدق بیانی اس کی زندگی کا ایک جزء لاینفک بن گئی ہے۔ اور وہ چاہ کر بھی جھوٹ بول نہیں پاتا ہے۔ جیسے افسانہ کے یہ الفاظ ''حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ میں نے بار بار سچائی کو ترک کر کے جھوٹ بولنے کی شعوری کوشش کی مگر بولتے بولتے گھبرا گیا اور مخاطب نے میرے کذب کو پکڑ لیا۔ اس لئے پھر وہی صدق مقال۔ جھوٹ تو میں بولنا چاہتا ہوں مگر بول نہیں پاتا'' اور دوسری جگہ لکھتے ہیں ''کئی بار سوچا کہ کسی نزدیکی چوراہے پر کھڑا ہو جاؤں اور چیخ چیخ کر کہوں کہ میں صادق الاعتقاد ہوں نہ راست گو۔ جو کہتے ہیں کہ میں سچ بولتا ہوں سب جھوٹ، بہتان ہے۔ میں سب لوگوں کے سامنے مقدس کتاب اُٹھا کر قسم کھانا چاہتا ہوں

کہ آج سے میں جھوٹ بولوں گا۔''افسانے کے مذکورہ الفاظ ہماری بے حسی کا واضح ثبوت ہیں کہ ہماری وجہ سے ایک نیکوکار انسان کو اتنا صدمہ پہنچا ہے کہ وہ اعلان کرنا چاہتا ہے کہ میں اب ہمیشہ جھوٹ بولوں گا۔''

اب افسانہ میں پیش یہ شخص جھوٹ بولنا کیوں چاہتا ہے یہ بھی اپنے آپ میں دلچسپ ہے۔ کیوں کہ وہ جس سماج میں رہتا ہے وہاں جھوٹ بولنے کی اہمیت کس قدر ہے اس کو بُد کی صاحب کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔''شرافت، خلوص اور دیانت داری موجودہ زمانے کی سب سے بڑی رُکاوٹیں ہیں۔ آج کل کی دُنیا میں جھوٹ بولنا عصائے موسیٰ کی مانند ہے جو زندگی میں آرام وسکون میسر کر سکتا ہے۔ آخر کیا ملتا ہے سچ بولنے سے۔ ناکامی، ذلت اور خواری''۔ افسانہ نگار یہاں ہماری سچائی کے تئیں بے رُخی کو بڑے کرب کے ساتھ بیان کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں'' آخر کیا ملتا ہے سچ بولنے سے۔ ناکامی، ذلت اور خواری'' کتنا درد و کرب نہاں ہے اس جملے میں واقعی سچ بولنے والوں کو کیا ملتا ہے؟ انہیں پوری دنیا بے وقوف سمجھتی ہے۔ ہر جگہ اُن کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کرتا ہے بلکہ ہم سمجھاتے ہیں کہ کہیں کہیں جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ ہر جگہ جب سچ بول کر ناکامی ملے اور دوسری طرف وہ انسان یہ دیکھے کہ کاذبوں کو کامیابی مل رہی ہے تو سوچنے پر مجبور ہوگا کہ آخر کیا ملتا ہے سچ بول کر۔ یہاں ہمارے اس کاذب معاشرے کا دوہرا رویہ واضح کر دیا گیا ہے

افسانے کی یہ عبارت بھی قابل غور وفکر ہے۔''بارہا میرے ذہن میں سوال اُٹھتا ہے کہ میں نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو اصولوں کا قیدی کیوں بنا رکھا ہے؟ اصولوں کے منفی عواقب بھی تو نکلتے ہیں۔ میں کوئی یُدھشٹر تھوڑے ہی ہوں۔ اصولوں کو ترک کر کے سب لوگ مزے سے جی رہے ہیں۔ گھر والی خوش، باہر والی خوش، باس خوش، ماتحت خوش، غرض ساری دُنیا خوش۔ صبح دم خدا کے تملق کی خاطر صحیفے کی گردانی کرو، پھر اس کو جزدان میں رکھ کر دن بھر بھول جاؤ۔ اس طرح خدا بھی خوش''

یہاں بُدکی صاحب کے مشاہدات نے افسانے کو جان بخش دی اور بڑے فنکارانہ

طریقے سے وہ اپنے مشاہدات افسانے کی وساطت سے رکھتے ہیں کہ کیسے نیک اصولوں نے سماج کے چند نیکوکاروں کی زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے تو دوسری طرف چند مکار اپنے فرائض منصبی کو بے ایمانی سے انجام دے کر بھی دھن دولت کماتے ہیں۔ یہاں پر اُن مذہبی بدکاروں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے جو صبح صبح چند بھجن یا آیات کی تلاوت کر کے سماج کی نظروں میں پارسا بنے پھیرتے ہیں۔''اور اس طرح خدا بھی خوش'' سے اُن کے مکروفریب پر بڑا گہرا طنز کیا گیا ہے۔

یہ کہانی جہاں ایک طرف ہمارے سماج کی نت نئی برائیوں اور فریب کاریوں کو اجاگر کرتی ہے وہیں دوسری طرف یہ آج کے ہمارے معاشرے کے شریف النفس انسانوں کی مجبوری کو اجاگر کرتی ہے کہ کیسے وہ اس جھوٹے وخود ساختہ سماج جو ایک طرح سے دجال کی خود ساختہ جنت ہے، میں کن مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ جیسے افسانے کے یہ الفاظ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم سوچیں کہ ہماری وجہ سے ایک بچے کو اپنے باپ کے دئے ہوئے نیک سنسکار فضول لگتے ہیں۔

''لوگ کہتے ہیں یہ میرے سنسکار ہیں۔ جی ہاں میرے پتا جی نے بے شک ایک کام غلط کیا کہ بچپن میں مجھے سچ بولنے کا درس دیتے رہے اور اس بارے میں میری حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے۔ انھوں نے نادانستہ طور موجودہ معاشرے میں میرے لئے بے روک ٹوک اور بگ ٹٹ ترقی کے سارے بند کردئے۔''

افسانے میں نیک تربیت کی فتح بھی دکھائی گئی ہے اور ایک بڑے نفسیاتی اصول کی حقانیت بھی پیش کی گئی ہے کہ بچپن میں دئے گئے نیک سنسکار کبھی رائیگاں نہیں جاتے وہ انسان پر دوررس اثرات مرتب کرتے ہیں کہ افسانے کے کردار کو پتا نے جھوٹ نہ بولنے کی ہدایت کمسنی میں دی تھی اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے اس لیے اُن کا بچہ بڑا ہو کر چاہ کر بھی جھوٹ نہیں بول پاتا ہے۔ وہ سماج کے ناخداؤں کی تمام تر مکاریوں سے واقف تو ہے مگر خود ان کے رنگ میں رنگ نہیں پاتا ہے۔

دیپک بدکی کا یہ افسانہ آج کے سماج میں جو چند فرشتہ صفت انسان پائے جاتے ہیں اُن

کی بہترین ترجمانی کرتے ہوئے ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ میں مصنف کو اپنے مشاہدات وفنی باریکیوں میں اُن کی دسترس اور بہترین بیانیہ کیلئے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

٭شبیر احمد مصباحی، گنڈیال دراس، ضلع کرگل، جموں وکشمیر-۱۹۴۱۰۲

مشاہیر ادب اور قارئین کے تاثرات

سہ ماہی انتساب عالمی سرونج (دیپک بُدکی نمبر؛ جلد ۳۴؛ شمارہ ۱۰۳، جولائی/ اگست تا ستمبر ۲۰۱۶ء)

☆انتساب دیپک بُدکی نمبر ابھی ابھی ملا۔ بہت شکریہ۔

بہت عمدہ ماشاءاللہ۔ مبارک باد۔ یہ میرے پسندیدہ فن کار ہیں۔ آپ نے اردو ادب کے لیے یہ اہم خدمت کی ہے۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

(پروین شیر، امریکہ، انتساب عالمی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء؛ ص ۲۳۳)

☆دیپک بُدکی نمبر موصول ہوا۔ آپ نے موصوف کے فن اور شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے والے مضامین جمع کر کے اردو دنیا کو ایک تحفہ عطا کیا ہے۔ بُدکی صاحب کے اہم خطوط، افسانے، نظمیں، تجزیے اور تبصرے انھیں ایک عظیم فن کار ثابت کرنے لیے لیے کافی ہیں۔ ادب بھی گروہ بندی کا شکار رہا ہے اور کتنے ہی فن کار ایسے ہیں جن کو وہ مقام نہ حاصل ہوا جس کے وہ حقدار ہیں۔ بُدکی صاحب بھی اس کے شکار ہیں۔ اس کے باوجود انھیں خوش ہونا چاہیے کہ آپ جیسی کتنی شخصیتیں ادب کے میدان میں ان کو سراہنے والی موجود ہیں۔ ممکن ہے آئندہ انھیں ساہتیہ اکادمی اوارڈ سے بھی نوازا جائے۔ ہم تو بس اس کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔

(مہدی پرتاپ گڑھی، انتساب عالمی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء؛ ص ۲۳۴-۲۳۳)

☆انتساب عالمی کے دیپک بُدکی نمبر کے مطالعے سے سیرابی ذوق کا لطف حاصل ہوا۔ یہ خاص شمارہ جتنا ضخیم ہے اتنا ہی وقیع و موقر بھی ہے۔ دیپک بُدکی کو یہ شاندار خراج تحسین 'حق بہ حق

دار رسید' کے مصداق ہے۔اس سے پہلے انتساب پبلی کیشنز کے زیر اہتمام وادی کشمیر کے دو اور مقتدر شخصیات پر دستاویزی کتابیں (۱) حامدی کاشمیری شخصیت اور فن، اور (۲) وحشی سعید ایک منفرد فکشن نگار، شائع ہوکر مشہور و مقبول ہوچکی ہیں۔ زیر نظر دیپک بُدکی نمبر بھی موصوف کی شخصیت اور کارناموں پر تحقیق کرنے والوں کے لیے نشان راہ ثابت ہوگا۔

(غلام مرتضٰی راہی، انتساب عالمی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء؛ص ۲۳۴)

☆انتساب عالمی کا تازہ شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء کچھ عرصے پہلے آپ کے خلوص اور آپ کی محبتوں کے ساتھ مجھے مل گیا تھا۔اس قدر ضخیم پرچہ کو پڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔مگر یہ میرے مطالعہ میں ہے اور اب تک کافی کچھ پڑھ چکا ہوں۔ایک تو وقت کی کمی پھر اتنا ضخیم پرچہ میں سمجھتا ہوں کہ دیپک بُدکی بھی اب تک اسے پورا پڑھنے سے قاصر ہوں گے۔ایک تو مضامین میں دیپک بُدکی کے بارے میں زیادہ کچھ نیا پڑھنے کو نہیں ملا، ہر مضمون میں گھوم پھر کے ایک ہی بات بار بار سامنے آتی ہے، جس سے قاری کی دلچسپی کم ہونے لگتی ہے۔اس نمبر کی یہ خوبی ضرور ہے کہ اس میں دیپک بُدکی کی تمام تر فنکارانہ خوبیاں سمٹ آئی ہیں۔آپ سے بات چیت کے دوران ایک بڑی چونکانے والی بات دیپک بدکی نے یہ کہی کہ '' مجھے ایک قصہ یاد آرہا ہے، میں نے جب دوسرا مجموعہ ترتیب دیا، تو اس کی اشاعت کے لیے استعارہ پبلی کیشن سے رجوع کیا تھا، ان کا جواب تھا کہ ۲۹ ہزار کے عوض نہ صرف میرا مجموعہ چھپ جائے گا بلکہ گوپی چند نارنگ سے اس پر پیش لفظ بھی لکھوایا جائے گا۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ یہ بات تو میں نے کبھی سوچی بھی نہ تھی کہ ادب کا بھی 'تجارتی کرن' ہو چکا ہے اور مارکیٹ میں اس کے بھی دلال دستیاب ہیں۔'' بات بہت افسوس ناک ہے، بات تو سچ ہے کہ آج ادب بھی خریدا بیچا جارہا ہے اور شہرت اور عزت بھی۔اس 'تجارتی کرن' کا کوئی ذمہ دار ہے تو وہ ہے 'شاعر' کے مدیر افتخار امام، جس نے شاعر کا ہی تجارتی کرن کردیا ہے۔ ہر مہینے نا اہل اور ناکارا و ناشاعر و ادیب کے گوشے متواتر نکل رہے ہیں۔ ۲۰۰۵ء مختصر گوشے چار صفحات کے ۲۰۰۰ روپے میں اور مفصل گوشہ ۱۰۰۰۰ میں نکالے جارہے ہیں۔ میں نے خود اپنا

گوشہ ۲۰۰۰/روپیوں میں نکلوایا تھا۔ اب کیا ریٹ ہے پتہ نہیں۔ اودے پور کے ایک صاحب نے بھی اپنا گوشہ یا نمبر ۱۰۰۰۰/کیش میں نکلوایا تھا۔ شاعر کے اس کام سے متاثر ہوکر چھوٹے بڑے کئی رسالوں نے یہ تجارتی کام شروع کر دیا اور اب تو ایک چلن سا ہو گیا ہے اور اسی بہانے بہت سے رسالے بڑے دیدہ زیب نکل رہے ہیں۔ اس سے فنکار بھی خوش اور مدیر بھی خوش۔ کیونکہ ایک کو شہرت مل رہی ہے اور ایک کو پیسہ۔

اور اگر مجھ سے کچھ لوگ جو ادب میں پچھلے پچاس سالوں سے بھی زیادہ عرصے سے لکھنے پڑھنے والے جل بھن رہے ہیں، تو اس سے ادب کا کیا نقصان ہو رہا ہے۔ ادب کا کام تو چل رہا ہے۔ اس لیے میں تو کہتا ہوں کوئی بڑا نقاد سستے میں مل جائے اور آپ کی حیثیت اسے خریدنے کی ہے تو ضرور خرید لینا چاہیے۔ کہاں بے کار کی باتوں میں پھنس گیا، لکھنے تو بیٹھا تھا دیپک کے اس خوبصورت نمبر پر اپنے تاثرات مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بہر حال دیپک کو یہ نمبر بہت بہت مبارک ہو کہ اس نمبر کے لیے حرف حرف سے محبت کی خوشبو پھیل رہی ہے۔

(شاہد عزیز، انتساب عالمی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۲۳۵-۲۳۴)

☆ آپ کا سہ ماہی انتساب کا دیپک بُدکی نمبر نظر نواز ہوا۔ یاد آوری کے لیے شکر گزار ہوں، آپ کی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کرنا میرے خیال میں حق کی تائید کرنے کے برابر ہے۔ کیونکہ دانشور کے کارناموں کی ستائش کرنا ایمان کا حصہ ہوتا ہے۔ آپ اس سے پہلے بھی کئی ادبی کارنامے انجام دے چکے ہیں اور کئی نمبر بھی نکال چکے ہیں۔ میں آپ کی ان تمام کاوشوں اور صلاحیتوں کا دل سے معترف ہوں۔ آپ کا تازہ نمبر مشاہیر کے مختلف موضوعات، تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے، جو خاصا ضخیم ہونے کے باوجود دلچسپ اور بامعنی مضامین سے بھرپور ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

(ماجد دیوبندی، وائس چیئر مین اردو اکادمی، دہلی سرکار، انتساب عالمی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۲۳۶؛ ص ۲۳۷-۲۳۶)

☆انتساب کا جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء کا شمارہ ۴۸۸ صفحات پر ترتیب دیا گیا ہے جس کے ۳۵۴ صفحات دیپک بُدکی کے گوشے کی نذر کیے گئے ہیں۔ بقیہ ۱۳۴ صفحات میں عام شمارے کو اس قدر علمی انداز میں ترتیب دیا گیا ہے کہ دیپک بدکی نمبر کے ساتھ یہ بھی یادگار بن گیا ہے۔

دیپک بُدکی صاحب کے فکر وفن کے تعلق سے لکھنے والوں میں بیشتر بڑے نام شامل ہیں لیکن مذکورہ نمبر میں اردو زبان کے ایک عام قاری گور چرن سنگھ کا خط بھی ہے جو اردو زبان اور دیپک بُدکی کو ایک ساتھ اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ جس پر تمام اردو والوں کو فخر کرنا چاہیے۔

چند سطریں مکتوب سے نقل کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیں۔ ''اس زبان میں لکھے گئے لٹریچر کو پڑھا تو ہے مگر اردو لکھنے میں ہاتھ بہت تنگ ہے، پہلے آپ کو انگریزی میں خط لکھنے کو سوچا مگر پھر اس خیال نے ایسا کرنے پر مجبور کیا کہ میں اردو کے ایک مایہ ناز ادیب کو خط لکھ رہا ہوں، چاہے ٹوٹی پھوٹی ہی سہی، اس کی زبان میں لکھوں۔'' گور چرن سنگھ کا خیال میرے اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ جو جس زبان میں اپنی صلاحیت کو روشن کرتا ہے، وہ اسی زبان کا ہو جاتا ہے، چاہے اس کی مادری زبان کوئی بھی ہو اور دیپک بدکی خاکسار کے خیال میں ایک ایسے فن کار ہیں جو سچ بولنے اور سننے کی قوتیں اپنے اندر سنبھالے ہوئے مسلسل تخلیقی راہوں کو منزلوں سے ہمکنار کرتے جا رہے ہیں۔

لیکن انھوں نے ڈاکٹر سیفی سرونجی سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے اتاولے پن کا اظہار بہت ہی صاف گوئی کے ساتھ کیا ہے اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کیا ہے کہ وہ اپنی اس کمزوری کی وجہ سے ہی آج تک کوئی ناول نہیں لکھ پائے ہیں۔ دیپک بُدکی صاحب، آپ کا یہ اتاولا پن بھی آپ کے حق میں بڑے کام کی چیز ثابت ہوا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو آپ صرف کہانی کی راہوں کو اپنے تخلیقی پھولوں سے نہ سجا رہے ہوتے لیکن آپ کے اس اتاولے پن نے آپ کو ادب کی اتنی سمتوں میں بکھیر دیا ہے کہ اب ناقدین ادب آپ کو پوری طرح سمیٹنے میں لگے ہوئے ہیں مگر سمیٹ نہیں پا رہے ہیں۔ اس لیے اردو قارئین و قلم کاروں کو آپ کے تخلیقی حوالے سے یہ یقین ہو چلا ہے کہ

آنے والے زمانوں میں بھی آپ کے کمال وفن کا تذکرہ یوں ہی جاری رہے گا۔

(شارق عدیل، ضلع ایٹا، یوپی؛ انتساب عالمی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۲۴۸-۲۴۷)

☆عصر حاضر کے معروف اور اہم قلم کار جناب دیپک بُدکی پر آپ نے شاندار گوشہ پیش کیا ہے۔ اس لیے آپ اور صاحب گوشہ دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(مراق مرزا، انتساب عالمی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۲۴۳)

☆انتساب عالمی جولائی تا دسمبر ۲۰۱۶ء دیپک بُدکی نمبر کی شکل میں ملا اور میری ادبی تشنگی کو اور مہمیز کر گیا، نمبر ہر طرح سے دیپک بدکی صاحب کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتا ہے، بعد مطالعہ میں نے فون پر بدکی صاحب سے گفتگو کی تو اندازہ ہوا کہ اس نمبر کی اشاعت پر خوش ہیں۔ مبارکباد قبول کیجیے۔

(صابر فخر الدین، انتساب عالمی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۲۴۳)

☆....کل کی ڈاک سے دیپک بُدکی نمبر باصرہ نواز ہوا۔ ماشااللہ صوری، معنوی ہر دو لحاظ سے قابل مطالعہ ہے اور ایک دستاویز کی حیثیت سے محفوظ رکھنے کی چیز ہے، ایسے خاص نمبر ہر کبھی شائع نہیں ہوتے ہیں۔ مذکورہ خاص نمبر میں مشاہیر ادب نے ہر پہلو سے دیپک بُدکی کے فکر وفن کا جائزہ لیا ہے اور موصوف کی افسانہ نگاری کے تقریباً سبھی گوشوں کو بھرپور احاطہ کر عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ وہ تمام قلم کاران جن کے مضامین صاحب گوشہ کے مختلف افسانوں کو اپنی تحریر کا محور بناتے ہوئے اظہار خیال کر اپنی رائے رکھی ہے، مبارکباد کے قابل ہیں اور ان سے کہیں زیادہ آپ کی محنت و کاوش جس نے اتنے سارے مضامین کو یکجا کر خاص نمبر کی صورت میں شائع کیا ہے، لائق صد ستائش و قابل رشک اور قابل تقلید بھی ہے۔ مجھ ناچیز کی طرف سے اتنے وقیع و معیاری خاص نمبر کی اشاعت پر دلی مبارک باد قبول ہو۔ آپ نے اس خاص نمبر کے ذریعہ جناب دیپک بُدکی کے فکر وفن خصوصاً افسانہ نگاری کو وہ بلندی عطا کر دی ہے، جہاں سے ہر افسانہ نگار پستہ قد دکھائی دیتا ہے۔ میری رائے میں کسی ایک قلم کار کے لیے ایک ساتھ اتنے زیادہ ادباء وشعراء کا تحریری شکل

میں اظہار خیال کرنا، اس قلم کار کے لیے باعث فخر ہے، بالفاظ دیگر اس کی معراج ہے۔ جناب دیپک بُدکی کو میری دلی مبارکباد۔ موصوف (صاحب گوشہ خاص نمبر) آپ کی اس کاوش و محنت کا جس نے انھیں ادبی دنیا میں امر کر دیا، جتنا بھی شکریہ ادا کریں وہ کم ہی ہوگا۔ مذکورہ خاص نمبر میں شامل مضامین کے بارے میں پڑھنے کے بعد ہی کوئی رائے دی جا سکتی ہے۔

(ابرار نغمی، انتساب عالمی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۲۴۵-۲۴۴)

☆انتساب عالمی (دیپک بدکی نمبر) موصول ہو کر زیر مطالعہ آیا اور اچھا معلوم ہوا۔ دیپک بُدکی شریف آدمی ہیں، میں ان کی تعریف کرنے پر اس لیے بھی مائل ہوں کہ انھوں نے میرے جیسے بے قلم تختی نیم ادیب، چوتھائی شاعر، جاں لیوا شکاری اور نیم ملا کے بارے میں دو تعریفی مضامین تخلیق کر کے شائع کرائے تھے اور فیس بک کے میرے مرتب کردہ حلقے کے رکن اور میرے 'فرنڈ' ہیں۔

لیکن دیپک بُدکی واقعی نہایت اچھے افسانہ نگار اور مہذب ادیب ہیں۔ میں نے ان کے کئی افسانے پڑھے ہیں، یہ جدا بات ہے کہ میں نے ان کی افسانہ نویسی کے بارے میں کوئی مضمون یا تبصرہ وغیرہ اس لیے نہیں لکھا کہ مجھے خیال ہی نہیں آیا، اگر وہ خود بھی یاد دلا دیتے تو شاید میں یہ کام کسی نہ کسی طرح کر ہی دیتا۔

انھوں نے میری دو کتابوں کی تعریف کی تھی، اگر چہ میری تعریف کرنے کا کسی کو خیال کیوں آئے، اول تو میں قابل توصیف نہیں ہوں، دوم یہ کہ آج کل عام طور سے لوگ اپنے اپنے خالق اور معبودوں کی تعریف میں اس قدر عبادت گزار اور زمزم البدن ہیں (یہ رطب اللسان کے مساوی ترکیب ہے) (دلچسپ بات یہ کہ آج کل کتنے لوگ ہیں آپ کی نظر میں جو 'رطب اللسان' کو صحیح ترکیب کے ساتھ پڑھ سکیں؟) کہ ان کی نظر آسمان سے نیچے آتی ہی نہیں جو کوئی اور نظر آئے۔ اللہ اللہ کیا اولیا پائے جاتے ہیں، حال ہی میں ایک مشاعرے میں ایک نہایت نورانی شکل کے سفید داڑھی، شیروانی پوش، شاعر صاحب کو میرے بعد پڑھنے کی دعوت دی گئی، جو بہت ہی شاذ ہوتا ہے،

ان صاحب کی استاذی کا تذکرہ تھا اور انھوں نے اپنی نعت میں اول تو 'رطب اللسان' قطعاً غلط تلفظ کے ساتھ پڑھا، دوم دو مصرعے بے وزن بھی پڑھ دیے، جو ناظم مشاعرہ (یہ ناظم واللہ میٹرک پاس ہیں اور لندن یونیورسٹی سے جعلی ڈاکٹریٹ کی ڈگری ایک صاحب کے وسیلے سے حاصل کی ہے، ان صاحب کا نام مجھ سے مت پوچھیے، نہیں بتاؤں گا، مجھے اپنی خیریت مرغوب ہے) نے بھی منکشف فرمائی اور مشاعرے کے بعد مجھ سے معذرت کے ساتھ اس غلطی کی نشاندہی کی، بات ساری یہ تھی کہ دیپک بُدکی قابل تعریف افسانہ نگار ہیں۔

(نقشبند قمر نقوی بھوپالی ،ٹلسہ ،امریکا؛ انتساب عالمی ،جنوری تا مارچ ۲۰۱۷ء، ص ۲۳۱-۲۳۲)

☆انتساب عالمی (دیپک بُدکی نمبر - جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء)۔محترم دیپک بُدکی صاحب کی تحریر پر کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ پر دل نہ مانا.....

محترم دیپک بُدکی صاحب کے تین افسانے نظر سے گزرے۔(۱) سوری میڈم (۲) اب میں وہاں نہیں رہتا (۳) ڈاگ ہاؤس۔ بلاشبہ دیپک بُدکی صاحب کی تحریر انسانی زندگی کی اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے جس سے تقریباً اس دور کا ہر انسان ہی گزر رہا ہے۔افسانے آسان، سلیس، اور عام بول چال میں لکھے گئے ہیں۔ زندگی سے اتنے قریب کہ کئی بار آنکھیں نم ہو گئیں جیسے 'سوری میڈم' میں ٹیچر، طالبہ اور اسکول کے سسٹم کے بارے میں پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم کلاس روم میں موجود ہوں اور تمام واقعہ ہمارے سامنے رونما ہوا ہو۔ اسکول کی طالبہ جب تنہا کمرے میں بند ہو جاتی ہے تو اس پر کیا بیتتی ہے یہ کیفیت قاری کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔

اسی طرح 'اب میں وہاں نہیں رہتا'، یہ افسانہ میں نے بھوپال میں اردو اکیڈمی کے ایک پروگرام میں قلم کار کی زبانی سنا۔ نا صرف خود دیپک صاحب پر ایک جذباتی کیفیت طاری تھی بلکہ سبھی قارئین صاحبان کی آنکھیں پرنم تھیں۔اب تک میں اس حقیقت کا درد اپنے اندر محسوس کرتی ہوں۔ایسی ہوتی ہیں دل سے جڑی تحریریں...

ڈاگ ہاؤس بھی حقیقی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ پہلے جانوروں سے جتنی انسیت،

ہمدردی اور درد کا احساس تھا اب وہ انسان اور خونی رشتوں میں بھی باقی نہ رہا۔ بہت خوب دیپک بُدکی صاحب...لاجواب تحریر۔ اللہ اور ترقی دے۔ آمین!

(نفیسہ سلطانہ؛ فیس بک پوسٹ، ۱۹ دسمبر ۲۰۱۶ء)

افسانہ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' (ماہنامہ آج کل، فروری ۲۰۱۶)

☆ دیپک بُدکی صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ 'اب میں وہاں نہیں رہتا' افسانے میں وہ بہت خوبصورت انداز میں قاری کو یادوں کے جزیرے میں لے گئے ہیں۔ ساتھ ہی اس کہانی کے ذریعہ انھوں نے بعض بے حد اہم گوشوں کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ مثلاً ڈاکیہ اب ڈاک نہیں لاتا، لوگوں کے پاس لکھنے پڑھنے کی فرصت ہی نہیں، موبائیل پر دنیا بھر کی باتیں کر لیجیے۔ افسانے کی ایک ایک سطر قابلِ توجہ ہے۔ اس میں گھر سے دوری کا کرب ہی نہیں گزرے زمانے کا نوحہ بھی ہے۔ چار منزلہ لکھوری اینٹوں سے بنا گھر، در و دیوار سے اٹھتی سوندھی سوندھی خوشبو، راشن لانا، گھاسلیٹ کی خاطر قطار سے کھڑا ہونا وغیرہ جب کہ موجودہ دور میں گھر بیٹھے ٹی وی میں دیکھ کر یا موبائیل کے ذریعے آرڈر کر دیجیے سب کچھ گھر بیٹھے حاصل، لیکن دلوں میں وہ چین، آرام اور سکون میسر نہیں۔ بظاہر مسکراتے چہرے اندر سے بے چین و بے قرار رہتے ہیں۔ اس کہانی میں دیپک بُدکی نے قدیم و جدید کا فرق بھی بے حد خوبصورت ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ ایک ایک سطر لائق توجہ ہے۔ اس شمارے کے تعلق سے بہت کچھ کہنے کو ہے لیکن طوالت کے خوف سے اپنی بات یہیں ختم کرتی ہوں۔

(ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ایڈیٹر ماہنامہ بیسویں صدی، نئی دہلی؛ مطبوعہ آج کل اردو، اپریل ۲۰۱۶ء)

افسانہ 'دودھ کا قرض' (ماہنامہ آج کل، جون ۲۰۱۷)

☆ 'آخری پوسٹ مین'، 'دودھ کا قرض'، 'واپسی' عمدہ کہانیاں ہیں۔

(ندرت نواز، پلاموں، جارکھنڈ، آج کل اگست، ۱۷ء)

☆ افسانہ 'دودھ کا قرض' میں دیپک بُدکی جیسے انعام یافتہ بلند پایہ افسانہ نگار نے ہیرو

اقبال کے بچپن میں ایک بار ہی غیر ذات کی رحمتی سے پیئے گئے فقط ایک گلاس بھر دودھ کو اپنے پر قرض سمجھ کر تین لاکھ روپے کی اپنی ذاتی فیس کی بھاری رقم نہیں لیتا ہے۔ فلمی انداز میں تحریر ہونے کے باوصف یہ افسانہ ہمیں اس انسانیت کی پاسداری کا سبق بحسن وخوبی دے جاتا ہے جسے قابل تقلید ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

(ڈاکٹر کرشن بھاؤک، گورونانک نگر، پٹیالہ، آج کل، اگست، ۱۷ء)

☆ دیپک بُدکی کا افسانہ 'دودھ کا قرض' اور مظہر الزماں خاں کا 'آخری پوسٹ مین' متاثر کرتے ہیں۔

(ڈاکٹر رؤف خیر، گولکنڈہ، حیدرآباد، آج کل، اگست، ۱۷ء)

☆ اس شمارہ کی کہانیاں سبھی معیاری ہیں۔ تاہم دیپک بُدکی کا افسانہ 'دودھ کا قرض' سب پر سبقت لے گیا ہے۔ دیپک بُدکی کو بحیثیت افسانہ نگار راقم ایک زمانے سے جانتا ہے۔ افسانے کا عنوان 'دودھ کا قرض' بظاہر ایسا لگتا ہے کہ کہانی کے مرکزی کردار کو اپنی ماں کے دودھ کا قرض ادا کرنا ہے۔ تاہم کہانی کچھ اور ہی بیان کر رہی ہے۔ افسانہ کو دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہوئے افسانہ نگار نے قاری کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ کہانی کے اختتام تک آتے آتے میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو روک سکا۔ دیپک بُدکی مبارکباد کے مستحق ہیں جو اپنی بہترین کہانیوں کے ذریعہ ہمارے اردو افسانوی ادب کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔

(ڈاکٹر عبید اللہ چودھری، بسنت پور، گورکھپور، آج کل، اگست، ۱۷ء)

افسانہ جڑوں کی تلاش (ایوان اردو، جون ۲۰۱۸ء/فیس بک پوسٹ)

جڑوں کی تلاش کے لیے شیتل کا کردار اچھا ہے۔ افسانے میں روایتی بھائی چارے اور پھر بدلتی صورت حال کا منظر نامہ بھی حقیقت پسندانہ ہے۔ ...لیکن ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ انت ناگ کا نام اسلام آباد یا شنکر آچاریہ کا نام کوہ سلیمان وغیرہ کو موجودہ حالات یا ممبئی وغیرہ جیسے متعصّبانہ ایشو سے جوڑنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کیونکہ دیپک صاحب خود بھی جانتے ہیں کہ انت ناگ کو

اسلام آباد یا شنکر آچاریہ کو ہ سلیمانی کہنا تو ان حالات سے بہت پہلے چلے آرہا ہے۔ یہ ایک طرح سے کشمیر کی تہذیبی وحدانیت یا بھائی چارگی کی علامت ہے کہ نہ تو انت ناگ کہنے پر مسلمانوں کو کوئی اعتراض محسوس ہوتا تھا اور نہ ہی اسلام آباد کہنے پر ہندو ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ یا شنکر آچاریہ کو کوہ سلیمانی وغیرہ معاملات میں بھی کوئی خاص متعصّبانہ رویہ نہیں اپنایا جاتا تھا یا ہے۔ کیونکہ ہم آج بھی انت ناگ کو انت ناگ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہے ہیں....بہر حال مجموعی طور پر افسانے میں پوشیدہ ہجرت کا کرب بڑی دردمندی سے پیش ہوا ہے۔ مبارک باد

(ڈاکٹر ریاض توحیدی، سرینگر کشمیر: فیس بک پر ردعمل)

[جواب]: توحیدی صاحب، شکریہ کہ آپ نے افسانہ پڑھ لیا اور اپنے تاثرات قلم بند کر لیے۔ مقامات کا نام رکھنا یا تبدیل کرنا آج کی بات نہیں بلکہ صدیوں سے چلا آرہا ہے اور صرف کشمیر تک محدود نہیں ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق حکمرانوں نے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ ہسپانیہ میں جب رومی، بازنطینی، وژگاتھ، مسلم اور عیسائی مسلط ہوئے تو کئی جگہوں کے نام بدلتے رہے۔ میں پاکستان کی ایک رائٹر لالی چودھری کے سفرنامے کے دو اقتباسات پیش کرتا ہوں: (۱) میں نے اس واقعہ پر آہ وزاری نہیں کی۔ اس لیے کہ تاریخ ہمیشہ فاتحین لکھتے ہیں۔ مسلمانوں نے قرطبہ فتح کیا تو گرجا خرید کر وہاں مسجد تعمیر کی۔ عیسائیوں نے قرطبہ پر قبضہ کیا تو مسجد کے اندر گرجا بنایا۔'' (۲) کبھی ابن رشد کی ادھ جلی کتابوں کے ڈھیر پر قرطبہ کی مسلم آبادی نے خوشی کے نعرے لگائے کبھی لائبریریوں کی لاکھوں کتابوں کے الاؤ پر عیسائی حکومت نے رقص کیا۔'' کشمیر کی تاریخ میں ملواں تہذیب کے دور اکثر نظر آتے رہے مگر کئی ایسے دور بھی آئے ہیں جب اس تہذیب کی دھجیاں اڑائی گئیں، ہم دونوں سے اپنی آنکھیں پھیر نہیں سکتے۔ صدیوں سے کشمیر، سرینگر اور بارہ مولہ نام چلا آرہا ہے اب کاشر، ورمول، شہر خاص کہلاتے ہیں، وجہ صرف یہ ہے کہ 'ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت'۔

[جواب]: شکریہ..دیپک صاحب...تاریخی حوالے سے تو صحیح ہیں کیونکہ اکثر غالب اپنا

غلبہ برقرار رکھنے کے لیے نہ صرف سیاسی بلکہ تہذیبی، ثقافتی وغیرہ برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔تاہم راقم کو افسانے میں یا متن جس طرح اس موضوع کو ڈسکورس بنا رہا ہے، جو کچھ نظر آ رہا ہے بلا کسی لپٹی کے لکھ دیا کیونکہ بہر حال ہم دونوں کشمیری ہیں اور دونوں کو یہاں کی زمینی صورتحال پر نظر بھی ہے۔ مسکراہٹ!...اور کبھی کبھار تو فیس بک پر آپ کے افسانے پڑھتا رہتا ہوں.... بڑا لطف آتا ہے۔

[جواب]: میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔سلامت رہیں۔

افسانہ جڑوں کی تلاش : (ایوان اردو؛ جون ۲۰۱۸ء)

اس شمارے (ایوانِ اردو؛ جون ۲۰۱۸ء) میں دیپک بُدکی کے افسانے 'جڑوں کی تلاش' میں فی زمانہ مادی حالات کے ساتھ مفاہمت کرتے رہنے کا عوام کو جو قابل تقلید سبق دیا گیا ہے اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔مستزاد، اس افسانہ میں کشمیر کی وادی کی از حد قابل داد و دید منظر کشی دوم جمع نقطہ (پلس پوائنٹ) تسلیم کیا جائے گا۔ص ۳۷ پر اردو ادب میں غلط، لیکن مروجہ ہو چکے لفظ 'تعینات' کا تصرف ایک تشریح کا متقاضی ضرور ہے۔قومی کونسل نئی دہلی سے شائع اردو زبان کی جناب بدر الحسن کی مؤقر کتاب میں درج کیا گیا ہے کہ 'تعینات' غلط لفظ ہے، صحیح لفظ 'متعین' ہے، یعنی 'مقرر'[چوتھی طباعت، سنہ ۲۰۱۰ء، نمبر ۱۴۲]۔

(کرشن بھاؤک، پٹیالہ، پنجاب؛ ایوانِ اردو؛ جولائی ۲۰۱۸ء)

افسانہ جڑوں کی تلاش: (ماہانہ صبح بہاراں، دولتالہ، راولپنڈی، پاکستان، اگست ۲۰۱۸ء)

: بہت خوبصورت کہانی ہے۔عمدہ پلاٹ اور دلکش منظر نگاری، زبان سادہ، فنی چابکدستی، غرض ہر پہلو سے کامیاب ہے۔ درد منت کشِ دوا نہ ہوا؛ میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا۔

(خالد حسین، افسانہ نگار، جموں؛ فیس بک پوسٹ پر تاثرات، ۱۸/اگست ۲۰۱۸ء)

افسانہ جڑوں کی تلاش : (ماہانہ صبح بہاراں، دولتالہ، راولپنڈی، پاکستان، اگست ۲۰۱۸ء)

آپ کا یہ افسانہ اور اس کے کردار جس کرب سے گزر رہے ہیں وہ پڑھنے والوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں!!! اس افسانے کے کچھ پیراگراف سب کانٹینٹ (برصغیر) کے باشندوں کی زندگیوں کا ایک جزو بنا دئے گئے ہیں اور ہم ان سے نکلنا بھی چاہیں تو نہیں نکل پاتے ، دونوں طرف نفرت کی سیاست کے بدنما رنگ لوگوں کی زندگیوں پر مسلط کر دیے گئے ہیں۔

(راجہ عاطف حیات گوتم، پاکستان؛ فیس بک پوسٹ پر تاثرات؛ ۱۹ اگست ۲۰۱۸ء)

افسانہ جڑوں کی تلاش: فیس بک کمنٹ:

دیپک بھائی، آپ کی تازہ ترین کہانی 'جڑوں کی تلاش' پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ کہانی محض ایک افسانہ نہیں بلکہ ان گنت کشمیریوں کی روداد ہے، چاہے وہ شیتل ہو یا عبدل رشید باندے! 'آپ کے افسانوی مجموعہ' اب میں وہاں نہیں رہتا' کے تبصرے میں میں نے لکھا تھا کہ تواریخ تو بس لکھی جاتی ہے مگر ایک بے باک افسانہ نگار وقت کے ہر گزرتے لمحے کو بغیر کسی خوف یا نقاب کے نہایت ایمانداری سے کاغذ پر اتار دیتا ہے۔ آج کل جب 'کشمیریت' کے معنی بدلتے رہتے ہیں ایک بار پھر آپ نے اس کہانی کے حوالے سے ایک صاف گو افسانہ نگار کا فرض بخوبی انجام دیا ہے۔ میری طرف سے بہت بہت مبارک۔

(ڈاکٹر اشوک پٹواری، فیس بک کمنٹ، ۱۷ جولائی، ۲۰۱۹)

افسانہ جڑوں کی تلاش: انگریزی میں فیس بک کمنٹ: (ترجمہ بقلم دیپک بُدکی)

میری آنکھوں میں آپ کی کہانی 'جڑوں کی تلاش' پڑھنے کے بعد آنسوؤں کا ایک طوفان سا آ گیا۔ آپ نے قدیم اور پوروجوں کی زمین سے ہماری بد بخت ہجرت کا ایک واضح نقشہ کھینچ لیا ہے۔ وادی سے ہماری ہجرت کے بارے میں لکھی گئی بہت ساری کہانیوں میں سے یہ ایک ایسی نادر کہانی ہے جو سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے اور جس کے پیش کرنے کے انداز اور بیانیہ میں اپنا ایک انفراد ہے۔ یہ مختصر تحریر ان جذبات کی ترجمانی کرتی ہے جو ہمیں اپنے آبائی وطن سے جوڑتی

ہیں جہاں ہم نے جنم لیا، پلے بڑھے، لڑکپن جیے اور جہاں ہم نے اپنے سکون آمیز اور صحت افزا ماحول میں رومان بھرے دن گزارے۔ یہ وہی پاک سرزمین ہے جہاں ہم نے تعلیم پائی، روزی روٹی کمائی، اور جہاں ہمارے ازدواجی شادیانے پایۂ تکمیل کو پہنچے۔لیکن بدقسمتی سے اب وہ لمحے ہماری الجھی ہوئی تاریخ کے اوراق کا ایک حصہ بن کر رہ گئے ہیں اور موجودہ دور میں ہم انھی ناسٹلجیائی یادداشتوں کے سبب زندہ سانسیں لے رہے ہیں۔واقعی آپ کی صاف و شفاف اور رواں بے لاگ بیانیہ نے مجھے قائل کر دیا ہے، آپ نے تاریخی سچائیوں کو جس ترتیب سے پیش کیا ہے مجھے ایسا لگا کہ میں بھی ان کا چشم دید گواہ ہوں۔

(کلدیپ کمار بٹ، جموں)

افسانہ جڑوں کی تلاش:فیس بک کمنٹ:

جڑوں کی تلاش کے لیے شیتل کا کردار اچھا ہے۔افسانے میں روایتی بھائی چارے اور پھر بدلتی صورتحال کا منظر نامہ بھی حقیقت پسندانہ ہے....لیکن ایک بات سمجھ نہیں آئی کہ اننت ناگ کا نام اسلام آباد یا شنکر آچاریہ کا نام کوہ سلیمان وغیرہ کو موجودہ حالات یا ممبئ وغیرہ جیسے متعصّبانہ ایشو سے جوڑنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کیونکہ دیپک صاحب خود بھی جانتے ہیں کہ اننت ناگ کو اسلام آباد یا شنکر آچاریہ کو کوہ سلیمانی کہنا تو ان حالات سے پہلے چلا آرہا ہے۔ یہ ایک طرح سے کشمیر کی تہذیبی وحدانیت یا بھائی چارے کی علامت ہے کہ نہ تو اننت ناگ کہنے پر مسلمانوں کو کبھی اعتراض محسوس ہوتا ہے اور نہ ہی اسلام آباد کہنے پر ہندو ناراضگی کا اظہار کرتے تھے یا شنکر آچاریہ کو کوہ سلیمانی وغیرہ معاملات میں بھی کوئی خاص متعصّبانہ رویہ نہیں اپنایا جاتا تھا یا ہے۔ کیونکہ ہم آج بھی اننت ناگ کو اننت ناگ اور شنکر آچاریہ کا شنکر آچاریہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہے ہیں۔....بہر حال مجموئی طور پر افسانے میں پوشیدہ ہجرت کا کرب بڑی دردمندی سے پیش ہوا ہے۔ مبارک باد!

(ڈاکٹر ریاض احمد توحیدی، ہندوارہ کشمیر)

افسانہ کینی بال : (آج کل اگست ۲۰۱۸ء)

آج کل میں آپ کی کہانی پڑھی۔اچھی کہانی ہے۔الگ پہلو پر...کینی بال کے معنی اچھے سے سمجھ آ گئے۔ بہت دنوں بعد آپ کی مختلف کہانی پڑھی۔پچھلی کئی کہانیوں میں ماضی کا اور جائے پیدائش کی کشش جابجا نظر آتی تھی۔ بہت بہت مبارک۔

(ڈاکٹر رینو بہل،افسانہ نگار، چنڈی گڑھ: وہاٹس اپ پر تاثرات بتاریخ ۲۹ جولائی ۲۰۱۸ء)

افسانہ تہذیب کا تسلط : (دوماہی صبح بہاراں پاکستان، جولائی ۲۰۱۸ء ص ۳۱-۳۰)

دیپک بُدکی کے افسانے'تہذیب کا تسلط' میں ردِ نوآبادیاتی انداز فکر پوری فن کاری اور تب و تاب کے ساتھ آشکار ہے،افسانے کا اختتام ترفع سے ہم کنار ہو کر زندگی کی مثبت اقدار کا ترجمان بن گیا ہے۔

(عطاالرحمان قاضی، عارف والا؛ جلد ۵،شمارہ ۷ برائے اگست ۲۰۱۸ء میں تاثرات ص ۲۷)

افسانوں کا مجموعہ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی :

آپ بہت اچھے افسانے لکھتے ہیں۔افسانے کا پلاٹ سوچنے،اس کی ترتیب دینے،اور کتاب کے پرنٹ ہونے تک کتنا وقت لگتا ہے،اس کا میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔ یہ کتاب لاکھوں روپیوں میں بھی سستی ہے۔عمدہ کاغذ لاجواب پرنٹنگ۔یہ کتاب میرے لیے بیش قیمت خزانہ ہے۔ کیا ملتا ہے آپ کو رات رات بھر جاگ کر اور کہانیاں لکھ کر؟ ہم سے پوچھیے آپ کے افسانے پڑھ کے ہمیں جینے کا سہارا،لمبی عمراں اور انٹرٹینمنٹ ملتا ہے۔آپ سمجھ گئے نا؟

ابھی ابھی افسانہ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی پڑھا۔افسانہ دل کو چھو گیا۔یہ کہانی میں نے دوسری بار بھی پڑھی۔ بہت لاجواب اور بے مثال لگی۔اس میں ٹریجڈی بھی ہے....کیا ہے یہ دنیا .....اور کیا ہیں اس کے لوگ.....! آپ نے کتاب کا نام بھی صحیح رکھا ہے۔

گھونسلا پڑھا،جسم میں تازگی اور پھرتی آ گئی۔خود کو تندرست محسوس کر رہا ہوں۔آپ کا

انداز بیان لا جواب ہے۔ بیسٹ آف لک! اس وقت پہاڑوں کا رومانس پڑھ رہا ہوں۔ آپ نے فلم جب جب پھول کھلے کا ذکر کیا ہے۔ اس فلم کی کاسٹ میں ایک کامیڈین بی بی بھلا ہیں۔ میں اور بی بی بھلا ۵۷-۱۹۵۶ء میں آئی ٹی آئی پوسا میں ساتھ ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ہم ڈرافٹس مین کے کورس میں تھے۔.... کہانی 'پہاڑوں کا رومانس' پوری پڑھی۔ ایسا لگا میں بھی کشمیر کی سیر کر رہا ہوں اور ہاوس بوٹ و محل میں پھر رہا ہوں۔ آپ نے کشمیر کی خوبصورتی کو کتنے عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ میں نے ابھی کشمیر نہیں دیکھا ہے۔

آپ کا افسانہ 'دو گز زمین' پڑھا، رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ افسانہ سب سے الگ، سب سے مختلف...! کیا ہے یہ دنیا...؟ نرناری، پیار محبت، اور کہیں اتنی نفرت...! یہ افسانہ ایک بار نہیں بار بار پڑھنے والا ہے۔ افسانہ 'سرحدیں' بھی عام افسانوں سے ہٹ کر ہے اور بے مثال بھی۔ آپ کا لکھا افسانہ 'ایک دو تین' بھی بے مثال اور قابل تعریف ہے۔...... دیپک جی، آپ کا لکھا افسانہ 'آواز کا جادو' پڑھ رہا ہوں اور بار بار یہ کہنے سے نہیں رہ سکتا، سوچا آپ کو شیئر کرلوں۔ آپ کا یہ افسانہ چھوٹا بھی ہے اور مکمل بھی۔ آپ پریتی سے ملے ہیں، میں آپ سے ملنا چاہوں گا، مجھے لگے گا میں بھی پریتی سے مل گیا۔ 'تخلیق کا کرب' کہانی بھی دل کو چھوگئی۔

ابھی ابھی آپ کی کتاب کھول کر بیٹھا ہوں اور افسانے 'اداس لمحوں کا کرب اور گاڑی کا انتظار پڑھ رہا ہوں۔....'' افسانہ گاڑی کا انتظار' اچھا افسانہ ہے۔ آپ نے اچھی کامیڈی پیش کی ہے۔ آپ کے الفاظ جوڑنے کا جواب نہیں۔ افسانے میں 'میری بھارتیہ ریل' کے بارے میں آپ نے خوب لکھا ہے۔ ہوائی جہاز کا سفر تو اب کافی سیف ہوگیا ہے۔ میں ۲۰۰۱ء سے یو ایس اے چار بار ہو کر آگیا ہوں۔ مجھے ایئر انڈیا فلائٹ اچھی لگتی ہے۔

دیپک جی ابھی ابھی آپ کی کہانی 'ادھوری کہانی' پڑھی۔ دل کو چھوگئی اور روح کو تازگی ملی۔ کہانی بہت لا جواب، بے مثال اور شاندار ہے۔ مجھے مزہ آگیا۔ یہ کہانی آپ کی بہترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔

آپ کے افسانے پڑھ کے میں صحتیاب ہو جاتا ہوں۔ میری آج کی ڈاکٹر سے اپائنٹ منٹ کینسل! آپ کے افسانہ کلینک کے ہم مریض بھی اور مرید بھی!

(راجندر ریٔر؛ تاثرات؛ مسینجر، فیس بک)

افسانوں کا مجموعہ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی :

کل کی ڈاک سے جناب دیپک بُدکی کا افسانوی مجموعہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' موصول ہوا۔ کل شام کو ہی اس میں شامل دو افسانے، گھونسلا اور زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی پڑھ گیا۔

ہجرت، نقل مکانی اور دربدری ان کے افسانوں میں کئی طرح سے موضوع بنتی ہیں اور قاری کو ان کی فن کاری سے زیادہ ان کے راست بیانیے میں ایک خاص قسم کی جاذبیت محسوس ہوتی ہے۔ دیپک بُدکی صاحب اسے کتاب کی رسید سمجھیں، تفصیلی گفتگو بقیہ افسانے پڑھنے کے بعد۔ آپ نے یاد رکھا اور زحمت کی اس لیے بہت شکریہ۔

(عبدالسمیع؛ تاثرات، فیس بک پوسٹ)

افسانوں کا مجموعہ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی :

معروف افسانہ نگار جناب دیپک بُدکی صاحب کا تحفہ بصورت زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ جموں و کشمیر کے معاصر اردو افسانہ نگاروں میں بُدکی صاحب اپنے منفرد انداز بیان کی بدولت مخصوص مقام پر فائز ہیں۔ ان کے افسانے اور مضامین موقر رسائل و جرائد اور سوشل سائٹس پر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کے درجہ ذیل مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب اور اب میں وہاں نہیں رہتا۔ کتاب سے نوازنے کا شکریہ۔۔۔۔ مسکراہٹ۔

(ڈاکٹر ریاض توحیدی؛ تاثرات، فیس بک پوسٹ)

افسانوں کا مجموعہ زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی تقریظ۔۔ڈاکٹر

منصور خوشتر، ایڈیٹر دربھنگہ ٹائمز (قومی تنظیم پٹنہ جلد ۵۸، شمارہ ۶؛ مورخہ ۶ر جنوری ۲۰۱۹ء)

دیپک بُدکی سے میری شناسائی اس وقت کی ہے جب وہ چیف پوسٹ ماسٹر (جنرل) کشمیر ہوا کرتے تھے۔ ان کے افسانے اس وقت بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا اور ان کا ایک افسانہ 'گاڑی کا انتظار' دربھنگہ ٹائمز، اگست ۲۰۰۸ء مین شائع کیا تھا۔ ان کے افسانوی مجموعہ 'چنار کے پنجے'، 'ادھورے چہرے کے ساتھ' دیگر کتابوں پر تبصرے دربھنگہ ٹائمز سے خصوصی طور پر شائع کیے تھے۔ ابھی جب میں بیرون ممالک کے سفر سے دربھنگہ واپس آیا تو میرے ٹیبل پر دیپک بُدکی کا افسانوی مجموعہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' (دوسرا ایڈیشن) ملا۔ انتہائی خوشی ہوئی کہ موصوف کا افسانوی مجموعہ دوبارہ شائع ہو کر باذوق قارئین کی تشنگی کو بجھانے میں لگا ہے۔ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سے قبل ان کی دس کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب، مٹھی بھر ریت، اب میں وہاں نہیں رہتا، عصری تحریریں، عصری شعور، عصری تقاضے، اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار اہم ہیں۔ دیپک بُدکی کی شخصیت پر لکھی گئی کتابوں میں دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری (جاوید اقبال شاہ) اور ورق ورق آئینہ: دیپک بُدکی شخصیت اور فن ہیں۔

دیپک بُدکی کا اصل نام دیپک کمار بُدکی ہے۔ ان کی پیدائش ۱۵ر فروری ۱۹۵۰ء کو سرینگر، جموں و کشمیر میں ہوئی۔ بوٹنی سے ایم ایس سی کیا۔ ساتھ میں بی ایڈ، ایسوسی ایٹ، انشورنس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا اور این ڈی سی کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۷۰ء میں ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ تقریباً ۱۳۰ر افسانے، ۱۱۰ر افسانچے، ۲۶۰ر تبصرے اور ۶۰ر تنقیدی و تحقیقی مضامین قلم بند کیے۔ کئی افسانے ہندی، تیلگو، مراٹھی، کشمیری، پہاڑی اور انگریزی میں ترجمہ کیے گئے۔ شاعر ممبئی (۲۰۰۴ء) اور اسباق پونے (۲۰۰۷ء) نے ان پر خصوصی گوشے شائع کیے۔ پیش نظر مجموعہ 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' میں ۲۳ر افسانے ہیں۔ کچھ افسانے سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہیں، کچھ سیاسی ماحول کو اجاگر کرتے ہیں، کسی میں طنز و ظرافت کا رنگ نمایاں ہے اور کچھ افسانوں مین نفسیاتی

پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ایک معروف ادیبہ سلطانہ مہر دیپک بُدکی کے متعلق فرماتی ہیں:

''دیپک بُدکی ایک افسانہ نگار ہیں جو نہ ہندو ہے، نہ مسلمان اور نہ عیسائی۔اس کا دل ایک مظلوم کے دکھ سے تڑپتا ہے۔انسانیت پر ظلم، بربریت دیکھ کر اس کی آنکھیں خون بھرے آنسوؤں سے لبریز ہوتی ہیں۔(پیش لفظ،دوسرا ایڈیشن،ص ۱۳)

دیپک بُدکی کے اس مجموعے میں موجود تمام افسانے قارئین کو متاثر کرتے ہیں۔ہر افسانہ قارئین کو ایک پیغام دیتا ہے۔دیپک بُدکی کو اس افسانوں کے مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد۔ (منصور خوشتر:ایڈیٹر)

☆☆☆

کے مستحق ہیں۔

مجیر احمد آزاد: (ایس ایم ایس) آپ کی کہانی 'اب میں وہاں نہیں رہتا' آجکل دہلی کے فروری شمارے میں پڑھی۔ پسند آئی۔ایک درد کی لہر سی دوڑ گئی ذہن و دل میں۔آپ نے حقیقت کو افسانے کا رنگ دیا ہے۔ یہ رنگ ذہن پر دیر تک چڑھا رہے گا۔مبارک ہو۔ایک عمدہ تخلیق۔

مجموعہ مٹھی بھر ریت (افسانچوں کا مجموعہ)

افسانچہ - مستقبل :

سہیل احمد صدیقی: [۱۲/اگست ۲۰۱۴ء]: آپ بجا کہتے ہیں۔مغرب سے مستعار اس نثری صنف کے فروغ کے لیے کافی تکنیکی محنت درکار ہے۔

صباحت (پاک ۷۸۷ پاک): [۱۲/اگست ۲۰۱۴ء] دیپک صاحب میں نہیں سمجھتا کہ پاکستان میں 'افسانچہ' کا مستقبل روشن ہے۔قاری کی عدم دلچسپی یا پھر شاید رائٹر کی بے توجہی کی بدولت افسانچہ خود پر سے لطیفہ گوئی کی تہمت نہ اتار سکا۔اور میرے خیال میں تو دیپک صاحب نثری نظم کا پاکستان میں ارتقا افسانچہ کی صنف کو لے ڈوبے گا۔

سچ کی تلاش :

اقبال حسن آزاد: [۱۸ اکتوبر ۲۰۱۱] آج میں نے آپ کی کئی منی کہانیاں پڑھیں، ہر کہانی کا الگ موضوع، ہر کہانی کا الگ لطف، واہ!

ظہیر جاوید: [۳۰ نومبر ۲۰۱۰] زندگی جھوٹ کا سمندر ہے...اس میں سچ تلاش کرنے والوں کے ہاتھ صرف تضاد ہی آ سکتا ہے۔سچ ابدیت اور عبودیت میں ملے گا.... پتہ نہیں آپ کے پاس کون سا صحیفہ ہے.....خوش رہیں۔

سبودھ لال: [۳۰ نومبر ۲۰۱۰] اپنا ایک پرانا شعر لکھ رہا ہوں:

جب سزا مجھ کو سنائی گئی سچائی کی　　　سننے والوں میں ماتم نہ اچنبھا دیکھا

پرویز بلگرامی: [۳۰ نومبر ۲۰۱۰] واہ جناب.....صحیفۂ زندگی کا ایسا آئینہ...چہرہ شناسی کا دعویٰ کرنے والے بھی کبھی کبھی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

عزیز نبیل: [یکم دسمبر ۲۰۱۰] بہر حال آپ کی یہ تین سطریں .... بحث و مباحثہ کا طویل سلسلہ برپا کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ معمولی نہیں ہیں۔

فرحت پروین: [۲ دسمبر ۲۰۱۰] ہاں ایسا ہی ہے۔ میرا سچ آپ کے لیے جھوٹ اور آپ کا سچ میرے لیے۔ جب کہ دونوں کے سچ سچے ہیں۔ سچ وہی ہے جسے دل مانے، جو آپ کے اندر سے اٹھے۔ اپنے سچ کو مانو اور مست رہو، دوسروں کے سچ سے تقابل نہ کرو۔ ہے نا؟

ایم اے حق: [۳۱ دسمبر ۲۰۱۰] مختصر میں بہت بڑی بات، دل خوش ہو گیا۔

اختر صاحب: [۸ جنوری ۲۰۱۰] جناب، دونوں ایک ہی خدا کے لیے لڑ رہے ہیں حالانکہ دونوں بے خبر ہیں۔ یہ رویہ لوگوں کے ذہنوں میں بچپن سے ہی ڈالا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی کو سچائی کے بارے میں علم نہیں ہے اور کوئی منطق کو سننا ہی نہیں چاہتا ہے اور لطف تو اس بات کا ہے کہ کوئی صحیفہ میں لکھی گئی باتوں پر عمل نہیں کرتا۔ ..... سچائی کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہے اور سچائی نہ کڑوی ہوتی ہے اور نہ میٹھی، بس سچائی ہوتی ہے اگر وہ ہو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے اگر ہو تو۔

نیکی :

عالم خورشید: [۱۸ جون ۲۰۱۳ء] بہت کم الفاظ میں آپ نے ایک بڑا منظر نامہ خوبصورتی سے سمیٹ لیا ہے جناب! بہت ہی خوب ہے!

ممنوع راستہ :

گرنام سنگھ شیر گل: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] بڑا ٹیڑھا سوال کر دیا آپ نے۔ میں ہوتا تو وہی کرتا جو آپ کر رہے ہیں۔ کوئی کام جو نیک نیتی سے کیا جاتا ہے وہ غلط نہیں ہوتا۔ آپ کا کام جائز ہے جب تک آپ کو انتظامیہ جسمانی طور پر روک نہ لے۔

مبصر لطیفی: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ جس کام سے اسے منع کیا جائے، وہ ضرور کرتا ہے۔ 'جرم آدم نے کیا اور سزا بیٹوں کو...!'

صلاح الدین حیدر: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] ہماری بے حسی کا یہ عالم ہمیشہ سے ہی رہا ہے۔ ہم بادشاہ لوگ ہیں، جو جی میں آئے کریں گے، کون پوچھتا ہے۔

رمیش مہتا: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] انسان آسان راستوں کا ہمیشہ سے عاشق رہا ہے حضور۔ تختی ہو یا نہ ہو!

نصیر احمد ناصر: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] شارٹ کٹس (چھوٹے راستوں) کی عادت اور ممنوعہ راستوں پر چلنے کی نفسیات اجتماعی ہے۔

مدیر، سہ ماہی عطا: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] لفظ 'شارع عام' کا ہمیشہ غلط مطلب نکالا جاتا ہے۔ اگر سڑک کا دوسرا سرا کھلا ہے، موقع مل جائے اور کوئی شناختی کارروائی نہ ہو، پھر یہ شارع خاص نہیں رہ جاتی ہے۔ یہ قانونی طور پر تب ممکن ہے جب دوسرا سرا بند ہو۔

عالم خورشید: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] آپ نے بے حد کم لفظوں میں حالات کی بہت سچی فوٹوگرافی فن کاری کے ساتھ پیش کی ہے۔ بہت خوب!

محمد صادق: [۱۴ نومبر ۲۰۱۰ء] افسانے کے کردار کی بے بسی اور فیکٹری والوں کی بے حسی۔ دونوں ہی نے قانونی کارروائی کیے جانے والے بورڈ کا نہیں بلکہ قانون کا لحاظ نہیں رکھا۔ اور قانون کی اہمیت اور اس کے احترام کو بالائے طاق رکھ کر اپنی تن آسانی کا ثبوت پیش کیا ہے اور اس طرح اخلاقی مجرمین کی صف میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ ملک میں رہنے والا ہر شخص اس طرح کے انداز اختیار کرتا رہے گا تو بہت جلد اس کا معاشرہ انتشار کا شکار ہو کر بدامنی اور لاقانونیت کا ہم مزاج ہو جائے گا۔ اور تہذیب و شائستگی کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ ہر وہ شخص جو قانون اور انصاف کا دامن چھوڑ دیتا ہے وہ سب سے بڑا ظالم ہوتا ہے جو نہ صرف غیر محسوس طریقے سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی چلاتا رہتا ہے بلکہ اوروں کی زندگیوں کو بھی تباہ و تاراج کر دیتا ہے۔ بہت ہی سادہ اور مختصر انداز میں لکھا گیا یہ افسانہ ایک تاریخی حقیقت کا انکشاف اور اکتشاف کرتا ہے۔

فرحت پروین: [۱۵ نومبر ۲۰۱۰ء] وہ نوٹس بورڈ آج تک وہیں لٹکا سوچ رہا ہے کہ 'خلاف ورزی کرنے والا قانون کو للکار رہا کہ دیکھو تم سچ مچ ہی اندھے ہو، مجھے روز گزرتا دیکھ کر کوئی کارروائی نہیں کرتے۔ اب کوئی خلاف ورزی کرنے والے سے پوچھے کہ اچھے شہری کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں جو بغیر پکڑے دھکڑے جانے کے، دھمکی یا خوف کے از خود پورے کرنے چاہئیں۔ اسے کوئی احساس جرم

نہیں ہے۔ شکایت ہے تو قانون سے جو نوٹس نہیں لیتا۔ میرے خیال میں تو دونوں اندھے ہیں۔ میرا ہونا نہ ہونا دونوں کے لیے ہی برابر ہے۔ ایک بات تو بتایئے ،قصوروار کون ہے، قانونی کارروائی نہ کرنے والے یا خلاف ورزی کرنے والے؟.........نوٹس بورڈ اور انتظامیہ پر طنز تو ٹھیک ہے مگر شہری کو سِوِک سینس (شہریت کا شعور) ہونی بھی تو ضروری ہے۔ کیا اس کا کوئی فرض نہیں۔ سوچیے !!

ایم اے حق : (۱۵ دسمبر ۲۰۱۰ء) نوٹس آج تک لٹک رہا ہے کا مطلب صاف ہے کہ نوٹس لٹکانے والے کو وِل پاور (قوت ارادی) کی کمی ہے کہ کوئی اس حکم کو نہیں توڑے۔ دیپک جی آپ نے یہاں موجودہ بھارت کی پوری تصویر ہی رکھ دی ہے۔

پہلا کلون :

احمد سہیل: [۲۵ دسمبر ۲۰۱۰ء] زبردست ۔ چار لائنیں اور بہت بڑی اساطیری حقیقت ۔ بدکی صاحب یہ بہت ہی غیر معمولی افسانچہ ہے۔

خورشید حیات: [۲۵ دسمبر ۲۰۱۰ء] لفظ دو مفہوم وسیع ،تخلیقی فن کاری میں سمائے جائے ہے، انسانی وجود کا پورا نظام۔

ایم اے حق: [۳۱ دسمبر ۲۰۱۰ء] دیپک جی اس جانب تو ہمارا کبھی دھیان ہی نہیں گیا ہے۔ واقعی آپ کے جھٹکے سے تو میں ہل ہی گیا۔

سوال :

عالم خورشید: [۳۰ ستمبر ۲۰۱۰ء] کیا خوب چبھتا ہوا سوال ہے۔ بہت خوب جناب۔ آپ نے نثر میں شاعری کے اوصاف پیدا کردیے ہیں۔ بہت خوب۔

وجے بدکی: [۳۰ ستمبر ۲۰۱۰ء]. اسی سوال کے جواب کا مجھے بیس سال بعد بھی انتظار ہے۔ اس مختصر کہانی میں آپ کی فنکارانہ جدت طرازی عیاں ہے۔

پاگل ہوا نے اٹھا کے سمندر کی گود سے   صحرا کی گرم ریت میں دفنا دیا مجھے

زاہد مختار: [یکم اکتوبر ۲۰۱۰ء] کہانی میں یوں تو ایک ہی درد بھرا سوال ہے لیکن کوزے میں سمندر سمندر سوال ہیں۔ لمحوں کی خطا...صدیوں کی سزا.... مختصر یہ کہانی خود بولتی ہے۔ اور ہم سکتے کے عالم میں۔

ایم ایل تاثیر بلوان: [۱۲ اکتوبر ۲۰۱۰ء] کبھی کبھی اور کہیں کہیں اقلیت میں ہونا ہی بذات خود ایک گناہ ہے۔

مبصر لطیفی: [سوال/۱۲ اکتوبر ۲۰۱۰ء] فرق بس اتنا کہ آدم خود سے نکلے مگر وہ جنت جنت ہی رہا لیکن ناتھ جی اوران کے اہل خانہ کے نکلنے کے بعد وہ جنت جہنم بن گئی۔

ایم اے حق: [سوال/ ۸ جنوری ۲۰۱۱ء] یہ کہانی اس بے انتہا درد کو منعکس کرتی ہے جو کشمیر کے مائیگرنٹس (مہاجروں) کو سہنا پڑ رہا ہے۔

اجے کمار: [یکم مئی ۲۰۱۱ء] سوال کا جواب شاید اس شعر میں مل جائے:-

ے تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہر جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

مزدور رکشا:

مدیر، ویکلی احتساب: [۱۴ ستمبر ۲۰۱۰ء] یہی ہے جس کو poe tic justice (شاعرانہ انصاف) کہتے ہیں۔ بے شک بہت ہی عمدہ ادب پارہ ہے، جناب! (انگریزی سے ترجمہ)

اندرا پونا والا (اندو شبنم): [۱۴ اکتوبر ۲۰۱۰ء] مزدور رکشا میں سوار ہونے سے پہلے زیادہ تر یہی کشمکش اٹھتی ہے۔لیکن آپ نے اس کشمکش کو منی کہانی میں ڈھال کر کمال کر دیا۔واہ تعریف کے قابل کہانی.

عالم خورشید: [۳۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء] بہت خوب ہے۔کیا بات ہے.....واہ.....میرے اس خیال کو ان منی کہانیوں سے اور تقویت حاصل ہوئی کہ آپ اپنی نثر سے شاعری کا کام لے رہے ہیں۔یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

ایم اے حق: [۷ جنوری ۱۱ء] بہت ہی بہترین کہانی ہے۔میرے خیال میں 'میں واپس.....پھر رکشے پر بیٹھ گیا' بس کہانی یہیں پر ختم ہوتی ہے۔

خورشید حیات: [۷ جنوری ۱۱ء] 'مزدور رکشا' کہانی جہاں پر ختم ہوتی ہے، وہاں سے ایک نئی، کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی شروع ہو جاتی ہے.....میرے دروں میں داخل ہو گیا کوئی۔

چمتکار:

پرویز بلگرامی: [۱۸ نومبر ۲۰۱۰ء] واہ مزہ دیر پا ہے۔بہت لطف آیا۔چار سطر میں اتنی عمدہ کہانی۔

واہ جناب...خدا آپ کی عمر دراز کرے۔اسی طرح خزانہ ادب میں اضافہ کرتے رہیے۔

پروین طاہر:[۱۸نومبر۲۰۱۰ء] یہ بھی بھگوان کی مایا ہے کہ دیپک اتنے مختصر الفاظ میں اپنی اور بھگوان کی بات بیان کر جاتا ہے۔

محمد حامد سراج:[۱۸نومبر۲۰۱۰ء] آپ افسانہ نگار ہونا،آپ کو بات کہنے کا فن آتا ہے خوب۔

مٹھی بھر ریت :

قمر سبزواری:[۶ دسمبر۲۰۱۱ء] پہلے بھی نظر سے گزرے ہیں آپ کے یہ افسانچے (مٹھی بھر ریت،سوال)۔ پہلا افسانچہ تو بہت ہی عمدہ ہے۔آپ کے انداز اور اسلوب کا نمائندہ ہے اور گہری چوٹ لگاتا ہے۔دوسرے میں تھوڑی احتیاط پسندی لگی مجھے۔مطلب تفہیم میں کچھ تشنگی سی چھوٹ گئی شاید،وادی کے حالات تو اس سے زیادہ کا تقاضا کرتی ہے چاہے پنڈتانی ہو یا مولویانی۔

اسرار احمد رازی:[۶ دسمبر۲۰۱۱ء] دونوں ہی تخلیقات (مٹھی بھر ریت/سوال) بہت ہی خوب صورت،سبق آموز اور گہرے تفکر و تدبر کی غماز ہیں۔آپ نے نہایت مختصر الفاظ میں بہت مؤثر پیغامات دیے ہیں۔آپ کے قلم کی روانی اور فکر کی پختگی آپ کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔

نادرا ہما احمر (قریشی):[۶ دسمبر۲۰۱۱ء] آپ کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا بہت ہی مؤثر اور حیرت انگیز انداز ہے۔(انگریزی سے ترجمہ)

ہار جیت :

مبصر لطیفی: [۱۴ستمبر۱۰ء] قدرت کا انصاف۔......کھوکھلا پیار،خالی جذبات،لگتا ہے منٹو کے خالی بوتلیں اور خالی ڈبے محرک بنا ہے۔

مدیر،دیکل احتساب: [۱۴ستمبر۱۰ء] کون کہتا ہے منٹو مر گیا!

صادق کرمانی: [۱۵ستمبر۱۰ء] زندگی کے دو بھینکر روپ کو آپ نے کہانی میں سمویا ہے۔

عالم خورشید: [۱۵ستمبر۱۰ء] بہت خوب،واہ،واہ! بہت کم الفاظ میں آپ نے اپنی بات بڑے مؤثر انداز میں کہی ہے۔اور آپ کے بیانیہ کے تیور چبھنے والے ہیں۔خوشی ہوئی کہ آپ فعال ہوئے۔

اندرا پوناوالا (اندو شبنم):[ہار جیت/۱۴اکتوبر۱۰ء] اس کہانی میں بہت کچھ کہہ گئے آپ۔کون

ہارا کون جیتا، رئیلی ٹائٹل بہت ہی موزوں ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ ہار جیت میں شامل۔

عزیز نبیل : [۱۳۱ اکتوبر ۱۰ء] دیپک جی، کیا کہنے۔ اتنے مختصر الفاظ میں ایسی بھر پور کہانی۔ افسانے کے سارے لوازمات اس مختصر سے افسانے میں موجود۔ بہت خوب۔

اقبال نیازی: [۸ نومبر ۱۰ء] دیپک صاحب، منی کہانی کے نام پر جولوگ لطیفے پروس دیتے ہیں ان کے لیے یہ کہانی سیکھنے لائق ہے۔ یہ مکمل اور خوبصورت ہے۔...منٹو والی بات و یکلی احتساب سے میں متفق ہوں۔

رضیہ مشکور : [۱۴ نومبر ۱۰ء] مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں سوِک سینس Civic sense کی کمی شدت سے موجود ہے۔ اگر ہم اس پر قابو پا سکیں تو یقین کریں میرے ملک ہندوستان سے بہتر کوئی ملک نہیں۔

ارشد نیاز : [۲۶ نومبر ۱۰ء] اپنی کسی ضرورت یا طلب کو وقت ضرورت پورا کرنا کوئی گناہ نہیں ہے البتہ اپنی خواہشات کو غیر قانونی طریقے سے پورا کرنا گناہ ہے۔ فکشن میں اگر ہر کسی کو یوں لگے کہ وہ بھی اسی طرح گناہ گار ہے تو یہ قلم کار کی جبلت پر دال ہے کہ اس نے اس کو اپنے وجود کا حصہ بنایا۔ یہ آپ کے تابندہ فکر کو بھی درشاتا ہے جو کسی وقت آپ کے ذہن میں جنم لیتا ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

پرویز بلگرامی: [۱۹ دسمبر ۱۰ء] کتنی عمدہ تصویر معاشرہ دکھا دی ہے بگڑتے معاشرے کو۔ جو بیک وقت کئی وجہ سے بگڑ رہا ہے وہ تینوں رخ ایک کہانی میں سمیٹ دیے۔ واہ جناب۔ بہت اچھی کہانی ہے۔ شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ مزہ آ گیا۔

جاوید دانش: [۹ جنوری ۱۰ء] جگر بھائی دیپک۔ آپ کا قلم سچا ہے....ایک ننگی حقیقت کو آپ نے پوری ایمانداری کے ساتھ گرفت میں لیا ہے۔

رفیق راز: [۱۱۸ کتوبر ۱۰ء] واہ جناب کمال کی کہانیاں ہیں۔ اور بعض جو مجھے بہت زیادہ پسند آئیں وہ قیامت کی ہیں۔ آپ اپنے اندرون میں کھوئے ہوئے ادیب نہیں ہیں۔ آپ اپنے اردگرد سے باخبر ہیں۔ آپ کی آنکھیں بند نہیں بلکہ کھلی ہیں۔

سرپرائز/انتظار/پرتیکشا : [یہ کہانی پہلے انتظار کے عنوان سے چھپی تھی]

سنجیو ہنگو اسیہ: اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔ سٹوری ادھوری رہ گئی۔ اب بات یہ ہے کہ آخر کار آگے کیا ہوا؟ کیا پتی کا شک بے بنیاد ہے یا پھر جو شک ہے وہی سچ ہے۔ کہانی اچھی ہے لیکن آخر میں سر کھجلا رہا ہوں کہ آگے کیا ہوا ہوگا۔ آئی ایم وری ایکسائیٹڈ ٹو نو اباوٹ رزلٹ!

اندرا پونا والا: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] بہت اچھی کہانی ہے خاص کر سگریٹ کے ٹکڑوں کو ڈسٹ بن میں رکھا دکھا کر آپ نے کہانی کو الگ موڑ دے دیا۔ اچھا لگا، دیپک۔

کاوش عباس: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] پلیز اسے 'میں' کر کے لکھ کر آپ نے دل میں تہلکہ مچا دیا۔ اوہ!!!... [میرا جواب پا کر] ہاں صاف ظاہر ہے۔ معلوم ہے مگر اس خاص موضوع سے فوراً جو ذہن میں جھٹکا لگا تو اس کا وہ تاثر تھا۔ آج کل فلم 'ایکشن ری پلے' کا گانا بھی تو چل رہا ہے ٹی وی پر 'زور کا جھٹکا ہائے زوروں سے لگا'۔...... ویسے میں سمجھتا ہوں کہ خاص اس کہانی کو آپ تھرڈ پرسن (واحد غائب) میں لکھتے تو یہ زیادہ گہرا اثر ہوتا، کیونکہ (آپ کو) سچ معلوم نہ ہونے کا غائب کا ایک تعلق تھرڈ پرسن سے بنتا ہے۔

عزیر علی: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] واہ کیا بات ہے افسانے میں کہ سگریٹ کی راکھ اس کی باتوں کو جھٹلا رہی تھی۔ کون جانے سچ کیا ہے؟ واہ حقائق کی جھلک ہے اس میں۔

سبودھ لال: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] اچھی کہانی ہے، دیپک۔ واہ! بار بار سچ کیا ہے یہ سوال آپ کے کلام میں کیوں آتا ہے؟

ارشد نیاز: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] آپ کے افسانوں میں لوگ کشمیر تلاش کرتے ہیں اور افسانے.....زندگی کے وہ حقائق ظاہر کرنے پر تلے ہوئے رہتے ہیں، جو ہماری زندگی کی سچائی ہے۔ ویسے مرد کی فطرت ہے کہ.....وہ اپنی بیوی پر شک کرے۔ پتا نہیں چھپ کر سگریٹ پینے والی بیوی کا کیا حال ہوا ہوگا جب اچانک اس کا شوہر اس کے روبرو کھڑا ہوا ہوگا۔ بہر حال یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔

مہ وش آمنہ: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] واہ بہت خوبصورت، دیپک اس کو بنائے رکھیے، مجھے آپ کا اسٹائل پسند ہے۔

مرزا یٰسین بیگ: [۲۲ دسمبر ۲۰۱۰ء] کہتے ہیں شوہر جب بیوی کے لیے غیر متوقع تحفے لانے لگے یا بیوی اچانک سے غیر معمولی پیار جتانے لگے تو دال میں ضرور کالا ہوتا ہے۔

خورشید حیات: [۲۵ دسمبر ۲۰۱۰ء] لفظوں کو زبان عطا کرنے کا ہنر آپ کو آتا ہے، آج کی تہذیب کی قندیلیں دکھائی دے رہی ہیں کہانی کی زمین پر/ فلک پر۔ اچھی کہانی ہے۔

ایم اے حق: [۷ جنوری ۲۰۱۰ء] کلائمکس کا انداز بہت یکتا ہے۔ بہت اچھی کہانی ہے۔

گمشدہ کی تلاش:

سہیل احمد صدیقی، کراچی: [۲۹ جنوری ۲۰۱۲ء] افسانے میں چونکانے کا عنصر قدرے کم ہے۔

عالم خورشید: [۲۲ ستمبر ۲۰۱۰ء] بدلتے ہوئے اقدار اور انداز فکر کی اچھی عکاسی ہے۔ واہ!

ٹھیس:

جاوید دانش: [۲۱ ستمبر ۲۰۱۰ء] ایک منی کہانی میں آپ نے ایک سمندر سمو دیا۔ کلائمکس اچھا ہے۔

ظہیر جاوید: [۲۲ ستمبر ۲۰۱۰ء] دیپک جی زندگی کی ایک پرت یہ بھی ہے۔ میں اسے آپ کے قلم کی ابتدا سمجھوں گا، انتظار رہے گا آپ کے مختصر افسانے کا۔...... [ادبی زندگی کے بارے میں میرا جواب پڑھ کر] بہت خوب، مجھے دنیا ترک کیے ہوئے ۱۵ سال ہو گئے۔ اس لیے معذرت خواہ ہوں۔...... میں نے آپ پر طنز کیا نہ تنقید کی۔ یہاں آپ پہلی بار آئے ہیں۔... میں نے آپ کی تعریف کی اور کہا مزید کا انتظار رہے گا.. خوشی کی بات ہے کہ افسانے میں آپ کا مقام ہے... ہم تو سڑک چھاپ لوگ ہیں.. آپ سورج ہیں.. اور ہم سادھو، سنت، فقیر... ہم کو ہماری پاگل پن کافی ہے۔ شکریہ۔

تصنیف حیدر: [۲۲ ستمبر ۲۰۱۰ء] ایک بہترین اور جامع افسانہ ہے.. آپ جس طرح افسانوں کا اختتام کرتے ہیں وہ واقع تعریف کے لائق ہے۔... مجھے بہت پسند ہے۔

عذرا قیصر نقوی: [۲۲ ستمبر ۲۰۱۰ء] بہت خوب۔ مختصر افسانے کی ایک بہترین مثال۔

شکیلہ رفیق: [۲۲ ستمبر ۲۰۱۰ء] اس عورت نے صحیح کہا۔ ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں ہے... [میرے ردعمل کے بعد] سوری دیپک جی میں نے بس اٹھتے ہوئے لکھا تھا۔ چونکہ میں ایک افسانہ نویس ہوں (شاید آپ جانتے ہوں) وہ بات میں نے اس حوالے سے کی تھی۔ دیکھیے ہر تخلیق کار کی تخلیق میں اس کی شخصیت کہیں نہ کہیں ضرور چھپی رہتی ہے۔ آپ کا اینڈ [اختتام] (جیسا کہ آپ نے بھی لکھا) آپ کی شخصیت کی عکاسی کر رہا ہے۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن اگر میں ہوتی تو اس کہانی کو وہاں ختم کر دیتی جہاں اس

عورت کا آخری ڈائیلاگ تھا یعنی'' میں اس سے زیادہ کما سکتی تھی''۔اس کے آگے کی بات میں قارئین پر چھوڑ دیتی۔ یہ میرا ادنیٰ سے خیال ہے۔ پلیز آپ مائنڈ نہ کریں۔ میں تعمیری تنقید کی قائل ہوں اور اپنی کہانیوں پر کی گئی تعمیری تنقید کو کھلے دل سے قبول کرتی ہوں۔ پھر بھی اگر آپ نے محسوس کیا ہے تو معذرت خواہ ہوں۔

مدیر،ویکلی احتساب:[۲۳ ستمبر ۲۰۱۰ء] دیپک صاحب،معاف کیجیے گا،افسانوی ادب میں بھی اخلاقیات کا چابک گھومنے لگ جائے گا تو من مندر کے آبگینوں کو ٹھیس لگ ہی جائے گی۔ بھلے مانس کا چہرہ ویسے کا ویسے ہی رہنے دو۔غازہ ملو گے تو اصلیت کا جنازہ اٹھ جائے گا۔

ارشد جمال ہاشمی:[۱۴ جنوری ۲۰۱۱ء] دلچسپ بحث ہے سو میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔میں بھی شکیلہ صاحبہ کی رائے سے متفق ہوں۔افسانہ نگار جب افسانے میں وضاحتی انداز اختیار کرتا ہے تو افسانے کی معنویت محدود ہو جاتی ہے۔اور افسانے کی دھار کند ہو جاتی ہے۔خصوصاً منی افسانے میں تو وضاحت کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔میں اپنی بے لاگ رائے کے لیے دیپک صاحب سے معذرت خواہ ہوں۔میرا مقصد نہ شکیلہ صاحبہ کی حمایت ہے نہ دیپک صاحب کی تنقیص۔دونوں بہت سینئر افسانہ نگار ہیں۔میں دونوں کو برسوں سے پڑھتا آ رہا ہوں۔بس جو کچھ میں نے درست سمجھا وہ کہہ دیا۔ مجھے یقین ہے دیپک صاحب اس کا برا نہیں مانیں گے۔

احمد سہیل:[۱۸ جنوری ۲۰۱۱ء] بہت اچھی کہانی ہے۔ناسٹلجیائی اور حقیقت پسندانہ کہانی ہے۔

سلیم آذر:[۱۱ جنوری ۲۰۱۲ء] واقعی آدمی بعض اوقات ہماری توقعات کے برعکس نکلتا ہے۔

جرم :

زاہد مختار:[۱۱/۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء] کہانی...اور اس کا موضوع...دونوں بحث طلب ہیں جن پر فیس بک کے سکرین پے نہیں بلکہ قرطاس پے کچھ لکھنا پسند کروں گا۔بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع کی منطق تک پہنچنا اتنا آسان نہیں ہے۔ شیطانیت اور رحمانیت دو الگ پہلو ہیں۔قابیل اور ہابیل کی اپنی کہانی ہے۔کچھ اپنی الگ تفصیل لے آئے۔خیر پھر کبھی.... [استفسار کے بعد جواب] انشا اللہ برادر اکبر ..اس پر ہم تفصیل سے گفتگو کریں گے۔ میں تو طفل مکتب ہوں۔آپ سے فیض یاب ہونے کی تمنا تو

میرے دل میں پنہاں ہے۔آپ کہانیوں کے معاملے میں ایک معتبر نام ہیں۔ میں موضوع کی بات کررہا ہوں۔ یہ نکتہ چونکہ بڑا نازک ہے۔ بہتر ہے اسے ادبی پیراہن میں ہی سجایا جائے۔ یوں سر عام نا اچھالا جائے۔ یہی تقاضائے ادب ہے اور یہی مناسب بھی۔ میں یہ بھی بتا تا چلوں کہ ان کرداروں کی اپنی ایک کہانی ہے۔اس کہانی پے کوئی فیصلہ..بس آپ سمجھ گئے ہونگے میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

عالم خورشید:[۱۱/۱اکتوبر۲۰۱۰ء] آپ کی یہ منی کہانی غور و فکر اور مباحث کی فضا کو ہموار کرنے میں کامیاب ہے۔

اندرا پونا والا (اندرا شبنم اندو):[۱۴/۱اکتوبر۲۰۱۰ء] یہ منی کہانی بہت ہی چھو جانے والی ہے، تاثیر چھوڑ جاتی ہے، لکھتے رہیے۔تسی چھا گئے آن کمپیوٹر ورلڈ آلسو۔

خورشید حیات:[۹ جنوری ۲۰۱۱ء] جرم نے متاثر کیا۔آپ کی تمام کہانیوں کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا 'کتھا راگ' ہمیشہ ارتقا کی جانب مائل رہا ہے۔آپ کو حیات انسانی سے گہری محبت ہے۔عام طور پر دیپک بدکی جی آپ کی کہانی کا موضوع آج کا آدمی ہے۔آدمی (؟) کہانی کی زمین سے ہم سب کا 'گاؤں' غائب ہو گیا، دیپک بدکی۔...[میرے جواب کے بعد]۲۱ویں صدی میں اردو کہانی سے گم ہوتا 'گاؤں' کون دشا میں لے کے چلا رے.....!وہ سہانی سی ڈگر...!

ایم اے حق:[۱۳/۱اکتوبر۲۰۱۱ء] آپ کی اس منی کہانی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔آپ نے اس مختصر سی تحریر میں حکومت، عدلیہ، سماجک سنگٹھن، روحانی رہنماؤں وغیرہ کو کٹگھرے میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔بدکی، آپ عظیم ہو!

منتظر نیاز علی پرا:[۱۳/۱اگست۲۰۱۲ء] کہانی میں ابھارا گیا سوال لاجواب ہے۔کہانی پڑھ کر قاری ایک لمحے کے لیے سوچنے لگتا ہے.... ہاں سچ تو ہے۔

شناخت :

فرحت پروین:[شناخت ۹ جنوری ۲۰۱۱ء] اچھی مختصر کہانی ہے۔

مہرباں میرا ہی حائل ہے نمو میں میری	پودا چھتنار کے سائے میں کہاں پھلتا ہے

بیوی کی کمائی :

ارشد نیاز:[۲۴ مئی ۲۰۱۱ء] کہانی لکھنے کے طریقے کیا کیا ہیں وہ یہاں سمجھ میں آ رہا ہے۔

قمر سبزواری:[۱۵ جنوری ۲۰۱۲ء] بہت خوب بُدکی صاحب ، بہت اچھے ...آپ کی مختصر مختصر کہانی الفاظ میں تو مختصر ہوتی ہے پر تاثر میں بہت دور تک جاتی ہے۔

لکشمی کا سواگت :

زاہد مختار:[۱۲ اکتوبر ۲۰۱۰ء] بدکی صاحب، میں برسوں سے یہ نہ سمجھ پایا کہ سرسوتی اور لکشمی دور دور کیوں ہیں۔کیا اس کے پیچھے واقعی کوئی حقیقت ہے یا ایک مفروضہ ہے۔آج کے دور میں تو سرسوتی کے پجاریوں کے گھروں میں کافی لکشمی ہے۔کہانی پھر سمندر اور کوزے کی مثال کے مصداق ہے۔

عالم خورشید:[۱۳ر اکتوبر ۲۰۱۰ء] بدکی صاحب میں نے اس سے قبل آپ کی ایک منی کہانی پر تبصرہ کرتے وقت یہ لکھا تھا کہ آپ نے اس میں شاعری کے ٹولس استعمال کیے ہیں۔اس کہانی سے بھی مجھے اس رائے کی تصدیق ہوتی لگ رہی ہے۔ مجھے یہ بات اچھی لگ رہی ہے کہ بہت کم الفاظ میں ہنر مندی سے آپ اپنی بات کہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔کسی تخلیق پر اچھی بری رائے آتی رہتی ہے۔

رضیہ مشکور:[۱۴ر اکتوبر ۲۰۱۰ء] میں آپ کی بات سے صد فی صد متفق ہوں دیپک صاحب۔ بلکہ بغیر تنقید کے تو تخلیق میں نکھار آ ہی نہیں سکتا۔مگر اب دیکھا یہ جا رہا ہے کہ تنقید 'واہ واہی' کی حد سے آگے بڑھتی ہے تو ذاتیات میں داخل ہو جاتی ہے۔پھر وہ یقیناً مثبت نہیں رہتی۔الاّ یہ کہ چند صاحب اہل علم کے جن میں ذاتی انا کا کانٹا نہیں لگا ہوا ہے۔باقیوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ تنقید ذاتیات سے ہی شروع کرتے ہیں اور ان کی تان بھی ذاتیات پر ہی ٹوٹتی ہے۔بہر حال مجھے عالم خورشید صاحب ک بات سے اتفاق ہے ۔آپ کی ان کہانیوں میں 'اختصار' نے شعریت ضرور پیدا کی ہے مگر جانے کیوں؟ مجھے ان کے کلائمکس پر تشنگی کا احساس ضرور رہا ہے۔ہو سکتا ہے یہ میرا احساس ہے۔باقی آپ کی مختصر کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔

ارشد نیاز:[۲۴ مئی ۲۰۱۱ء] لکشمی کا سواگت ....بہو ہی دھن لاتی ہے۔خوشی کی یہ بات ہے مگر چند دہائیوں قبل اسی زمین کے کسی گھر میں بیٹی پیدا ہوتی تھی تو یہی جملہ ادا کیا جاتا تھا۔وقت کے ساتھ ساتھ ہم کہاں آ گئے.....سرسوتی کا روپ لکشمی کیسے لے سکتی ہے۔اسے تو گیان چاہیے، دھیان چاہیے اور تیاگ چاہیے....ودیا ساگر نے اپنی پیاس بجھانے کے لیے آشرم کا راستہ اپنایا کہ اس کی خوشی اسی میں شامل ہے،

جب کہ اس کے پتا جی کی خوشی اس کی پیاس میں موجود نہیں ہے۔اچھی کہانی ہے۔...[۱۱ جنوری ۲۰۱۲ء، انگریزی سے ترجمہ] کہا جاتا ہے کہ لکشمی اور سرسوتی ایک دوسرے کی دشمن ہیں اور دونوں ایک ہی ساتھ ایک گھر میں نہیں رہ سکتی ہیں۔لکشمی کو ایسی دنیا کی ضرورت ہے جہاں وہ لوگوں کو دھوکا دے سکے جبکہ سرسوتی کو مجرد اور حقیقی زندگی سے محبت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ودیا ساگر بھاگ کر ایک معمولی تنہا جھونپڑے میں پناہ لیتا ہے۔سچ مانیے یہ ایک کامیاب مختصر ترین کہانی ہے۔

نادر انا: واہ بہت عمدہ و پراثر کہانی۔آپ کے اچھوتے اور گہری سوچ کے دھارے ایک دفعہ میں ہی بندے کو جکڑ لیتے ہیں۔

سنجیو ہنگو اسیہ:[لکشمی کا سواگت، ۱۱ جنوری ۲۰۱۲ء] کہا جاتا ہے کہ ''تعلیم نہ ہو تو عقل نہیں ملتی، عقل نہ ہو تو دولت نہیں ملتی، دولت نہ ہو تو دوست نہیں ملتے اور دوست نہ ہوں تو سکھ نہیں ملتا۔'' جیسے کہ آپ کی منی سٹوری ہے، اس کے مطابق اگر سرسوتی گھر میں ہو تو لکشمی خود بہ خود چلی آئے گی۔کافی عمدہ بات کہی ہے آپ نے اس افسانچے میں۔(ہندی سے ترجمہ)

پانی تو پلا دے یار:

ارشد نیاز:[۲۴ مئی ۲۰۱۱ء] واہ، کیا زمانہ تھا۔اور اب نفرت ہی نفرت کے پیڑ اگے ہوئے ہیں۔اسے بویا کس نے؟ اس میں کھاد اور پانی دیا کس نے۔یہ بھی اس کہانی سے واضح ہو رہا ہے۔

اعجاز خان:[۶ مارچ ۲۰۱۲ء] کہانی پسند آئی۔سچ مانیے میری آنکھیں یہ سوچ کر نم ہو گئیں کہ کشمیر ماضی میں کیا تھا اور اب کیا ہو چکا ہے۔پھر بھی روشن خیال ہونے کے سبب میں پرامید ہوں کہ یہ پاگل پن جلدی ہی بھاپ بن کر اڑ جائے گا، کشمیر دوبارہ گلزار بن جائے گا اور امن، سکون، اور ملواں تہذیب پھر سے نمودار ہوگی اور اس سے بھی بڑھ کر پرانا کشمیری کلچر پھر سے دیکھنے کو ملے گا۔.....[۶ مارچ ۲۰۱۲ء] اس بندے کو پیٹ کر کسی کو یہ خیال آیا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے اور بھاگنے کے بجائے وہ واپس آئے اور اس بندے کی ہمت بندھائی، اور اس کو واپس ہوش و حواس میں لے آئے۔یہی کشمیری کلچر کا وہ جوہر ہے جس کی میں قدر کرتا ہوں اور جسے لوگ 'کشمیریت' کہتے ہیں۔میری آنکھیں اس جوہر کا، جو کشمیر کی تخصیص تھی، سوچ کر ہی بھیگ گئیں۔چونکہ آپ وہاں بہت برسوں رہے ہیں، اس لیے آپ نے اس جوہر

کو قریب سے محسوس کیا ہوگا۔ پھر ایک بار شکریہ کہ آپ نے اس جوہر کو سامنے لا کر رکھ دیا۔ (ترجمہ)

خود کشی :

ارشد نیاز:[۱۹ دسمبر ۲۰۱۰ء] بہترین افسانہ۔ آخری جملہ جھٹکا دے رہا ہے۔

پرویز بلگرامی، کراچی :[۱۹ دسمبر ۲۰۱۰ء] واہ جناب کیا خوب لکھ گئے۔ بہت عمدہ۔ جھٹکے سے خیالات پلٹ دینا ہی فن کی بلندی ہے۔ واہ!

سوہن راہی:[۱۹ دسمبر ۱۰ ۲۰ء] مجھے یہ پسند ہے۔ کیا طریقہ ہے زندگی اور موت کا۔ بہت خوب۔

عزیز نبیل: [۱۹ دسمبر ۲۰۱۰ء] کیا بات ہے دیپک صاحب..آخری جملے پر ہنسی بھی آئی اور اس کی تہہ میں موجود اس مجبور شخص کا کرب بھی محسوس کیا جسے پتا نہیں کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

سنجیو ہنگواسیہ:[۲ فروری ۲۰۱۲ء] ایسا ہوتا ہے کہ کئی بار ہمارے اندر کے مثبت خیالات زندگی کی جنگ میں دب جاتے ہیں۔ لیکن یہ خیالات صرف دب جاتے ہیں، ختم نہیں ہوتے۔ جب ہم اپنی صورت کسی دوسرے کے روپ میں دیکھتے ہیں تو یہ خیالات جاگرت ہو جاتے ہیں اور زندگی کی جنگ میں ایک ہتھیار کے روپ میں کام آتے ہیں۔ اس لیے تو کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ مثبت سوچیں...سوچ مثبت رکھیں اور روشن خیال رہیں۔ یہ آپ کی منی سٹوری مجھے کافی پسند آئی۔ پڑھنے کے بعد کہیں نہ کہیں کچھ سیکھنے کو ہی ملا۔ (ہندی سے ترجمہ)

نعیم بیگ:[۳۱ جنوری ۲۰۱۵ء] لگتا ہے کہ بطور دلچسپی و نفسیاتی عمل کے تحت الشعور اچانک فیصلہ لے لیتا ہے اور ذہن کے مونولوگ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس منی افسانے کا کرافٹ (صنعت گری) حیرت انگیز اور قابل تعریف ہے۔ افسانہ نگار کے لیے بہت ساری آفرین و تحسین۔ (انگریزی سے ترجمہ)

نیلامی:

اختر صاحب:[۹ جنوری ۲۰۱۱ء] غریب کا استحصال جاری ہے ازل سے اور یہ ہمیشہ غریب کی خوشی سے ہوتا ہے، اس لیے اسے آئی پی ایل (IPL) کا لطف اٹھانے دو۔ ایک اچھی بات ہے کہ آئی پی ایل میں عورتوں کی نیلامی نہیں ہوتی۔......غریبوں کو ہمیشہ امیروں نے کسی نہ کسی طریقے سے استحصال کیا ہے۔ عربوں غربا امیروں کی جھولی میں کھربوں بھر دیتے ہیں۔...بدکی صاحب آپ کی کہانی میں معنویت

ہے اور آج کے دور میں اسی کو اصلی ادب کہتے ہیں.... تب لوگ مجبوری میں بکے اور آج مرضی سے۔

عالم خورشید: [۹ جنوری ۱۱ء] زندگی کی تصویر کو دو زاویے سے اچھی طرح فوکس کیا ہے۔ لہجہ بہت ہی نرم ہے مگر زیریں لہروں میں جو تیکھا پن ہے اس کی داد قبول کریں۔

پرویز بلگرامی: [۹ جنوری ۱۱ء] واہ بہت خوب... اسے میں تیر سہ شعبہ کہوں گا۔ تین پھل والا تیر ۔ایک کہانی میں تین رخ پیش کر دیے.... حالات کی سچی تصویر کشی ہے۔

خورشید حیات: [۹ جنوری ۱۱ء] آپ کی فلک فلک سوچ اور بیان کرنے کا انداز اچھوتا اور نرالا ہے۔ قصہ گو کے اس انداز کو میں کیا نام دوں؟ میں ٹھہرا آدھا ادھورا آدمی، اپنے آپ کو مکمل کرنے کے پروسیس میں زندگی مختصر سی لگتی ہے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی: [نیلامی ۱۱ جنوری ۱۱ء] افسانہ نیلامی جس استحصال کا اظہاریہ ہے اس کی طرف کم ہی لوگوں کا دھیان جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ استحصالی عناصر جدید دور کے شریف لٹیرے ہیں۔

امین بنجارا: [۱۱ جنوری ۱۱ء] بہت عمدہ افسانہ ہے۔ اس مختصر سی تخلیق میں آپ نے اس کائنات کی ہر شے کی نیلامی کو زیر بحث لایا ہے۔ غرض کہ خواہشیں اور ضرورتیں بھی غیر محسوس طریقے سے نیلام ہوتی ہیں۔

عبدل باری: ہم سب کسی نہ کسی روپ میں کسی نہ کسی طریقے سے زندگی میں کبھی نہ کبھی نیلام ہو جاتے ہیں. سر یہ سچ مچ ایک چھو جانے والی اور معنوی کہانی ہے۔

اسرار احمد رازی: مختصر مگر متاثر کرنے والا افسانچہ ہے۔ آپ کے افسانوں کا ایک الگ مزہ ہوتا ہے۔ ان کی انفرادیت قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

ووٹ :

ایم اے حق: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] ہندستان کی موجودہ جمہوریت کی ایک ننگی تصویر پیش کی ہے آپ نے جناب۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ کو چوم لوں۔ آپ مہان ہیں بدکی جی۔

عالم خورشید: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] بے حد شائستہ اور نرم لہجے میں تیکھا اور سچا طنز۔ بہت خوب واہ۔

جنید جاذب: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] فنی بھرپوریت، سادہ کاری سے مزین، نرم متوازن لہجہ۔

خوبصورت کہانی۔

حامد اقبال صدیقی:[۳۰ جون ۲۰۱۱ء] کہانی بہت عمدہ ہے۔

خورشید حیات:[۳۰ جون ۲۰۱۱ء] کم لفظوں میں آج کا سیاسی، سماجی منظر نامہ۔ جہاں پے کہانی ختم ہوتی ہے وہاں سے اک نئی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ میرا ووٹ آپ کی منی کہانی کے نام۔

ملک زادہ جاوید:[۳۰ جون ۲۰۱۱ء] بہت خوب، یہ کہانی ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

ارشد نیاز:[۵ جنوری ۲۰۱۲ء] بہت مختصر کہانی میں ہم اپنے تجربے کی عکاسی کرتے ہیں اور اپنے قارئین تک بڑی سادگی سے پہنچاتے ہیں جیسے اس فکشن میں ظاہر ہے۔ یہ حقیقی خیالات کی سچائی سے ترجمانی ہے۔..... [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] جمہوریت میں یہی ہو رہا ہے۔ حقدار گھر میں رہتا ہے اور ووٹ دوسرے دے دیا کرتے ہیں۔ سیاست کی کرسی ہتھیانے کے لیے ہمارے ملک میں یہ سب سے بڑا کرپشن ہے۔ حال فی الحال اس میں کچھ سختی کی گئی ہے تا کہ کمزور اور غریب بھی اپنا ووٹ ڈال سکیں۔ مگر ابھی بھی کامیابی نہیں ملی ہے۔ وجہ یہی ہے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے کچھ افسران بھی سیاست کا مہرہ بنے ہوئے ہیں۔ اس کہانی میں جیت حقیقتاً آپ کی نہیں ہوئی ہے۔ آپ کا احتجاج بے معنی رہا مگر اصلیت کا بے لاگ انکشاف ہی اس کہانی کی کامیابی ہے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

نصیر احمد ناصر: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] بالکل سچ ہے۔

ایم اے حق:[۳۰ جون ۲۰۱۱ء] ارشد نیاز کی باتوں سے متفق ہوں۔ دراصل جیت اس کرپٹ شخص کی ہوئی جس نے غلط ڈھنگ سے ووٹ ڈلوا دیا۔

جان عالم: [۳۰ جون ۲۰۱۱ء] آپ بھی ہارے اور وہ بھی ہارے۔ جنھوں نے آپ کا ووٹ ڈالا، وہ بھی ہارے۔ اور آپ جیتے۔ اس طرح کہ آپ نے جس اجتماعی ہار کو بتانا تھا، بتا دیا۔

ہری کشن راز دان رازؔ:[۳۰ جون ۲۰۱۱ء] آپ نے لڑائی ہاری مگر جنگ جیت لی جو شروع ہو چکی ہے حالانکہ ابھی کمزور ہی ہے۔ ایسے ہی یہ مصر میں حال ہی میں شروع ہوئی۔ ضرور کہوں گا کہ اتنی چھوٹی سی کہانی میں اتنی بڑی بات کہی ہے آپ نے۔ کہتے رہیے۔ اچھی باتیں دیر سے سمجھ آتی ہیں لیکن کبھی بیکار نہیں جاتیں۔

عزیز نبیل:[یکم جولائی ۲۰۱۱ء] بدکی صاحب، بہت خوب..عام سے موضوع کو آپ نے ایک فن کار کی نظر سے دیکھا اور برتا ہے۔عمدہ افسانچہ۔

ممتاز نازا:[۳۰ جون ۲۰۱۱ء] واہ کیا کہنے،آج دیش میں لوک تنتر کی یہی حالت ہے اور ہم تماشہ دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔

گارنٹی:

خورشید حیات: [۲۱ اگست ۱۱ء فیس بک] آج کا سماج اور مشکوک نگاہوں کے عمل سے گزرتی ہوئی یہ مختصر کہانی اپنی سادگی کے باوجود ایک تاثیر رکھتی ہے۔ایک مکالمے کی صورت میں کہانی آگے بڑھتی ہے اور متاثر کر جاتی ہے۔ بہت عمدہ۔

ظہیر جاوید (چراغ حسن):[۲۱ اگست ۱۱ء،فیس بک]شکریہ، بہت اچھی تحریر...آج کے دور کی صحیح عکاسی۔

عالم خورشید:[۲۱ اگست ۱۱ء،فیس بک] بے حد نرمی اور آہستگی سے کیا خوب طنز ہے۔

امین بنجارا:[۲۱ اگست ۱۱ء،فیس بک] اچھا موضوع اور اچھا اسلوب۔تخلیق اپیل کرتی ہے۔

اویس جمال شمسی:[۲۴ اگست ۱۱ء،فیس بک] میرا خیال ہے کہ اگر آپ جیسے حضرات ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسی طرح قلم اٹھاتے رہیں تو سماج میں کافی حد تک سدھار لایا جا سکتا ہے۔آپ نے یقیناً ہم سب کو اور سارے سماج کو آئینہ دکھایا ہے۔....آپ نے بڑی سادگی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ مشورہ دینا کتنا آسان ہے اور عمل کس درجہ دشوار۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

نادرا اہا احمر:[۲۴ اگست ۱۱ء،فیس بک] دکھ بھری مگر حقیقت۔سنجیدہ سماجی مسئلے کی عمدہ عکاسی۔

وسیم حیدر ہاشمی:[۲۶ اگست ۱۱ء فیس بک] یہی زمینی حقیقت ہے اس ملک کی، دیپک صاحب۔ خیال جتنا عمدہ ہے پرابلم اتنی ہی بھاری ہے،شاید فی الحال اس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔

سید نور الحسنین:[۲۱ اگست ۲۰۱۱ء] افسانچہ دل کو چھو گیا۔کچھ مہینے پہلے اسی موضوع پر قدیر زمان کی کہانی پڑھ چکا ہوں۔یہ ہمارے ملک کا ہی نہیں ساری دنیا کا مسئلہ ہے۔آپ نے اختصار کے ساتھ بھر پور تاثر پیدا کر دیا۔

کتابی محبت :

خورشید حیات : [۲۱ اگست ۲۰۱۱ء] دیپک بدکی چیخنے چلانے، کہانی چوراہے پے، اپنی ڈفلی بجانے والے کہانی کار نہیں.... مگران کی سوچ گھمایا پھر سوچ کینواس میں بہت کچھ ہے۔ان کی فکر عقلیت کی تابع ہے..... کتابی محبت، محبت کے نصیب میں آئی بدنصیبی کی مثال ہے۔

منتظر نیاز علی پرا: [۲۱ اگست ۲۰۱۱ء] میں کچھ مختلف اختتام کا انتظار کر رہا تھا۔... [۲۲ اگست ۱۱ء] کہانی کی شریانوں میں ایک عجیب سی معصومیت گردش کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جب تک اختتام تک پہنچتے ہیں اور پھر کچھ اور ہی انجام ہمارے سامنے آتا ہے۔ میں ان دو کے درمیان کسی بھی واسطے کا اندازہ نہیں لگا پایا۔ (یہ سچ ہے کہ میں ابھی طفل مکتب ہوں، شاید وہی ایک وجہ ہو کہ میں آگے کیا ہوگا نہیں دیکھ پایا ۔) ارشد نیاز اختتام کو بجا فرماتے ہیں اور اس کی وجہ محبت کے ناموں کو بتلاتے ہیں۔ پر کیسے؟ ہوسکتا ہے کہ ان کے سبب وہ جسمانی طور پر ایک دوسرے کے قریب آ چکے ہوں۔ مگر غربت کے بغیر اور کون سی شے ہوسکتی ہے جو آدمی کو ایسا کرنے پر مجبور کرلے جو کہ کہانی کے آخر میں کردار کرتے ہیں۔ وہ مرکزی فکر سے کیسے جڑا ہے، میری سمجھ سے باہر ہے؟ (انگریزی سے ترجمہ)

غلام محمد شاہ: [۲۹ فروری ۲۰۱۲ء] آپ کی نگارشات مجھے ہمیشہ متاثر کرتی ہیں۔ سہارا میگزین میں چھپی آپ کی کہانی بہت اچھی ہے۔

ارادے جن کے پختہ ہوں، نظر جن کی خدا پر ہو تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

ایم اے حق: [۲۱ اگست ۲۰۱۱ء] بہت اچھی لگی۔ میرے خیال میں بدکی صاحب نے ایک انوکھے انداز میں 'غیر سنجیدہ' محبت کی (جیسا کہ عنوان سے بھی ظاہر ہے) ایک بہترین مثال پیش کی ہے۔

اسحاق ساجد: [۲۱ اگست ۲۰۱۱ء] یہی پرابلم ہے۔ کیا خوبصورت افسانچہ لکھا آپ نے۔

ارشد نیاز: [کتابی محبت، ۲۲ اگست ۲۰۱۱ء] مختصر ترین کہانیوں میں یہ المیہ ہے کہ فن کار تفصیلی متن سے پرہیز کرتا ہے اور اسے کم سے کم جملوں میں بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ نتیجتاً کبھی کبھی اسے ترسیل کی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس کہانی میں ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ کہانی بالکل سیدھی سادی ہے اور کہانی کا motive بھی واضح ہے۔ دلی کی سڑکوں پر جیب کترنا اور فلمی دنیا میں پانچ ہزار کے

عوض جسم کی نمائش کرنا عشقیہ خطوط کے اثرات ہیں۔ یہ سچ ہے کہ عشقیہ خطوط کی کتابوں نے ان گنت لڑکوں لڑکیوں کو غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ بدکی صاحب کی یہ کہانی میری نظر میں ایک کامیاب کہانی ہے۔

زلزلہ :

وسیم احمد فدا: [۲۲ مئی ۲۰۱۲ء] اس کہانی کے توسط سے آپ نے بے حد گھمبیر سوال اٹھایا ہے۔ بے حد متاثر کیا اس مختصر کہانی نے۔ ناچیز نے اپنا پہلا افسانہ (۲۰۰۵ء میں ۹ گجرات کے اسی زلزلے سے متاثر ہو کر لکھا تھا جس کا عنوان تھا 'دھوپ رہتی ہے نہ سایۂ۔

عمران یونس: [۲۲ مئی ۲۰۱۲ء] پاکستان میں جب بھونچال آیا تو ایک مارکیٹ کو تھوڑا کم نقصان پہنچا، تو لوگوں نے کہا اس مارکیٹ میں کوئی بے حیائی والی دُکان نہیں تھی جیسے ویڈیو وغیرہ کی تو اس لیے اس کی بچت ہوگئی۔ دیپک بُدکی: [جواب]: گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتی ہے۔ اکتوبر میں آئے زلزلے میں سرحد کی دونوں طرف بہت جانی اور مالی نقصان ہوا۔ ایسے سانحات میں کہاں برے اور بھلے کی تمیز ہو سکتی ہے۔ انسان خود کو محض تسلیاں دیتا رہتا ہے۔

جھوٹی امارت :

وسیم احمد فدا: [۲۲ مئی ۱۲ء] مختصر الفاظ میں آپ نے بہت عمدہ کہانی کہی ہے۔ بے حد پسند آئی۔

طوق اطاعت :

سہیل احمد صدیقی [۳۰ مئی ۲۰۱۴ء]: جھک کر سلام کرنا اسلامی تعلیمات کے منافی فعل ہے۔ یہ طریقہ عجم کے بادشاہوں سے مسلم حکمرانوں نے نقل کیا اور رائج کیا تھا۔

سگریٹ/اندھے کی لاٹھی :

یوگیندر بہل تشنہ :آپ کے منی افسانے پڑھ کر اچھے لگے۔ سگریٹ اور طوائف والا کچھ زیادہ دل کو بھا گیا۔

تنقیدی مضامین و تبصرے:

کرشن چندر کے ادھورے سفر کی پوری داستان

(مطبوعہ شعر و سخن، مانسہرا، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء، جلد ۱۶ شمارہ ۶۴)

☆ مدیر کے نام خطوط (مطبوعہ شعروسخن، مانسہرا، جنوری تا مارچ ۲۰۱۶، جلد ۷، شمارہ ۶۵)

آصف ثاقب، بوئی، ایبٹ آباد، پاکستان؛ ۲۳ نومبر ۲۰۱۵ء، ص ۸۶:..... 'کرشن چندر کے ادھورے سفر کی پوری داستان' دل میلا نہ کرے تو خاصے کی چیز ہے۔ کرشن چندر بڑا رائٹر تھا۔ اس نے ادب فلم اور سیاست میں اپنی سی کر دیکھی۔ سیاست میں اگر چہ اس کا کردار اہم نہیں، تاہم اس کی تحریروں کے اثرات یہاں بھی کہیں نہ کہیں در آتے ہیں۔ کرشن چندر کو سب نے مانا۔ تسلیم و رضا کے پیرائے کبھی محو نہ ہو نگے۔ اس کی زندگی میں سلمیٰ صدیقی کا چیپٹر تشویش ناک ضرور ہے مگر انسانی خطاؤں اور مجبوریوں پر دال ہے۔ وہ آخری دموں مسلمان ہوا کہ نہیں ہوا، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ اس نے افسانے کے باب میں اردو ادب کو سرخ روئی عطا کی ہے۔ جو اپنے انداز میں منفرد اور عظیم ہے۔

احمد صغیر صدیقی، کراچی؛ ص ۸۷: اس شمارے میں دیپک بُدکی صاحب نے کرشن چندر کے بارے میں بہت دلچسپ مضمون دیا ہے۔

طالب انصاری، واہ کینٹ، پاکستان: شعروسخن کا شمارہ ۶۴ ملا۔..... دیپک بُدکی نے کرشن چندر کی زندگی سے روشناس کرایا۔ دلچسپ مضمون تھا۔ لیکن کرشن چندر جیسی مہان شخصیت کی زندگی کے سفر کو پوری طرح محیط نہیں تھا۔ لکھتے ہیں کہ دوستی، یاری اور ملنساری میں کرشن چندر کا جواب نہیں تھا۔ اس کے ثبوت میں وہ چند سطریں ہی پیش کر سکے جب کہ یہ وہ اوصاف ہیں جو کرشن چندر کی شخصیت میں بہت اہم ہیں۔ ان خصوصیات کے حوالے سے مزید لکھنا چاہیے تھا۔ کم سے کم مجھے یہاں تشنگی محسوس ہوئی۔

وشوامتر عادل کرشن چندر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کرشن چندر کا مکان بمبئی کے ہر بے گھر، آوارہ ادیب، فلمی سکرپٹ رائٹر، مصور اور شاعر کی آماجگاہ تھی۔ جس کا ممبئی میں کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا وہ کرشن چندر کے گھر کا رخ کرتا۔ گھر کا بالائی حصہ انہی لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ رات بھر گھر کے اس حصے میں دھما چوکڑی مچی رہتی۔ کوئی رات کو بارہ بجے آ رہا ہے.... کوئی اس سے بھی دیر سے... میرا جی بھی یہیں رہے اور رات گئے لوٹتے۔ کبھی کبھی تو رات کو بالکونی میں ٹہلنے لگتے۔ لکڑی کے فرش پر آواز گونجتی مگر مجال ہے کرشن چندر نے ان لا ابالی دوستوں کا برا مانا ہو۔ اس طرح کی باتوں کا اظہار اصل میں کرشن کی ملنساری کے وصف کو نمایاں کرتا ہے۔

سلیم آغا قزلباش، چک نمبر ۵۶، جنوبی، سرگودھا، پاکستان؛ ص ۸۹: سہ ماہی شعر و سخن کا تازہ شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء نظر نواز ہوا۔ اس شمارے میں دیپک بُدکی کا تحریر کردہ مضمون 'کرشن چندر۔ ادھورے سفر کی پوری کہانی' ان کی شخصیت کو سمجھنے میں معاونت کرتا ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اول تا آخر دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ مشاہیر ادب کے بارے میں اس طرح کے مضامین عام قارئین ادب کے لیے وقتاً فوقتاً شائع ہونے چاہئیں۔

عامر سہیل، ایبٹ آباد، ص ۹۱: دیپک بُدکی کا مضمون 'کرشن چندر۔ ادھورے سفر کی پوری داستاں' ایک خالص تحقیقی تحریر ہے۔ معلومات افزا ہے۔ تاہم ان کا یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ پریم چند کے بعد کرشن چندر کو اردو فکشن میں بے انتہا شہرت حاصل ہوئی۔ کرشن چندر اردو افسانے کا اہم نام ضرور ہے لیکن انھیں پریم چند کے بعد مسندِ تکریم پر فائز کرنا کچھ زیادہ بہتر فیصلہ نہیں لگتا۔ بہر حال یہ ان کا ذاتی تحقیقی وژن ہے جس کا وہ حق رکھتے ہیں۔

کرشن چندر اور کشمیر:

سہیل احمد صدیقی، نہایت وقیع اور جامع نگارش ہے۔ بہت خوب۔ پاکستان میں اشاعت کے لیے سہ ماہی الدبیر (بہاول پور) کو ارسال کیجیے۔

مہر افروز، ایڈیٹر خرمن انٹرنیشنل انڈیا[افروزہ کاٹھیاوارڈی]: اچھا جامع مضمون ہے۔ کرشن چندر کے مطالعہ میں زریں اضافہ ہے۔

خلوص و انکسار کا پیکر -اظھر جاوید:

فہیم انور: [۱۷ اگست ۲۰۱۲ء] تخلیق لاہور کے مدیر، شاعر، ادیب اور مترجم جناب اظہر جاوید کے فن و شخصیت پر آپ کا یہ بسیط مقالہ لائق ستائش ہے۔ نیز اظہر جاوید صاحب کو بہترین تحسین بھی۔

امین بنجارا (ناصر احمد قریشی): [۱۸ اگست ۲۰۱۲ء] بہت عمدہ لکھا ہے آپ نے۔ آپ کی اس تحریر میں خلوص اور انکسار کی لہریں موجزن ہیں۔

ایم اے حق کے افسانچوں کی دنیا:

فہیم انور، کولکتہ، مغربی بنگال: [۲۰ ستمبر ۲۰۱۲ء] ایم اے حق کی افسانچہ نگاری پر لکھا گیا یہ آپ کا

ایک اچھا تنقیدی مضمون ہے۔ابتدا میں افسانے سے متعلق سمرسٹ مام کی نقل کردہ بات اچھی لگی۔

کرشن چندر کا ناول 'غدّار' -ایک تجزیہ :

انور احمد، کراچی (۲۰ / اپریل ۲۰۱۶؛ مسینجر) آج آپ کا تجزیہ 'ارتقا' (کراچی) میں پڑھا جو آپ نے کرشن چندر کی کہانی 'غدار' پر کیا تھا۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اس خوبصورت اور بے لاگ تبصرے پر۔غدار میری پسندیدہ کہانی ہے اور میں نے بار بار اسے پڑھا۔کرشن نے کمال کا لکھا ہے۔یہ کہانی آج بھی دونوں ملکوں میں دہرائی جارہی ہے۔نہ جانے ہم کب انسان بنیں گے۔.....ارتقا بائیں بازو اور آزاد سوچ رکھنے والوں کی بیباک آواز ہے۔

تبصرے :

اپنی مٹی کی مہک (اشفاق برادر):

عالم خورشید:[۴ جون ۲۰۱۲ء] سنجیدگی سے مطالعہ کے بعد غور و فکر سے لکھا گیا منصفانہ تبصرہ، یہ بات آپ کے تمام تبصروں اور مضامین سے جھلکتی ہے۔یہ بات لکھنے کی ضرورت یہاں اس لیے ہوئی ہے کہ آج کل عام طور پر کتابیں الٹ پلٹ کر تبصرے اور مضامین لکھنے کا چلن عام ہے۔

جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار (نور شاہ):

اسرار احمد رازی:[۸ جنوری ۲۰۱۲ء] آپ نے جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار نامی کتاب پر بہت عمدہ تبصرہ فرمایا ہے۔

ارشد نیاز:[۸ جنوری ۲۰۱۲ء] بہت ہی مختصر اور عمدہ تبصرہ ہے۔

نقوش دل (دل تاج محلی):

شمیم فاروقی:[۹ ستمبر ۱۱، فیس بک]واہ، بہت عمدہ تبصرہ۔کتاب کا گویا نچوڑ پیش کردیا آپ نے

خورشید حیات:[۸ ستمبر ۲۰۱۱ء، فیس بک]افسانوی مجموعہ 'نقوش دل' پر تبصرہ معتبر افسانہ نگار دیپک بدکی کر رہے ہوں تب تبصرہ صرف تعارف نہیں رہتا (جیسا کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے) بلکہ تبصرہ میں ہر کہانی کا چہرہ بہت قریب سے دِکھ جاتا ہے۔اور پھر ہوتا یہ ہے کہ کہانی سے اور اس کے کردار سے ملنے کی تمنا جاگ جاتی ہے۔اس تبصرہ کو پڑھنے کے بعد کچھ ایسا ہی ہوا۔

امین بنجارا: [۹ ستمبر ۲۰۱۱ء، فیس بک] آپ نے اس مختصر سے تبصرے میں ایک نہیں کئی سمندر بند کر دیے ہیں۔ دل تاج محلی کی تحریروں اوران کی زندگی کے کئی پہلو قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔

عالم خورشید: [۹ ستمبر ۲۰۱۱ء، فیس بک] بے حد کسا ہوا منصفانہ جائزہ، نثر بے حد صاف شگفتہ، عمدہ پیش کش۔

ھے رام کے وجود پر ھندستان کو ناز (ڈاکٹر اجے مالوی):

سہیل احمد صدیقی: [۲۴ جون ۲۰۱۲ء] بہت جامع تبصرہ حسب دستور، ڈاکٹر اجے مالوی کی علمیت اور علم دوستی کا مداح ہوں۔ انھوں نے مجھے اپنی کتاب ویدک ادب اور اردو کا پورا مسودہ ای میل کے ذریعے ارسال کیا تھا۔ میں نے اس کی مدد سے دیگر مواد جمع کرتے ہوئے اردو اور دیگر زبانوں میں تعلق و اشتراک پر تحقیق شروع کی تھی جو ادھوری ہے۔ [۹ ستمبر ۲۰۱۲ء] یہ ایک متوازن نقطۂ نظر ہے۔ ایک تبصرہ نگار کو اسی طرح معروضیت سے کام لینا چاہیے خاص کر جب وہ ایسی تصانیف پر تبصرہ کرتا ہے۔ پڑھنے میں اچھا لگا۔ (انگریزی سے ترجمہ)

شکستہ ساز (عباس عراقی):

سہیل احمد صدیقی؛ [۵ جون ۲۰۱۴ء] بہت عمدہ اور جامع تبصرہ فرمایا جناب من۔

دست حنائی (منظور پروانہ):

سہیل احمد صدیقی: [۸ جولائی ۲۰۱۴ء] بہت خوب...آپ واقعی دیانت دارانہ تنقید سے بخوبی واقف اور اس پر عمل پیرا ہیں۔

مدھیہ پردیش میں اردو تحقیق (مختار شمیم):

سہیل احمد صدیقی [۲۹ اکتوبر ۲۰۱۴ء] بہت جامع اور بھر پور تعارفی تبصرے کے لیے مبارکباد۔
[۱۶ اگست ۲۰۱۵ء] بہت عمدہ موضوع پر جامع تبصرہ ہے۔ کاش مجھے یہ کتاب نصیب ہو جائے۔

بیرونی ممالک کے شاھکار افسانے (رفیق شاہین):

سہیل احمد صدیقی [۳۱ جولائی ۲۰۱۵ء] بہت عمدہ تعارف و تبصرہ فرمایا ہے آپ نے۔ ہمیشہ کی طرح۔

اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ (ڈاکٹر سلیم احمد رضوی):

سہیل احمد صدیقی: [۳/اگست ۲۰۱۵ء] بہت خوب، منفرد موضوع پر منفرد کتاب۔ اور اس پر آپ کا منفرد تبصرہ مستزاد۔

ادراک اور امکان کے مابین (ڈاکٹر محمد کلیم ضیا):

سہیل احمد صدیقی [۲۶ اگست ۲۰۱۵ء] حسب معمول بہت خوب اور برمحل تبصرہ ہے۔

عبدالاحد آزاد -تحقیقی آئینے میں :(اے این پرشانت)

اومکار کول: [بلاگ، بدکی کی دنیا] کتاب پر ایک بہت ہی عمدہ تبصرہ ہے۔ میں نے یہ کتاب پہلے ہی پڑھی ہے۔

نظمیں:

برسوں پہلے:

نصیر احمد ناصر: [۴ نومبر ۲۰۱۰ء] بڑی دل گداز نظم ہے، اداسی اور ناسٹلجیا میں ڈوبی ہوئی۔ بس زندگی ایسے ہی ہے دیپک صاحب!

سید پرویز احمد: [۴ نومبر ۱۰ء] پھونک سے سحر بنا دیتی ہیں پتھر یادیں۔ آپ کی نظم میں بھی وہ سحر، وہ جادو ہے جو انسان کو دور بہت دور یادوں کے دھندلکوں میں لے جا کر بنا دیتی ہیں پتھر، امٹ اور امر۔

اینی شاہ: [۵ نومبر ۱۰ء] دل گداز نظم لکھی ہے آپ نے۔ مجھے ایک شعر کہنے کی اجازت دیجیے۔

؎ اک بار بچھڑ گیا جو وہ پھر نہ مل سکا   اے دوست تیرے شہر میں کتنا ہجوم ہے۔ (نامعلوم)

ابرار مجیب: [۲۲ اگست ۲۰۱۱ء] اچھی المیہ نظم ہے، جمالیاتی طور پر خوبصورت۔

شفیق شاہ: اچھی لگی۔ پر آج نم آنکھوں سے جو دیکھتا ہوں/ دنیا کی بھیڑ میں کھو چکی کہیں۔

اجے مالوی: بہت لاجواب نظم ہے۔

فیض احمد فیاض۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ شاعری بھی کرتے ہیں۔ بہت خوب۔

ہنڈو وجے: [۱۷ فروری ۲۰۱۲ء] بہت خوب! ماشا اللہ، بڑے ہی انداز میں تیر نشتر چلاتے ہیں آپ۔ اندازِ بیان آپ کا دل چیرتا ہے۔ یہیں کہیں ہم آپ سے ملے تھے کبھی/ نہ جانے کس موڑ پر بچھڑ

گیئے ہم کہیں/ قدرت کی بے رخی سے بے خبر/ بکھر گیئے ہم کس قدر/ نہ تم جانو نہ ہم جانیں۔ گاڈ بلیس!

قاسم بن ظہیر: ۱۷ فروری ۲۰۱۲ء] آپ کی اس نظم کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ دنوں کے بعد آپ کی افسانہ نگاری پر آپ کی نظم نگاری غالب آجائے گی (اگر نظم پر قرار واقعی ملتفت رہے) گو کہ آپ کی پہچان ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے مگر (اس نظم کو پڑھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کے سینے میں ایک افسانہ نگار سے زیادہ ایک شاعر کا دل دھڑ کتا ہے۔ آپ کی یہ نظم اس موضوع پر حرف آخر ہے۔ ایسی بے نظیر نظم پیش کرنے کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ آمین۔

سنجیو ہنگوا سیہ: [۱۶ فروری ۲۰۱۲ء] بہت اچھی نظم۔ آپ کا ہر شبد پتھر دل کو بھی جیونت کر دیتا ہے۔ (ہندی)

وسیم احمد فدا: [۱۵ فروری ۲۰۱۲ء] آج تک میں نے صرف آپ کی نثری جولانیاں ہی دیکھی تھیں، آج پہلی دفعہ آپ کی نظم پڑھی۔ موضوع، تکنیک، اسلوب، زبان و بیان ہر اعتبار سے ایک شاہکار نظم ہے۔ یہ نظم اپنے ارتقا سے آخر تک سحر انداز بیانیہ کی مظہر ہے، کلائمکس تک آتے آتے نظم اپنی داد خود وصول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس بہترین نظم کے لیے آپ کی قلمی رفعتوں کو سلام کرتا ہوں۔

اسرار احمد رازی: [۱۳ فروری ۲۰۱۲ء] عمدہ نظم ہے۔ آپ نے کچھ مناظر کو بڑی خوبصورتی سے الفاظ کا پیکر دیا ہے۔ بہت عمدہ۔

نادرا ہما احمر: خوبصورت!

رفیق راز: [۲۷ اگست ۲۰۱۱ء، فیس بک] بہت ہی متاثر کرنے والی نظمیں ہیں۔ (انگریزی)

بابا سچ بولو تم آج :

قاسم بن ظہیر: [۲۷ فروری ۲۰۱۲ء] بہت عمدہ نظم ہے۔ تہنیت قبول فرمائیں۔ میں آپ کو صرف بحیثیت افسانہ نگار جانتا تھا، یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ افسانہ نگاری کے علاوہ نظم نگاری بھی کرتے ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ممتاز نازاں: [۱۴ دسمبر ۲۰۱۱ء] واہ، بہت خوب۔ دیدہ زیب بھی ہے۔ اور تسکین روح بھی۔

اٹل پرکاش ترویدی: [۱۳ دسمبر ۲۰۱۱ء] خوب، بہت عمدہ، سندر لکھا ہے۔ اور آگے جیسی گفتگو

ہوئی تھی آپ سے آدم اور حوا کی جنت سے رخصتی پر میرا ایک نظریہ ہے۔ آپ کو بتاؤں گا۔ (ہندی)

للت امباردار: [۱۲ دسمبر ۲۰۱۱ء] فکر انگیز نظم جوان لوگوں کی کسمپرسی کی تصویر پیش کرتی ہے جنھیں جبراً اور بہیمی طور پر اپنی دھرتی سے بے دخل کر دیا گیا۔ (انگریزی سے ترجمہ)

نادر انا: [۱۲ دسمبر ۲۰۱۱ء] بہت سچا کلام، بدکی صاحب!

عالم خورشید: [۱۱ دسمبر ۲۰۱۱ء] واہ... آپ نے تو حیران کر دیا۔ اچھی نظم ہے، بے حد رواں اور پوری طرح بحر میں۔ بس ایک آدھ جگہ لکنت کا احساس ہوا لیکن وہ بھی کوئی خاص نہیں۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے اندر کے شاعر کو ڈھونڈ نکالا۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

بشیر بڈگامی: [۱۱ دسمبر ۲۰۱۱ء] خوبصورت نظم ہے اگر چہ بقول عالم خورشید کہیں کہیں لکنت ہے۔ ایک آدھ نظر ثانی سے بہتری کی توقع ہے۔ نظم کا آہنگ متاثر کن ہے اور اس کے امپیکٹ میں اضافہ کرتا ہے۔ کہیں کہیں بڑی زبردست روانی ہے۔ نظم کا حزنیہ لہجہ خوب ہے۔ بحیثیت مجموعی ایک کامیاب نظم ہے۔

وجے بدکی: [۱۱ دسمبر ۲۰۱۱ء] بہت ہی خوبصورت نظم۔ ایک شاعر کے لباس میں اتنے ہی جاذبِ نظر ہو جتنے ایک افسانہ نگار کے روپ میں۔ ہر فن پر آپ کی گرفت مضبوط ہے۔ آفرین!!!

کے ایم خالد: [۲۳ دسمبر ۲۰۱۱ء] خیالات کی اڑان اوجِ ثریا پر ہے۔

منوج ابودھ: [۱۶ دسمبر ۲۰۱۱ء] بہت خوب ہے۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ساتھ ساتھ ہندی دیوناگری میں بھی دیں۔

اے میرے بھیشم پتامہ:

نینا سپرو ترسل (نامور گلوکار): [۳۱ اگست ۲۰۱۱ء، فیس بک] سمویدھناؤں سے پری پورن اس ویتھا کتھا کی جتنی پرشنسا کروں، کم ہے۔ آج دو دن بعد ایف بی پر آنے کا سمے ملا تو سب سے پہلے آپ کی کویتا پڑھی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ (ہندی)

ستیندر سینگر: [۲۰ ستمبر ۲۰۱۱ء، فیس بک] تم اس وقت بس دیکھ رہے تھے/ بے بس اور لاچار کھڑے تھے/ بھیشم پتامہ کھڑے ہو جیسے...... واہ کیا بات ہے۔ ہم سب جیون میں کئی بار بھیشم پتامہ بنتے ہیں.... بے بس اور لاچار..... شاید اسی کا خمیازہ یہ دیش بھوگ رہا ہے۔

ابرار مجیب:[۲۶/اگست ۱۱ء فیس بک] مہابھارت کے کرداروں کے پس منظر میں آج کا المیہ بہت ہی فنکارانہ مہارت سے بیان کیا ہے آپ نے ۔ایک اچھی نظم کی تخلیق پر آپ کو مبارکباد۔

وسیم حیدر ہاشمی:[۲۶/اگست ۱۱ء فیس بک] ایسی جاذب اور جالب تحریر کم ہی نظر آتی ہے۔

رضیہ مشکور:[۲۸/اگست ۱۱ء، فیس بک] سلام مسنون بدکی صاحب۔نظم خوب ہے۔وہ جو تاریخی پس منظر اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے اور جو لفظوں کا انتخاب ہوا ہے بہت خوب ہے۔

اقبال نیازی:[۲۶/اگست ۱۱ء] شاندار نظم ہے......اسے اردو، ہندی کے رسائل میں بھی چھپنا چاہیے۔

عالم خورشید:[۲۵/اگست، فیس بک] بہت خوب جناب۔دل کو چھو لینے والی نظم۔واہ!!!

فاطمہ زہرہ جبیں:[۲۶/اگست، فیس بک] بہت خوب۔ایسی نظم جو ناامیدی کو امید کی کرن دیتی ہو اور دل کو چھوتی ہو۔داد قبول کیجیے۔بے کتبہ قبروں میں دبا ہوا!

آفتاب احمد آفاقی: [۲۶ اگست، فیس بک] عہد حاضر کا منظر نامہ ہے۔

پروین طاہر:[۲۶/اگست، فیس بک] بہت خوب دیپک، ہندستانی متھ سے آپ نے ایک علامتی نظم تخلیق کی ہے۔دل کو چھو لینے والی نظم ہے۔

پرویز بلگرامی: بہت خوب۔دل کو چھوگئی۔

وہ کہانی بھول جا

وجے بدکی:[۱۱دسمبر ۲۰۱۱ء] الفاظ کو جس انداز سے تحریر کی لڑیوں میں پرویا گیا ہے اس کی ستائش کیے بنا نہیں رہا جا سکتا ہے۔بہت عمدہ!!!

دیپک بدکی کی شخصیت اور فن پر مضامین

افسانوں کا بادشاہ : دیپک بُدکی (ایم اے حق):

اقبال حسن آزاد:[۱۱/اگست ۲۰۱۱ء] بے شک، دیپک بُدکی صاحب ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔...[۱۷اگست ۲۰۱۱ء] دیپک بُدکی کی فن افسانہ نگاری پر مضبوط گرفت ہے اور وہ واقعے کو افسانہ بنانے کا

گر اچھی طرح جانتے ہیں۔

پرویز ملک زادہ: [۱۱ راگست ۲۰۱۱ء] میرا تو شروع سے ہی یہ خیال ہے۔ میں ڈاکٹر حق کی باتوں کی تائید کرتا ہوں۔

ارشد نیاز: [۱۳ راگست ۲۰۱۱ء] دیپک بُدکی کی کہانیوں سے یہ ثابت کرنا کہ ان کا رشتہ کس کس سے زیادہ استوار ہے، ایک اچھی کوشش ہے۔ میں جہاں تک جانتا ہوں کہ ہر کہانی کے کردار کی زبان سے فن کار ہی بولتا ہے۔ وہی وجود میں آتا ہے اور وہی اپنے آپ کو اختتام تک پہنچاتا بھی ہے۔ کسی فن کار کی کہانیوں سے ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اس کے وجود کے کارخانے میں کون سا سامان تیار ہو رہا ہے۔ دیپک جی میری نظر میں ایک منجھے ہوئے کہانی کار ہیں۔ ان کی کہانیاں سماج کی آئینہ ہوتی ہیں اور وہ ان کہانیوں سے جو پیغام قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں، وہ آسانی سے پہنچا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں الجھاو نہیں ہے، اور نہ وہ لفظوں کے سہارے دقیانوسی محل تیار کرتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں اور آسانی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

ایوب سلامت: [۱۶ راگست ۲۰۱۱ء] حق صاحب کا تبصرہ پڑھ کر آپ کے افسانے پڑھنے کا اشتیاق بڑھ گیا ہے۔ آپ اگر اپنے افسانے جو فیس بک میں موجود ہیں ٹیگ کر دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔

فاروق نازکی: [۱۶ راگست ۲۰۱۱ء] میرے لیے دیپک بُدکی ایک خودتراشیدہ پیکر ہے۔ اس نے پورا تخلیقی عمل اپنی نوک پلک درست کرنے میں صرف کیا۔ اپنی تعمیر کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

اسحاق ساجد: [۱۰ راگست ۲۰۱۱ء] ماشا اللہ، ڈاکٹر حق صاحب نے حق ادا کیا ہے اور بُدکی صاحب کے کچھ پہلو جو نظروں سے بعض لوگوں سے اوجھل تھے وہ سامنے آئے ہیں۔ میرے نزدیک محترم بدکی صاحب ان چند افسانہ نگاروں میں شامل ہیں کہ افسانہ پڑھنے کے مدتوں بعد بھی افسانے کا لطف اسی طرح رہتا ہے جیسے آپ اب پڑھ رہے ہوں۔ میں نے ان کے کئی افسانے پڑھے ہیں۔ آپ کمال کا لکھتے ہیں۔ ان کا ایک آدھ نہیں بلکہ درجنوں ایسے افسانے ہیں جو ہمیشہ دل پر اثر چھوڑتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

سوری میڈم

بہت پرانا واقعہ ہے جو میرے ذہن پر اس دن سے سوار ہے جس دن یہ وقوع پذیر ہوا تھا۔ کئی بار اس سانحہ نے میرے ذہن پر دستک دی۔ ''تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے قرطاس پر ضرور اتارو گے پھر بھی اب تک ٹال مٹول کرتے رہے۔''

یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس حادثے کو کئی بار قلم بند کرنے کی شعوری کوشش کی مگر جب بھی قلم ہاتھ میں اٹھاتا ہوں سارا وجود لرز جاتا ہے۔ کچھ مہیب سے سائے میرے دل و دماغ کا احاطہ کرتے ہیں۔ آنکھیں یکا یک بند ہو جاتی ہیں اور ایک ننھی منی پیاری سی بچی بانہیں پھیلا کر میرے سامنے ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ مدد کے لیے چیختی ہے، چلّاتی ہے اور پھر بے بس ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ وہ زبان سے کچھ بولنے کی مسلسل کوشش کرتی ہے مگر خوف و وحشت کے باعث بول نہیں پاتی۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آتا ہے اور انگلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ قلم آگے بڑھنے سے انکار کرتا ہے اور خود بخود رک جاتا ہے۔ میں قلم کو اپنی جگہ پر رکھنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہوں اور پھر خیالوں میں گم ہو جاتا ہوں۔

میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوا ہے۔ کئی بار ہی کیوں، بیسیوں بار ہوا ہے۔ دن میں، رات میں، جاگتے ہوئے، سوتے ہوئے... کوئی میرے ذہن پر دستک دے کر مجھے پکارتا ہے، ''اٹھو کہانی لکھو... اٹھو... بہت دیر ہو گئی... اب تو لکھ ڈالو'' میں اٹھتا ہوں، ہاتھ میں قلم اور کاغذ اٹھاتا ہوں۔ لیکن یکا یک وہی کپکپی... وہی لرزش..... وہی تھرتھراہٹ محسوس کرتا ہوں اور پھر قلم میز پر رکھ دیتا ہوں۔ اب تک میں نے ایک سو سے زائد کہانیاں رقم کی ہیں لیکن ایسی کیفیت سے کبھی دو چار نہیں ہوا۔

اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔ مجھے وہ واردات پھر یاد آئی ہے جو مجھے بار بار تڑپاتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کو قلمبند کر کے ہی دم لوں گا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

نیند آہستہ آہستہ آنکھوں سے غائب ہوتی جارہی ہے۔ میں بستر ہی میں اٹھ بیٹھا ہوں اور کہانی لکھنے لگا ہوں

اس کو شاید کہانی کہنا غلط ہوگا۔ یہ ایک سچّا واقعہ ہے جو برسوں پہلے پیش آیا تھا۔ میں ان دنوں بریلی میں تعینات تھا۔ میری بیوی ایک مقامی سکول میں پڑھاتی تھی۔ صبح سویرے اخبار پڑھنے لگا تو ایک نہایت ہی دل خراش خبر پر آنکھ ٹھہر گئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بیوی کو آواز دی اور اس خبر کے بارے میں پوچھ لیا۔ مگر اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ البتہ اس روز وہ سکول سے جلدی واپس آئی اور جونہی میں آفس سے لوٹا تو ایسے مخاطب ہوئی جیسے میرا ہی انتظار کر رہی ہو۔ ''آپ نے صبح جس خبر کے بارے میں پوچھا تھا، سکول میں دن بھر صرف اسی کا چرچا ہوتا رہا۔ پرنسپل نے آدھی چھٹی کے بعد ہی سکول بند کرنے کا حکم دیا۔''

پھر اس نے سارا واقعہ بیان کیا۔ کچھ معلومات تو مجھے پہلے ہی اخبار سے معلوم ہو چکی تھیں۔ اس لیے دونوں بیانات کا موازنہ اور تقابل کر کے سارے ماجرے کا تصوراتی خاکہ کھینچ لیا۔

میری آنکھوں کے سامنے بلیو بیلز سیکنڈری سکول کی چوتھی جماعت کا بڑا سا کمرہ نمودار ہوا۔ ڈیسکوں کے پیچھے چھوٹی چھوٹی کرسیوں پر سفید بلاؤز اور نیلی سکرٹ میں ملبوس پریوں ایسی نرم و نازک لڑکیاں براجمان تھیں۔ چوٹیاں بندھی ہوئیں، کسی کی دو اور کسی کی ایک، ہنستی کھیلتی معصوم بچیاں، بالکل گلاب کی کلیوں جیسی، خوبصورت اور بے ریا۔ سبھی لڑکیاں چڑیوں کی مانند چہچہا رہی تھیں۔ شور وغل اتنا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پھر ایک دم ہر طرف خاموشی سی چھا گئی۔ لڑکیوں کے لب سل گئے اور وہ اپنی وردی کو ٹھیک ٹھاک کر کے کرسیوں پر تن کر بیٹھ گئیں۔

سامنے دروازے سے ایک فربہ اندام، رعب دار چہرے مہرے والی، ساڑی میں ملبوس، بال جوڑے میں گندھے ہوئے، آنکھوں پر ایک بڑی سی عینک چڑھائے، ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک لگائے، ایک ہاتھ میں پرس اور دوسرے ہاتھ میں چندکا پیاں لیے، تیس پینتیس سال کی عورت اندر آئی۔ یکا یک جماعت کی ساری لڑکیاں کھڑی ہوگئیں اور پھر آرڈر ملتے ہی واپس اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ استانی کا نام مالتی تومر تھا اور وہ ایک نو دولتیے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بی اے بی ایڈ پاس کر کے والدین نے مقابلے کا نو دولتیا گھر ڈھونڈ کر اس کی شادی کر لی۔ سسرال میں ساس سسر اور نند دیور تھے مگر سبھی نے اس کو آنکھوں پر بٹھا دیا۔ گھر میں ایک کے بدلے دو نوکر تھے اور ڈرائیور الگ۔ نوکر گھر کا کام کر لیتا اور نوکرانی دو بچوں کو

سنبھال لیتی۔ پھر ساس بھی تو تھی جس نے گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ مالتی کو بچوں کے بڑھنے کا احساس ہوا نہ تجربہ۔ چند مہینے دودھ پلایا پھر اشرافی ماؤں کی طرح وہی لیکٹوجن اور سیری لیک ڈبے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

کچھ برس گزرنے کے بعد مالتی کے بدن میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ بوریت سی محسوس کرنے لگی۔ شام کو کٹی پارٹیوں میں جایا تو کرتی تھی مگر وہاں سبھی سہیلیوں سے یہی سننے کو ملتا تھا کہ عورت کو گھر میں قید نہیں ہونا چاہیے، دن میں کوئی کام کرنا چاہیے۔ موجودہ زمانے میں عورت کسی کی غلام نہیں ہے، اسے اپنے ڈھنگ سے جینے کا پورا پورا حق ہے۔ پانی کی بوند بوند گرنے سے تو پتھر پر بھی نشان پڑ جاتا ہے۔ مالتی نے بھی فیصلہ کرلیا کہ تفریح کے لیے ہی سہی، وہ کسی سکول میں ضرور نوکری کرلے گی۔ اثر ورسوخ تو تھا ہی، اِدھر دماغ میں خیال آیا، اُدھر بلیو بیل سکول کے انتظامیہ نے جوائن کرنے کی دعوت دی۔ سکول میں بھی وہ اپنی ہی دنیا میں مست رہتی تھی۔ بچے تو بس اس کے لیے کھلونے تھے، ان کے ساتھ کچھ گھنٹے کھیل لیتی اور پھر واپس اپنے گھر۔

اس دن کا وہ آخری پیریڈ تھا۔ دوسرے روز سے چار دن کے لیے سکول بند ہونے والا تھا۔ سنیچر، اتوار اور دو چھٹیاں! چھٹیوں کا کیا، ہندستان میں ہر روز کوئی نہ کوئی تیوہار منایا جاتا ہے۔ مالتی نے طالبات کے ماہانہ ٹیسٹ کی کاپیاں لوٹا دیں اور جن طالبات کے بہت کم نمبر آئے تھے ان کی سرزنش کی۔ نیہا نے تو کمال ہی کر دیا تھا۔ نوٹ بک پر کچھ لکھا ہی نہ تھا۔ مالتی اسے بہت ناراض ہوگئی۔ پہلے کھڑے ہونے کو کہا۔ نیہا کھڑی ہوگئی۔ پھر اسے سوال پوچھا "نالج کے سپیلنگ بتاؤ؟"

نیہا چپ چاپ کھڑی رہی اور کچھ بھی نہ بولی۔ اس نے آج بھی سبق یاد نہیں کیا تھا۔ کرتی بھی کیسے؟ ٹیسٹ سے ایک روز پہلے دادی گھر پر باتھ روم میں نہاتے نہاتے گر پڑی تھی اور اس کی داہنی ٹانگ ٹوٹ گئی تھا۔ وہ کراہ رہی تھی۔ والدین اسے فوراً اسپتال لے گئے جب کہ پریشان نیہا اکیلی ہمسائے کے گھر میں پڑی رہی۔ کچھ پڑھ ہی نہ پائی۔ پھر سکول کا کام کرنے میں ماں اس کی رہنمائی کرتی تھی مگر وہ تو رات بھر اسپتال میں رہی۔ دادی اب بھی پلستر باندھے ہسپتال میں پڑی ہوئی ہے۔

ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی نیہا۔ بڑے نازوں میں پلی ہوئی۔ والدین نے کتنے خواب سنجوئے

تھے اپنی بیٹی کے لیے ۔ حالانکہ متوسط طبقے کی اڑانیں محدود ہوتی ہیں ۔ بیٹی اچھی تعلیم پائے ، اچھی نوکری کرے اور پھر اچھے گھر میں بیاہ کر کے چلی جائے ۔ اس سے آگے تو وہ کبھی سوچتے بھی نہیں ۔ انھی خوابوں کی تعبیر کے لیے انھوں نے بڑے جتن کر کے اس کو شہر کے اس نامور سکول میں داخل کروایا تھا ۔ داخلے کے وقت وہ محض پانچ سال کی بچی تھی ۔ انٹرویو ہوا ۔ اسے اپنا اور والدین کا نام پوچھا گیا اور اس نے توتلی زبان میں پھٹا پھٹ جواب دیا تھا ۔ والدین سے بھی کئی سوالات پوچھے گئے جیسے ان کا ہی داخلہ ہونے والا ہو ۔ بے چاروں نے جوں توں کر کے سوالوں کے جواب دیے ۔ پھر فیس اور تعمیری فنڈ کی طلب ہوئی ۔ کُل ملا کر تیس ہزار آفس میں جمع کیے ۔ کچھ دنوں کے بعد نیہا کا ایڈمشن ہوا اور والدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا ۔ نیہا کو سکول بھیجنے میں جو خرچہ برداشت کرنا پڑ رہا تھا اس کے لیے والدین کو اپنا پیٹ کاٹنا پڑا ۔ سب ضروری اور غیر ضروری اخراجات میں کٹوتی ہونے لگی ۔ یہ سلسلہ چار سال تک یونہی چلتا رہا اور نیہا چوتھی جماعت تک پہنچ گئی ۔ روپیہ پانی کی طرح بہہ تو رہا تھا لیکن تسلی اس بات کی تھی کہ سال کی اخیر میں سند مل جاتی تھی جس میں لکھا ہوتا تھا کہ نیہا امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئی ہے ۔

''اچھا ، ٹیچر کے سپیلنگ بتاؤ '' معلّمہ نے اپنی آواز کو اور زیادہ بھاری اور کرخت بنا کر پوچھ لیا ۔

نیہا پھر بھی خاموش اپنی ٹیچر کو دیکھتی رہی اور اس کے منہ سے کوئی لفظ بھی نکل نہیں پا رہا تھا ۔

مالتی تومر کا پارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا ۔ ویسے ہی جھلائی ہوئی تھی ۔ صبح گھر سے نکلتے وقت اس نے اپنے پتی کو سکول سے گھر لے جانے کے لیے کہا تھا مگر اس نے منع کیا ۔ شام کو ریل گاڑی سے ڈیرہ دون جانا تھا ۔ ٹکٹیں بک ہو چکی تھیں ۔ وہاں سے مسوری جانے کا پروگرام بن چکا تھا ۔ ابھی اسے گھر جانا تھا ، پیکنگ کرنی تھی ، بچوں کو تیار کرنا تھا اور پھر شام کو چھ بجے ریلوے سٹیشن پہنچنا تھا ۔ ویسے بھی آخری پیریڈ تھا اور اسے گھر جانے کی ہمیشہ جلدی پڑی رہتی تھی ۔ نیہا کی مسلسل چُپّی نے اس کے ذہن کو مختل کر دیا ۔ مالتی نے اس معصوم بچی کو پھٹکارتے ہوئے کہا ۔ ''لاسٹ رو میں چلی جاؤ اور دیوار کی طرف منہ کر کے وہاں بینچ پر کھڑی ہو جاؤ ۔ جب تک میں نہ کہوں گی ، نیچے نہیں اترنا ''

نیہا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر اُمڈ آیا ۔ مارے خوف کے وہ کچھ بھی نہ کہہ پائی ۔ چپ چاپ اپنی قطار سے باہر نکل کر آخری بینچ پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی اور دیوار کی طرف اپنا منہ کر لیا ۔

مالتی تو مرنیا سبق پڑھانے میں منہمک ہوگئی۔ قریب بیس منٹ کے بعد سکول کی آخری گھنٹی بج گئی اور ساری لڑکیاں کمرے سے یوں دوڑتی ہوئی باہر نکل گئیں جیسے کسی جیل خانے سے قیدی چھوٹ گئے ہوں۔ مالتی کو ان سے بھی زیادہ تعجیل تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا پرس اٹھایا اور طالبات سے پہلے کمرے سے باہر چلی گئی۔ کسی نے مڑکر بھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی کو نیہا کی طرف دھیان گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سارا سکول خالی ہوگیا۔ نیہا کلاس کے آخری بنچ پر دیوار کی طرف منہ کر کے خاموش ایسے کھڑی رہی جیسے ڈوروتھی براؤن ہیمانز کی نظم میں کسا بلانکا جلتے ہوئے عرشۂ جہاز پر کھڑا رہا تھا۔ اس کو اتنا تو احساس ہو رہا تھا کہ سارا کلاس خالی ہوتا جا رہا ہے مگر وہ مڑنے یا بینچ سے اترنے سے ڈر رہی تھی کہ کہیں ٹیچر اور ناراض نہ ہو جائے اور سزا بڑھا دے۔

کچھ دیر کے بعد سکول کا چوکیدار کمروں کے دروازے بند کرنے کے لیے گشت لگانے لگا۔ چنانچہ کمروں کی کھڑکیاں رات بھر کھلی رہتی تھیں اس لیے اس کو کمرے کے اندر جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بس کمرے کے دروازے پر پہنچتا گیا، دونوں پٹ بند کردئے اور پھر باہر سے کنڈی لگادی۔ صرف پرنسپل کے کمرے اور سائنس لیبارٹری کی پوری طرح سے چیکنگ کرلی۔ چوکیدار اس کمرے کے پاس بھی پہنچا جہاں نیہا سزا بھگت رہی تھی۔ چنانچہ اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی اس لیے اس نے دروازہ بھیڑ کر باہر سے کنڈی لگادی۔

آہستہ آہستہ کلاس روم میں اندھیرا بڑھتا گیا اور نیہا گھبرانے لگی۔ تھوڑی بہت چاندنی کی روشنی چھن چھن کر کمرے میں اب بھی آرہی تھی۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ زیادہ دیر بنچ پر کھڑی نہ رہ سکی۔ وہ رونے لگی۔ زاروقطار رونے لگی۔ مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ سارا سکول خالی ہو چکا تھا۔ چوکیدار ہاتھ میں ڈنڈا لیے نیچے بہت دور مین گیٹ پر سٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ اگلے چار دن سکول بند تھا۔

معصوم نیہا نے ہاتھ میں چاک اٹھایا اور کرسی پر چڑھ کر بلیک بورڈ پر ہندی میں لکھنے لگی۔

''ممی... ممی... مجھے ڈر لگ رہا ہے!''

''پاپا... پاپا... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے!''

''سوری میڈم... سوری میڈم... اب میں پاٹھ یاد کر کے آیا کروں گی... میڈم مجھے معاف

کردو...سوری میڈم...سوری میڈم...میں کل سے کبھی بنا پاٹھ یاد کیے نہیں آؤں گی...سوری میڈم...سوری میڈم...سوری میڈم.... مجھے گھر جانے دو...میڈم مجھے گھر جانا ہے...میڈم مجھے ڈر لگ رہا ہے....سوری میڈم...سوری میڈم.....!''

''ممی مجھے بچاؤ.... پاپا مجھے یہاں سے لے جاؤ۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پاپا۔آپ کہاں ہو؟''

''پاپا،جلدی آجاؤ....!''

وہ بلیک بورڈ پر تب تک لکھتی رہی جب تک پورا بلیک بورڈ اس کی لکھی ہوئی عبارت سے بھر گیا۔ اب بلیک بورڈ پر کہیں کچھ بھی لکھنے کے لیے جگہ نہ تھی۔

بہت دیر کے بعد تھک ہار کر نیہا وہیں فرش پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔

اُدھر گھر میں ماں باپ دونوں پریشان ہوئے کہ نیہا سکول سے واپس کیوں نہیں آئی؟ جس رکشا پر وہ گھر لوٹتی تھی اس سے رابطہ کیا مگر رکشا والے نے بتایا کہ بٹیا تو میرے ساتھ واپس گھر نہیں آئی ۔میں نے تو بہت دیر تک اس کا انتظار کیا۔پھر میں نے سوچ لیا شاید آپ لوگ خود ہی اس کو گھر لے گئے ہوں گے۔سکول میں دریافت کرنے گئے تو چوکیدار نے بتایا کہ سارے بچے کب کے چلے گئے۔پرنسپل سے رابطہ کیا تو اس نے بھی کورا سا جواب دیا کہ سارے بچے چھٹی ہونے کے ساتھ ہی چلے جاتے ہیں۔ کوئی سکول میں کیسے رہ سکتا ہے اور پھر رہے گا بھی کیوں؟ کسی کے وہم وگماں میں بھی نہ تھا کہ وہ معصوم بچی سکول میں سزا کاٹ رہی ہے۔

جس معلّمہ نے سزا سنائی تھی وہ خود مسوری کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔والدین کو سزا کے بارے میں کسی نے بتایا بھی نہیں۔ان کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔مایوس ہو کر والدین نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔انھوں نے آشواسن دیا کہ وہ جلدی ہی بچی کا پتا لگائیں گے۔تھانے دار نے ماں باپ سے طرح طرح کے سوالات پوچھے تاکہ کوئی سراغ مل جائے مگر وہاں نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔پھر کہنے لگے آپ گھبرائے نہیں ہم ایک دو روز میں اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔بہت ممکن ہے کسی نے کچھ لالچ دے کر اغوا کر لیا ہو۔علاوہ ازیں انھوں نے والدین کو خبردار رہنے کو کہا کہ اگر کسی کا فون آتا ہے یا فروتی کی مانگ ہوتی ہے

تو پولیس کو ضرور خبر کر دیں۔ والدین گھر جا کر ٹیلی فون کے پاس یوں بیٹھ گئے جیسے ابھی گھنٹی بجنے والی ہو۔ کبھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو دونوں چیتے کی طرح اس پر لپکتے۔ پھر نراش ہو کر واپس اپنی جگہ بیٹھ جاتے۔

اُدھر نیہا بے ہوش ہو کر فرش پر کیا گر پڑی کہ پھر کبھی نہیں اٹھی۔ چار روز پڑے پڑے اس کا بدن اینٹھ گیا تھا۔ سارے جسم کا رنگ کچھ عجیب سا زرد ہو گیا تھا۔ اس کے بند مٹھی میں وہی چاک تھا جسے اس نے سیاہ تختے پر لکھ لکھ کر اپنی جان گنوائی تھی۔

ماں باپ نے ایک ایک لمحہ، ایک ایک گھڑی اور ایک ایک دن کیسے گزارے اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ البتہ انھیں موہوم سی امید تھی کہ کوئی نہ کوئی نیہا کی خبر ضرور لے کر آئے گا۔ وہ اپنی ساری جائیداد اغوا کرنے والے کو سونپنے کے لیے تیار تھے اگر وہ ان کی نیہا لوٹا دیتا۔ مگر کہیں سے کوئی فون نہیں آیا۔ نیہا کے پتا جی ہر گھنٹے پولیس سٹیشن فون کر کے پوچھ لیتے اور دن میں ایک دو بار خود بھی پولیس سٹیشن چلے جاتے ۔ وہ پولیس کے اعلیٰ افسروں سے بھی ملے لیکن ناکام رہے۔

بدھوار کی صبح حسب معمول سکول کھولا گیا اور صفائی کرمچاری کمروں کی صفائی میں جٹ گئے۔ جونہی ہاتھ میں جھاڑو لیے ایک صفائی کرمچاری نے چوتھی جماعت کے کمرے میں قدم رکھا، اندر سے سڑاند کے بھبھکے نے اس کا استقبال کیا۔ دفعتاً اس کی نظریں سامنے بلیک بورڈ کے پاس فرش پر پڑی ہوئی ایک چھوٹی سی لڑکی کی لاش پر پڑی۔ وہ گھبرا گیا اور دوڑتا بھاگتا چوکیدار اور دوسرے صفائی کرمچاریوں کو بلا کر لے آیا۔ پھر پرنسپل، پولیس اور نیہا کے والدین کو خبر کر دی گئی۔ کمرے کے اندر جاتے ہی سب کی نظریں فرش پر پڑی ہوئی معصوم نیہا پر پڑیں جو ابدی نیند سو رہی تھی۔ پھر ان کی نظریں بلیک بورڈ پر پڑیں جس پر اس معصومہ نے بار بار ایک ہی بات دہرائی تھی۔

"ممی... ممی... مجھے ڈر لگ رہا ہے! پاپا... پاپا... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے! سوری میڈم... سوری میڈم... اب میں پاٹھ یاد کر کے آیا کروں گی۔ میڈم مجھے معاف کر دو... سوری میڈم... سوری میڈم... میں کل سے کبھی بنا پاٹھ یاد کیے نہیں آؤں گی... سوری میڈم... سوری میڈم... سوری میڈم... مجھے گھر جانے دو.. میڈم مجھے گھر جانا ہے... میڈم مجھے ڈر لگ رہا ہے.... سوری میڈم... سوری میڈم.....! ممی مجھے بچاؤ... پاپا مجھے یہاں سے لے جاؤ... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پاپا... آپ کہاں ہو؟ پاپا... جلدی آ جاؤ!" ☆☆☆

اب میں وہاں نہیں رہتا

ڈاکیہ تین بار اس ایڈرس پر مجھے ڈھونڈ نے گیا تھا لیکن تینوں بار مایوس ہو کر لوٹ آیا۔

اس نے دروازے پر کئی بار دستک دی تھی، بلند آواز میں میرا نام پکارا تھا اور پھر دائیں بائیں دیکھ لیا تھا کہ شاید کوئی پڑوسی آواز سن کر گھر سے باہر نکل آئے اور اسے بتلا دے کہ میں گھر میں موجود ہوں یا نہیں اور اگر نہیں ہوں تو کہاں مل سکتا ہوں۔ مگر کوئی پڑوسی نہ گھر سے باہر نکلا اور نہ ہی کسی نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔

شاید اڑوس پڑوس کے سبھی گھر خالی تھے۔ سارا محلّہ قبرستان کی مانند سنسان پڑا تھا۔ کہاں تو ہر نکڑ پر بے شمار کُتے مل جاتے تھے جو گھروں سے پھینکے ہوئے ٹکڑوں پر پلتے تھے اور کہاں یہ منظر کہ کہیں کوئی کتا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جیسے سبھی کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

میرے مکان سے ٹپکتی ہوئی غمزدہ خاموشی دیکھ کر وہ ہر بار بوجھل قدموں سے واپس مڑ جاتا۔

ایک زمانہ تھا کہ سردی اور گرمی کی چھٹیوں میں بس صدر دروازے پر دستک دینے کی ضرورت تھی کہ دروازے کے دونوں پٹ کھل جاتے اور وہ مجھے اپنا منتظر پاتا۔ اس کو میرا نام لینے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ دستک سن کر ہی میں سمجھ جاتا کہ ڈاکیہ آیا ہوگا۔ پھر دونوں برآمدے میں بید کی کرسیوں پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگاتے اور بہت دیر تک باتیں کرتے۔ وہ طرح طرح کی کہانیاں سناتا۔ عطر چھڑکے لفافوں کی، خون سے لکھے ایڈریسوں کی، منی آرڈر پاتی بیواؤں کی، برسوں بعد لکھے بیٹے کے خطوں کی اور خدا کے نام لکھی گئی چھٹیوں کی۔ ایک عجیب بے نام سا رشتہ تھا ہم دونوں کے درمیان۔ باقی دنوں میں کالج جانے کے سبب گھر پر نہیں ملتا پھر بھی نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں مجھ کو ڈھونڈتی رہتیں۔ میرے خاندان کا کوئی فرد صدر دروازہ کھول کر کہہ دیتا۔ ''وہ آج یہاں پر نہیں ہے۔ کالج چلا گیا ہے۔ آپ اس کی چھٹیاں مجھے دے

دیجیے۔" مانگنے والا اگر گھر میں آیا کوئی مہمان ہوتا تو ہم دونوں کے بیچ کا رشتہ بھی بتلا دیتا۔ دراصل ڈاکیہ میرے رشتے داروں سے مانوس ہو چکا تھا اور ان کو میری ڈاک سونپنے میں سنکوچ نہیں کرتا تھا لیکن غیر شناسا چہرہ سامنے پا کر کچھ ہچکچاہٹ ضرور ہوتی۔ یہ میری ہی ہدایت کا اثر تھا کہ وہ میری ڈاک کسی ایرے غیرے کو نہیں دیتا تھا۔ بہت ایمان دار اور فرض شناس ڈاکیہ تھا۔ یوں بھی دیانت داری اور بھروسے کے اعتبار سے ڈاکیے بے نظیر ہوتے ہیں۔ خط کو دیکھتے ہی مضمون کا اندازہ لگاتے ہیں۔ عطر بیز خط کو مسکراہٹ کے ساتھ تھما دیتے ہیں جبکہ بری خبر والے خط کو انگارے کی مانند اپنے ہاتھ سے جھٹک دیتے ہیں۔

مگر اب.....! اب تو میں وہاں نہیں رہتا۔ میں کہاں رہتا ہوں مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ میرے اپنے جہاں لے جاتے ہیں، چلا جاتا ہوں۔ نئی جگہیں، نئے شہر، نئے ممالک.....! طالب علمی کے زمانے میں ان جگہوں کے نام سنا کرتا تھا مگر وہاں جانے کا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

چار منزلہ لکھوری اینٹوں کا میرا ڈھنڈار مکان، جس کے در و دیوار سے سوندھی سوندھی مٹی اور دیودار کی بو آتی تھی، خاموشی سے ڈاکیے کو تکتا مگر کوئی جواب نہیں دے پاتا۔ دیتا بھی کیسے؟ اسے کیا معلوم تھا کہ میں کہاں رہتا ہوں؟ جس وقت میں اس کو چھوڑ کر گیا تھا سارا مکان اندھیروں میں ملفوف تھا۔ اندھیرا ....گھٹا ٹوپ اندھیرا.....! ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ پھر اس کو میرے جانے کی خبر کیسے ہوتی؟ خود اندھیروں میں گھرا ہوا دوسروں کی خبر گیری کیسے کر سکتا ہے؟ اس روز میں ڈرا سہما، پراسرار خاموشی میں ڈوبا ہوا گھر کا سارا سامان ٹرک میں لاد کر نم آنکھوں سے اپنے مکان سے رخصت ہوا تھا۔ ویسے ہی جیسے گہری نیند میں سوئے ہوئے آدمی کی روح پرواز کر جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ میری اور اس کی آخری ملاقات ہے۔ اس دن کے بعد گھر کا ذرّہ ذرّہ مجھے ڈھونڈتا رہا۔

کتنا سمے بیت گیا ہوگا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ میرے لیے تو وقت اسی لمحے تھم چکا تھا جب میں نے اپنی جائے پیدائش کو خیر باد کہا تھا اور پھر دربدر پھرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وقت بھی کتنا ظالم ہوتا ہے، اپنی رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ کبھی کسی کی فکر نہیں کرتا۔ کون مرتا ہے اور کون جیتا ہے، کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ البتہ مجھے ان لوگوں پر ترس آتا ہے جو انسانوں کو بے گھر کر کے یہ سوچتے ہیں کہ یہ خدا کی خوشنودی کے لیے کیا جا رہا ہے۔ مجھے اس خدا کو دیکھنے کا بڑا ارمان ہے جو خود ہی تخلیق کیے ہوئے انسان کو تباہ و برباد،

بے گھر و بے بس کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ کتنا بڑا ایذا رساں ہوگا وہ خدا جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کی تکلیف و درد سے محظوظ ہوتا ہوگا۔

یہ الگ بات ہے کہ میری زندگی کی گھڑی بند ہو چکی ہے یا پھر مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ پھر بھی کہیں کچھ احساس ابھی باقی ہے جو مجھے ہر روز تاکید کرتا ہے کہ ''تم زندہ ہو''۔ میرے ساتھ جو لوگ رہتے تھے وہ سب بکھر چکے ہیں۔ ہم ایک دو روز میں کہیں نہ کہیں مل ہی جایا کرتے تھے مگر اب تو برس ہا برس تک ہم مل نہیں پاتے۔ کوئی دنیا کے ایک کونے میں جا بسا ہے اور کوئی دوسرے کونے میں۔ بہت برس ہو گئے میں نے کسی کو اپنا ہم راز نہیں بنایا۔ سبھی نے اپنی زندگی کے خالی پن کو دور کرنے کے لیے نئے وضع قطع اپنائے ہیں۔ پھرن کے اندر کانگڑی اٹھائے برف سے ڈھکی سڑکوں کو ناپنے کے بجائے اب وہ ٹی شرٹ اور جینز میں سمندری ساحلوں پر گھومتے پھرتے ہیں۔ امریکا میں مجسمۂ آزادی کے نیچے، فرانس میں آئی فل ٹاور کے اندر یا پھر مصر کے اہرام کے پاس سیلفی لیتے نظر آتے ہیں اور دوسرے روز فیس بک پر پوسٹ کرتے ہیں۔ دیکھنے والے حسرت اور جلن سے سوچتے ہیں کہ کتنے خوش نصیب لوگ ہیں جو دنیا کے خوبصورت مقامات کی سیر کر رہے ہیں۔ کہاں تو کنویں کے مینڈک بنے پھرتے تھے، شہر سے باہر کی دنیا سے نابلد تھے اور کہاں تو یہ بے فکر و بے مدام سیاحت، نہ اپنی خبر اور نہ دنیا و مافیہا کی۔ البتہ کسی کو کیا معلوم کہ فیس بک پر چڑھائی گئی یہ تصویریں جھوٹ بول رہی ہیں۔ یہ سبھی پراگندہ زندگی کو بھولنے کی ناکام کوششیں ہیں۔ تصویریں دیکھنے والے اندر کے گھاؤ کہاں دیکھ پاتے۔ کوئی کسی کے زخم کرید کر تھوڑی ہی دیکھتا ہے۔ میں ان تصویروں کے اندر پل رہی بے بسی، تڑپ اور تنہائی کو محسوس کر سکتا ہوں۔

مصنوعی چہرے، مصنوعی ہنسی اور مصنوعی ٹھاٹ۔ اجنبی ساحل، اجنبی دھرتی اور اجنبی ممالک
.....!

گھر میں تھے تو فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ کبھی راشن گھاٹ سے راشن لانا، کبھی گھاسلیٹ کی خاطر قطار باندھے گھنٹوں کھڑے رہنا، کبھی دکانوں کی بھیڑ سے جوجھنا۔ نانبائی کی دکان، قصائی کی دکان، کنجڑے کی دکان، ادویات کی دکان، غرض ضروریات زندگی کی لمبی چوڑی فہرست اور اتنی ہی دکانیں۔ ہر جگہ قطاریں ہی قطاریں۔ طلب ہی طلب اور رسد کہیں نظر ہی نہیں آتی تھی۔

اب تو فراوانی ہے سب چیزوں کی مگر چین نہیں ہے۔کوئی بے چینی دل کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔سب کچھ دستیاب ہے اور وہ بھی گھر بیٹھے۔ہوم ڈیلوری۔کبھی امیزون،کبھی فلپ کارٹ اور کبھی سنیپ ڈیل۔بس آرڈر کرنے کی دیر ہے کہ سامان گھر پر کوریئر دے کر جاتا ہے۔کوریئر! نہ وردی اور نہ وقت پر دستک۔وقت بے وقت کبھی بھی چلا آتا ہے اور سامان دے کر چلا جاتا ہے۔موبائل بل،گیس بل، کتابوں کا پارسل،گفٹ پارسل۔اور بھی بہت کچھ۔مگر خط نہیں...!

اب خط نہیں آتے ۔وہ خون کو سیاہی بنا کر لکھے گئے خط،وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے خط،وہ آہوں اور اشکوں سے بھرے خط،وہ محبتوں اور نفرتوں بھرے خط،وہ برہ کے گیتوں سے بھرے خط،وہ انتظار کے خط،وہ وصل یار کے خط۔وہ خط اب نہیں آتے۔نہ میرے پاس اور نہ ہی میرے بال بچوں کے پاس۔

آئیں گے بھی کیونکر؟عشق فرمانے کے لیے موبائیل جو ہیں۔خط کے بدلے ای میل جو ہیں۔تصویریں بھیجنے کے لیے وہاٹز اَپ جو ہے۔پھر خط کے لیے کون انتظار کرے۔

اور مجھے اب خط لکھے گا بھی کون؟ یہ سچ ہے کہ ہماری نسل کو اب بھی خط ملنے کی آرزو رہتی ہے۔ خط پڑھنے میں جو مزہ آتا ہے وہ ای میل میں کہاں۔مگر اب تو سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ اب میں وہاں نہیں رہتا۔اور پھر میں نے انھیں اپنا نیا ایڈریس بھی تو نہیں بتایا ہے؟

کیسے بتاؤں کہ میں کہاں رہتا ہوں؟ مجھے میرے بال بچوں نے بانٹ لیا ہے۔کبھی بڑے بیٹے کے پاس تین چار مہینے گزار لیتا ہوں،کبھی منجھلے بیٹے کے پاس اور کبھی چھوٹے کے پاس۔ایک عجیب سا ان کہا سمجھوتا ہو گیا ہے ان کے درمیان۔یہی تین چار مہینے کا! کبھی کبھار بیٹی اپنے پاس بلاتی ہے جب اس کے ساس سسر اپنی بیٹی کے ہاں کچھ مہینے کے لیے چلے جاتے ہیں۔بچپن میں میں نے زندگی اور موت کے درمیان تناسخ کے بارے میں سنا تھا لیکن اس دنیاوی آواگون کا تجربہ بھی ہو گیا۔شاید فطرت کے اصول کے عین مطابق ہے یہ۔موسم بھی تین مہینوں میں بدل جاتے ہیں۔یکسانیت ہوتی تو کتنی اکتاہٹ ہو جاتی۔زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے تغیر بہت ضروری ہے۔یک رنگی تو کھانے کو دوڑتی ہے۔

گذشتہ سال میں نے طے کر لیا کہ میں کچھ دنوں کے لیے اپنے آبائی وطن جاؤں گا اور مرنے

سے پہلے اپنے چھوڑے ہوئے مکان کو نظر بھر دیکھ لوں گا۔ سو میں نے بیٹے سے درخواست کی اور ہم سب چلے گئے۔

شہر میں سب لوگ ہمیں ٹورسٹ سمجھنے لگے ہیں۔ کسی کو یقین ہی نہیں آتا کہ ہم وہاں کے باسکین ہیں، سیاح نہیں۔ کوئی ہمیں پہچانتا بھی نہیں۔ پچیس سالوں میں ایک پوری نسل بدل چکی ہے۔ شاید ہمارے وقت کے لوگ اب نہ رہے ہوں یا پھر بڑھاپے کے باعث گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلتے ہوں۔

اسی لمحے جب میں اپنے پرانے مکان کے پاس چہل قدمی کر رہا تھا، پیچھے سے کوئی مانوس سی آواز آئی۔ ''صاحب.....صاحب.....ارے صاحب آپ یہاں کیسے؟''

میں اس کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر خضاب لگی ڈاڑھی تھی۔ آنکھوں پر موٹی فریم کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ بال سفید ہو چکے تھے جن کو ڈھکنے کے لیے بھیڑ کی کھال کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ کینسر کے آپریشن کے سبب چہرہ بالکل مسخ ہو چکا تھا مگر پھر بھی کچھ کچھ مانوس سا لگ رہا تھا۔ میں اس کو پہچان نہیں پایا اور بلا جھجک اعتراف کیا۔ ''بھائی صاحب، معاف کرنا، میں آپ کو پہچان نہیں پایا۔''

''وہ ہلکی سی ہنسی ہنس کر میری بات ٹال گیا اور پھر کہنے لگا۔ ''صاحب کیسے پہچانو گے تم۔ بہت عرصہ جو ہوا۔ میں آپ کا ڈاکیہ ہوا کرتا تھا ۔ محلے میں ایک آپ ہی تھے جس کی ڈاک کم وبیش روزانہ آیا کرتی تھی اور آپ چھٹیوں کے دنوں میں روزانہ میرا انتظار کرتے تھے۔''

''اوہ تم.....! میرے ذہن نے اس کے چہرے کی از سر نو تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ اس کی صورت کو دوبارہ جوڑ کر اکٹھا کرنے لگا اور کچھ ہی ثانیوں میں وہی پرانی شبیہ میری آنکھوں کے سامنے ابھر آئی۔

''بھائی، سچ مانو تو میں تمھیں پہچان ہی نہ پایا۔ تمھاری تو شکل وصورت ہی بدل چکی ہے۔''

''صاحب، کیسے پہچانتے ۔ اب تو میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور ریٹائر بھی۔ اس سے بھی بڑھ کر میرے گلے میں کینسر ہو چکا تھا جس کے سبب آپریشن کرنا پڑا۔ تب سے میرا حلیہ ہی بگڑ گیا ہے۔ اور پھر

وقفہ بھی تو بہت ہو چکا ہے۔خیر یہ بتائیے کہ آپ کہاں رہتے ہیں آج کل؟

''بھائی تم سے کیا چھپانا۔اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ میں کہیں بھی نہیں رہتا۔ خانہ بدوش بن چکا ہوں۔اپنی زمین جب ٹھکراتی ہے اور مسکن جب کھو جاتا ہے تو آدمی خانہ بدوش ہو جاتا ہے۔وہ پھر کہیں کا نہیں کہلاتا۔''

''اتنے برسوں کے بعد یہاں آنے کی کیسے سوجھی صاحب؟''

''بس یاد ستانے لگی۔اپنی جڑوں کی یاد...! سوچا چلو اپنی جڑوں کی کھوج میں نکل جاؤں۔مگر یہاں مایوسی ہاتھ لگی۔جڑیں تو سب کی سب اکھڑ چکی ہیں۔''

''صاحب،آپ کے جانے کے بعد میں کئی روز آپ کی ڈاک لے کر آپ کے گھر پر جاتا رہا۔ وہی ریڈرس ڈائجسٹ، بیسویں صدی، تحریک، کتاب...اور بھی نہ جانے کون کون سے میگزین ہوتے تھے ......مگر دیتا کس کو؟ مکان میں تو تالا لگا ہوا تھا۔کوئی یہ بھی نہیں بتا پا رہا تھا کہ آپ کا نیا ایڈریس کیا ہے ورنہ وہیں ری ڈائریکٹ کر کے بھجوا دیتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو وہ میگزین جان سے بھی پیارے تھے۔ آپ انھیں پڑھتے نہیں بلکہ چاٹ جاتے تھے۔''

''بھئی، کن میگزینوں کی بات کر رہے ہو۔تم نے جتنے بھی نام لیے وہ سب کے سب نابود ہو چکے ہیں۔وہ بھی وقت کے تھپیڑوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور ایک ایک کر کے بند ہو گئے۔اب تو وہ نام سننے کو بھی نہیں ملتے۔اب ان کی جگہ نئے رسالے نکلتے ہیں لیکن وہ بات کہاں۔رہی بات میرے ایڈریس کی، میں تمھیں اپنا ایڈریس کیسے بتا دیتا۔کوئی موقع ہی نہ ملا۔سرکاری کرفیو...سول کرفیو.....بند.....ہڑتال ....اور پھر مجھے تو رات کے اندھیرے میں غائب ہونا پڑا تھا۔''

''پوسٹ ماسٹر کے نام ہی کوئی خط لکھا ہوتا تو ہم آپ کے نئے ایڈریس پر بھجوا دیتے۔ بہت دنوں تک آپ کے کئی دوستوں کے خط آتے رہے۔اور وہ عطر میں ڈوبے ہوئے خط بھی دو تین آئے تھے .....! میں نے سبھی ڈاک خانے میں جمع کروا دیے اور وہاں سے وہ ریٹرن لیٹر آفس چلے گئے۔''

''وہ میرا ماضی تھا بھائی! بھول چکا ہوں میں اپنے ماضی کو۔وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔کون کہاں لڑھک جائے کسی کو پتا نہیں۔''

’’صاحب، آپ کا وہ ایک دوست تھا نا جو آپ کے ساتھ اکثر دکھائی دیتا تھا۔ وہ...کیا نام تھا اس کا......؟ میں تو بھول ہی گیا۔ خیر کوئی بات نہیں ۔ وہی پروفیسر صاحب۔ معلوم ہے وہ بہت عرصہ پہلے مر گیا۔ صاحب اس کا جواں بیٹا چوک میں مارا گیا۔‘‘

’’پروفیسر کا بیٹا مر گیا! مجھے تو معلوم ہی نہیں ۔ وہ کیسے؟‘‘

’’اس روز کسی لیڈر نے ہڑتال کا اعلان کیا تھا۔ لوگوں نے موبائیل سے ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر لیا اور چوک میں جمع ہونے کی تلقین کی ۔ شہر کی تمام دکانیں بند رہیں۔ پھر شہر کے پائیں علاقے سے جلوس نکلا جو رفتہ رفتہ چوک تک پہنچ گیا۔ جلوس میں اکثر و بیشتر نوجوان تھے۔ ہاتھوں میں طرح طرح کے جھنڈے لیے ہوئے۔ فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے۔ سامنے سے پولیس آئی اور جلوس کو آگے بڑھنے سے روک لیا۔ دونوں فریق ایک دوسرے پر پہلے غرائے، پھر محاذ آرائی پر اتر آئے۔ ہجوم میں جس کو جہاں کوئی پتھر یا اینٹ مل گئی پولیس پر پھینک دی۔ پولیس اپنے بچاؤ کے لیے حفاظتی ساز وسامان سے لیس تھی۔ تاہم برستے پتھر دیکھ کر ان کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور انھوں نے جواب میں آنسو گیس کے گولے داغ دیے۔ ہر طرف آنسو رلانے والی گیس پھیل گئی اور مجمع تتر بتر ہوتا گیا لیکن ساتھ ہی مشتعل بھی ہو گیا۔ جب بھیڑ قابو سے باہر ہو گئی تو پولیس نے بندوقیں سنبھالیں اور دھڑ ادھڑ گولیاں برسائیں۔‘‘

’’گولیاں! یہ تو زیادتی ہے۔ انھیں پہلے ہوا میں فائر کرنا چاہیے تھا۔‘‘

’’صاحب جب حالات بے قابو ہو جاتے ہیں اور معاملہ برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو قائدے قانون دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ پولیس نے براہ راست احتجاج کر رہے نوجوانوں کو نشانہ بنا لیا۔ چار پانچ تو وہیں پر ڈھیر ہو گئے جبکہ پندرہ بیس زخمی ہو کر ہسپتال پہنچائے گئے۔ انھی میں پروفیسر صاحب کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔ اس نے تو سڑک پر ہی دم توڑ دیا۔ پروفیسر صاحب لاش کو دیکھ کر پاگل ہو گئے۔ اس دن سے کھانا پینا سب کچھ ترک کر دیا۔ رات دن بس عبادت میں جٹے رہے۔ مہینے بھر کے بعد بیوی اور تین لڑکیوں کو چھوڑ کر رحمت حق ہو گئے۔ اس روز مجھے آپ کی بہت یاد آئی ۔ پروفیسر صاحب آپ کو دیکھنے کے لیے ترستے تھے۔ میں نے کئی بار اس کو آپ کے مکان کے سامنے کھڑا پایا۔ وہ مکان کو یونہی ٹکر ٹکر دیکھتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس کی گویائی چلی گئی تھی اس لیے مجھے دیکھ کر صرف گھورتے جیسے کہہ

رہے ہوں، ''بھائی کس لیے اس گھر کا طواف کر رہے ہو۔ اب وہ یہاں نہیں رہتا۔ وہ اب واپس کبھی نہیں آئے گا۔ اب تو ہماری ملاقات اوپر ہی ہوگی۔''

پھر ڈاکیہ ہاتھ ملا کر چلا گیا اور نہ جانے کن گلیوں میں کھو گیا۔ میں اکیلا اس مانوس اجنبی سڑک پر اس کو دیر تک دیکھتا رہا۔ تبھی میرے بیٹے نے پکارا۔ ''پاپا، دیر ہو رہی ہے۔ ہوٹل جانا ہے، سامان پیک کرنا ہے اور پھر ائیر پورٹ بھی پہنچنا ہے۔ تین بجے کی فلائیٹ سے واپس جانا ہے۔''

میں تو بھول ہی گیا تھا کہ مجھے واپس بھی جانا ہے کیونکہ یہ گلی کوچے، یہ بازار، یہ دُکانیں، فضا میں تحلیل یہ بُو اور یہ شور شرابہ سب کچھ اپنا سا لگ رہا تھا۔ میں پل بھر ہی میں ان میں کھو سا گیا تھا اور وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔ مجھے اس بات کا خیال ہی نہ رہا کہ مجھے واپس سفر کرنا ہے اور اجنبی دیس میں باقی ماندہ سانسیں گننی ہیں۔ بس اسی طرح جیسے اس رنگ و بو کی دنیا میں انسان کھو کر واپسی کے سفر کی سدھ بُدھ کھو بیٹھتا ہے۔ اسے بھی خیال نہیں رہتا کہ اس کو کبھی واپس جانا ہے۔

کچھ دیر میں ہم دونوں واپس ہوٹل اور پھر ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ وہاں ہوائی جہاز ایک گھنٹہ لیٹ تھا۔

اور میں ......نہیں ہم سب اس وقت کا انتظار کرتے رہے جب واپس جانے کے لیے اڑان بھری جائے گی۔ واپسی کا سفر اتنا تکلیف دہ نہیں تھا جتنا کہ اس سفر کا انتظار!

☆☆☆☆☆

ڈاگ ہاؤس

مجھے بچپن ہی سے جانور پالنے سے سخت نفرت تھی۔ بات یوں ہے کہ میں نے آٹھویں جماعت میں ایک انگریزی کہانی 'سب سے بہتر آزادی' (Freedom Above All) پڑھی تھی جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ کہانی میں ایک جنگلی بھیڑیے اور ایک پالتو کُتّے کی دوستی ہو جاتی ہے۔ کُتّے کو زندگی کی تمام تر آسائشیں اور سہولتیں میسر ہیں اس لیے وہ ہر دم ان کا بکھان کرتا رہتا ہے۔ کئی بار اس نے اپنے دوست سے کہا۔

''یار تمھاری زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ جنگلوں میں دربدر بھٹکتے رہتے ہو۔ گھر نہ ٹھکانہ۔ پیٹ بھرنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہو۔ میری طرف دیکھو۔ خدا نے سب کچھ دے دیا ہے۔ میرا مالک بہت ہی امیر، نیک اور رحم دل آدمی ہے۔ میرے لیے ہر روز ہڈیوں والا گوشت منگواتا ہے۔ ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں آرام دہ بستر پر سلاتا ہے۔ روزانہ مجھے نہلاتا ہے۔ میرے بالوں پر طرح طرح کے پاؤڈر ڈالتا ہے۔ بیمار ہو جاؤں تو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔ اس کے عوض مجھے صرف رات بھر پہرے داری کرنی پڑتی ہے تاکہ اس کی جان و مال کی حفاظت ہو۔ اتنی تھوڑی سی محنت کرنے میں کوئی حرج تو ہے نہیں۔''

''تم سچ کہتے ہو دوست، تمھاری باتیں سن کر مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ تمھیں تو دنیا کی سبھی نعمتیں دستیاب ہیں جبکہ مجھے جینے کے لالے پڑے ہیں۔ پیٹ بھرنے کے لیے خود ہی شکار کی تلاش میں جانا پڑتا ہے۔ کبھی کبھار جب کسی ریوڑ سے بچھڑی بھیڑ یا بکری دیکھ لیتا ہوں تو فوراً اس پر جھپٹتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ چرواہے یا اس کے شکاری کتوں کو مجھ پر نظر پڑتی ہے اور وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔ آج تک جیسے تیسے میں نے خود کو ان کے چنگل سے بچا لیا لیکن آگے کی خدا جانے۔''

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ تم بھی میری طرح کسی مالک سے وفاداری کرنا سیکھو تاکہ زندگی

آرام سے کٹ جائے۔''

''تمہارا مشورہ معقول ہے....'' بھیڑیا تذبذب میں پڑ گیا مگر اچانک اس کی نظر کُتّے کی گردن میں پھنسے طوق پر پڑی۔ وہ استفسار کرنے لگا۔''یار، تمھارے گلے میں یہ پٹّا کس لیے بندھا ہے؟''

''اسے کالر کہتے ہیں۔ یہ میرے مالک نے پہنایا ہے۔ یوں تو میں گھر کے سبھی افراد سے مانوس ہو چکا ہوں اور گھر کی چار دیواری میں کھلا پھرتا رہتا ہوں تاہم گھر میں جب کبھی کوئی مہمان آتا ہے یا پھر مالک مجھے سیر کرانے کے لیے باہر لے جاتا ہے تو اس کالر اور زنجیر کی ضرورت پڑتی ہے۔''

''مطلب یہ کہ تم اپنی مرضی سے جی نہیں سکتے۔ یہ کالر تمھاری گردن میں اس لیے ڈالا گیا ہے کہ تم اپنے مالک کے اشاروں پر زندگی بسر کرلو۔ نہیں بابا نہیں، یہ تو غلامی کی نشانی ہے۔ مجھے اپنی آزادی زیادہ پیاری ہے چاہے وہ کتنی ہی جوکھم بھری کیوں نہ ہو۔''

اس کہانی کو پڑھنے کے بعد میں نے جانوروں کو پالتو بنا کر گھر میں قید کرنے سے توبہ کرلی۔ کہیں کسی پنجرے میں توتے یا مینا کو گرفتار دیکھتا تو مجھے کوفت ہو جاتی۔ اسی طرح زنجیروں میں بند کتوں کو دیکھ کر مجھے ان پر رحم آتا۔ البتہ ڈھلتی عمر میں بچوں کے سامنے کب کسی کی چلتی ہے۔ ایک روز میں اپنے بیٹے کو اکیلا چھوڑ کر دفتری کام سے ہفتہ بھر کے لیے دورے پر چلا گیا۔ موقع غنیمت جان کر وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ کسی نزدیکی پہاڑی مقام پر پکنک منانے چلا گیا۔ واپسی پر انھوں نے کسی حلوائی کے پاس کار روک لی اور چائے پینے بیٹھ گئے۔ گرل فرینڈ کی نظر حلوائی کی کتیا پر پڑی جس نے چند روز پہلے ہی چھ بچے جنے تھے۔ اس کا جی للچایا۔ فوراً اپنے بوائے فرینڈ سے فرمائش کی۔''دیکھو تو کتنے پیارے پیارے پپیز ہیں۔ تمھارے پاس اتنا بڑا مکان ہے۔ پھر کیوں نہ اس حلوائی سے ایک پپ مانگ لیں اور گھر میں پالیں۔''

حالانکہ میرے بیٹے کو اس بات کا احساس تھا کہ مجھے گھر میں کتے پالنے سے سخت نفرت ہے پھر بھی وہ اپنی معشوقہ کی بات نہیں ٹال سکا۔ ایک تو فرمائشِ محبوب اور پھر عمر کا تقاضا۔ بے چاری نے چاند ستارے لانے کی فرمائش تو کی نہیں تھی بس ایک پلاّ پالنے کو کہا تھا۔ اس لیے یہ سوچ کر جلدی راضی ہو گیا کہ پتا جی کو کسی نہ کسی بہانے راضی کرلوں گا۔ حلوائی نے بھی لڑکی کی فرمائش کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس طرح پلّے کو گود میں اٹھائے دونوں خوشی خوشی گھر لوٹے۔

رات گئے میرا موبائیل بجا۔ دوسری طرف میرا بیٹا مسرت اور خوف کے ملے جلے لہجے میں بول رہا تھا۔

''ہیلو پاپا، کیسے ہیں؟ اس وقت آپ کہاں ہیں اور کب تک لوٹ آئیں گے؟''

''تین دن اور لگیں گے۔ کوئی خاص بات؟'' میں نے جواب دیا۔

''پاپا، ہمارے گھر میں ایک نیا مہمان آیا ہے۔'' اس کے لہجے میں انکساری تھی۔

''کیوں، کون آیا ہے؟ مجھے بھی بتاؤ۔''

''میں نے ایک چھوٹا سا پپی گھر میں پالنے کے لیے لایا ہے۔ بہت اچھی نسل کا ہے، پاپا۔ دیکھ لیں گے تو حیران ہو جائیں گے۔ بالکل مفت میں مل گیا۔ کوئی پیسہ نہیں دینا پڑا۔''

''وہاٹ!'' میرا پارا ایک دم چڑھ گیا۔ ''تمھارا دماغ تو نہیں پھر گیا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ مجھے ان چیزوں سے سخت نفرت ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ جس سے لیا ہے اس کو واپس دے کر آ جاؤ۔''

''پاپا، وہ یہاں سے دو سو کلومیٹر دور ہے۔ اُدھر دوبارہ جانا مشکل ہے۔ آپ جب پپی کو دیکھیں گے تو خود ہی پسند کریں گے۔''

وقت کا پہیہ سچ مچ گھوم چکا تھا۔ جو ہو چکا اس کو بدلنا ممکن نہ تھا۔ نافرمانی کے اس بول نے مجھے یہ احساس کرایا کہ اب میں حاشیے پر براجمان ہوں اس لیے کوئی مزاحمت واجب نہیں۔ میں نے اپنا غصہ تھوکنے کی کوشش کی گو ذہن ابھی بھی مفاہمت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ رہی بات نسل کی۔ دیکھنے میں تو اچھی نسل کا کتا نظر آ رہا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ اسے 'راڈ وھیلر' کہتے ہیں اور اس کے خطرناک رویے کے سبب کئی یورپی ملکوں میں اس نسل کے کتوں کو پالنے کی سخت مناہی ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کے آگے ہتھیار ڈال دیے کیونکہ اس عمر میں کسی احتجاج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کتے کا نام 'ٹائیگر' رکھا گیا اور وہ بڑھتے بڑھتے سچ مُچ باگھ کی مانند پھرتیلا اور خونخوار بن گیا۔ کیا مجال کوئی آدمی گھر کے اندر یوں ہی چلا آئے یا پھر مالک کے پاس پھٹکے، اس کی تو شامت آ جاتی۔ ٹائیگر جب تک زندہ رہا دس پندرہ لوگوں کو زخمی کر چکا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں ٹائیگر کے ساتھ مانوس ہوتا چلا گیا۔ اب وہ پہلی سی کدورت

دل میں نہیں رہ گئی تھی۔ جب بھی میں گھر میں ہوتا وہ میری ٹانگوں کے ساتھ چمٹا بیٹھا رہتا۔ بارہا میرے بستر کے اوپر بھی براجمان ہو جاتا۔ ایسی اپنائیت میں نے انسانوں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اب ہمارے کنبے کا فرد بن چکا تھا۔

بہت عرصہ بعد ہمیں ایک قریبی رشتے دار کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے جموں جانا پڑا۔ اس وقت میں ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا اور وہ پرانی ٹھاٹ باٹ باقی نہیں رہی تھی۔ نہ وہ گورنمنٹ کے بنگلے تھے اور نہ ہی وہ سہولتیں۔ ہم نے دہلی کے قریب ایک فلیٹ خریدا تھا جس میں ٹائیگر کو پالنا مشکل ہو رہا تھا۔ جموں جانے اور واپس آنے میں دو دن لگ جاتے جبکہ وہاں بھی تین چار دن کا قیام ضروری تھا۔ میں تردّد میں پڑ گیا کہ ٹائیگر کو کہاں رکھیں؟ اسے خون کا رشتہ نہ سہی لیکن درد کا رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ کسی رشتے دار یا دوست کے پاس تو رکھ نہیں سکتے تھے اور نہ ہی ساتھ لے جانا ممکن تھا۔ اس لیے میں نے اپنے بیٹے سے پوچھ لیا۔

''بیٹے شادی میں شرکت کرنا تو ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ ٹائیگر کو کہاں رکھ چھوڑیں؟''

''پاپا، آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیوں پریشان ہوتے ہیں؟'' بیٹے کے بجائے اس کی گرل فرینڈ، جواب اس کی بیوی بن چکی تھی، نے ٹوک کر کہا۔ ''میں گذشتہ تین چار دن سے سوچ رہی تھی کہ آپ کا چہرہ اُترا اُترا سا کیوں لگ رہا ہے۔ پاپا یہ کوئی بڑی پرابلم نہیں ہے۔''

''کیسے پرابلم نہیں ہے۔ تم لوگ اسے چھوٹی بات سمجھتے ہو۔ یہ بے زبان کہاں جائے گا؟ گھر میں اکیلا تو رہ نہیں سکتا اور پھر کسی دوسرے کے گھر میں بھی نہیں رکھ سکتے ہیں۔ کھانا، پینا اور حاجات ضروریہ ......ان سب کا انتظام کیسے ہوگا؟'' میرے لہجے میں خفگی تھی۔

''پاپا، آپ تو دقیانوسی باتیں کرتے ہیں۔ آج کل جیب میں پیسہ ہونا چاہیے ہر چیز مل جاتی ہے۔ شہروں میں جگہ جگہ 'ڈاگ ہاؤسز' کھل چکے ہیں جن کا انصرام پیشہ ور ویٹرنری ڈاکٹر کرتے ہیں۔ ہم ٹائیگر کو کسی قریبی سگ خانہ میں ڈال دیں گے اور جب لوٹیں گے تو واپس گھر لائیں گے۔'' بہو نے تیقن کے ساتھ جواب دیا۔

''ڈاگ ہاؤس...!سگ خانہ...!کیا بولتے ہو! کیا وہاں پر کتوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے؟''

''کیوں نہیں، جب چڑیا گھروں میں وحشی جانور پالے جاسکتے ہیں تو پھر سگ خانہ میں پالو کتوں کی دیکھ بھال کیوں نہیں ہوسکتی ہے۔''

جس روز ہمیں جموں جانا تھا اسی روز میرے بیٹے نے ٹائیگر کو'موڈرن ڈاگ ہاؤس' میں ڈال دیا۔ رات کو ہم ریل گاڑی میں بیٹھ کر جموں روانہ ہوگئے۔ البتہ مجھے یہ غم ستائے جارہا تھا کہ نہ جانے ٹائیگر نے کھانا کھایا ہوگا یا نہیں۔ اس کی اچھی طرح دیکھ ریکھ ہورہی ہوگی یا نہیں۔ کہیں اس کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہورہی ہوگی؟'' اس دن مجھے احساس ہوا کہ پالا پوسا خون کے رشتے سے بھی زیادہ دل کے قریب ہوتا ہے۔

ہفتے بھر کے بعد ہم لوٹ آئے۔ میرے بیٹے نے سب سے پہلے ٹائیگر کو سگ خانہ سے واپس لایا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے بشاشت ہوئی جیسے میں اپنے لخت جگر سے مدتوں بعد مل رہا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر میرے پاؤں کے ساتھ دیوانہ وار لڑھکنیاں کھانے لگا۔ عام والدین کی مانند مجھے یوں لگ رہا تھا کہ ٹائیگر پہلے سے کافی دبلا ہوچلا ہے۔ میں چپکے سے بازار چلا گیا اور اس کے لیے ہڈیوں والا گوشت لے کر آ گیا۔

اس ابتدائی تجربے کے بعد ٹائیگر کو کئی بار ڈاگ ہاؤس میں رہنا پڑا۔ ہم کبھی تفریح کے لیے پہاڑوں پر چلے جاتے یا پھر کبھی کسی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے چلے جاتے تو اسے ڈاگ ہاؤس میں چھوڑ جاتے۔

یوں ہی آٹھ سال گزر گئے۔ اب وہ بوڑھا ہوچلا تھا۔ کھانے پینے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اب نہ وہ پہلے جیسی پھرتی تھی اور نہ ہی آنکھوں میں وہ چمک۔ ایک روز ہم پھر اسے ڈاگ ہاؤس میں چھوڑ کر پونا چلے گئے۔ تین دن کے بعد ڈاگ ہاؤس کے مالک کا ٹیلی فون آیا کہ ٹائیگر کی صحت بہت بگڑ چکی ہے۔ سفر ادھورا چھوڑ کر ہم سب واپس چلے آئے۔ تین ہی دنوں میں ٹائیگر پنجر بن چکا تھا۔ نہ کچھ کھاتا تھا اور نہ ہی پیتا تھا۔ اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو دکھایا تو پتا چلا کہ اس کی آنت میں ٹیومر ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے عین مطابق اس کا آپریشن ہوا لیکن ٹائیگر آپریشن ٹیبل سے پھر کبھی زندہ واپس نہیں آیا۔

اس حادثے کو پیش آئے کئی سال بیت گئے۔ گاہ بہ گاہ مجھے ٹائیگر کی بہت یاد آتی رہی۔ اس کی

صورت میری آنکھوں کے سامنے بار بار پھر جاتی اوران میں آنسوؤں کا غبار چھوڑ جاتی۔ وقتاً فوقتاً مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ گھر کے کسی کونے سے اچانک نکل کر آئے گا اور میری ٹانگوں کے ساتھ لپٹ جائے گا۔ کہیں دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آجاتی تو مجھے لگتا کہ وہ مجھے پکار رہا ہے۔

کئی بار میرے بیٹے نے ایک اور کتا لانے کی بات چھیڑی مگر میں نے منع کر دیا۔ ایک تو یہ کہ ٹائیگر کی موت سے میرا دل رنجیدہ ہو چلا تھا اور دوسرے یہ کہ ہم جس فلیٹ میں رہ رہے تھے وہاں انسان قیدی بن کر جی رہے تھے، کتے کی تو بات ہی نہیں۔

وقت گزرنے کا کچھ پتا ہی نہ چلا۔ یوں بھی صدیاں بے صوت وصدا گزر جاتی ہیں۔ مجھے سبکدوش ہوئے پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ ضعیف العمری نے مجھے ناکارہ بنادیا ہے۔ چلنا پھرنا تو دور، اب سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں بچوں پر بوجھ بنتا جا رہا ہوں۔ موت کو جس قدر بلاتا ہوں وہ اتنی ہی دور چلی جا رہی ہے۔

چندروز پہلے بچوں کی سرگوشیاں کانوں میں پڑ گئیں۔ بہو اپنے پتی سے کہہ رہی تھی۔

''بنگلور میں میری بہن کی بیٹی بیاہی جا رہی ہے۔ آنے والی بیس تاریخ کو شادی کی تقریب ہے۔''

''تو پھر.....؟'' میرے بیٹے نے پوچھ لیا۔

''ہم سب کو جانا پڑے گا۔ وہ لوگ بھی تو میری شادی پر آ چکے تھے۔ ریل کی ٹکٹیں بک کرنی پڑیں گی۔ چار روز کا سفر ہے اور وہاں چار پانچ دن اور لگ جائیں گے۔ پھر اتنی دور جا رہے ہیں تو آس پاس کی جگہیں۔ میسور، اوٹی اور کوڑائی کنال۔ بچوں کو دکھا کر ہی آئیں گے۔ بار بار تھوڑے ہی جا پائیں گے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس کے لیے پندرہ دن سے کم کیا لگیں گے۔''

''ہاں، میں نے پندرہ دن کا ہی پروگرام بنالیا ہے۔ مگر ایک پرابلم ہے.....'' وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

''رُک کیوں گئی۔ بولو کیا پرابلم ہے؟''

''پاپا کا کیا ہوگا؟'' بہو نے پوچھ لیا۔

''ڈونٹ یو وَری۔ یہ کوئی بڑی پرابلم نہیں ہے۔''

''کیا کہتے ہو۔ پاپا تو اب چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ ہم انھیں سنبھال نہیں پاتے، پھر کسی اور کے پاس کیسے رہ سکیں گے؟''

''ارے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہاں پاس ہی میں ایک 'اولڈ ایج ہوم' ہے۔ وہاں فیس دے کر بوڑھے ضعیف لوگوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ پندرہ بیس روز کے لیے پاپا کو اسی وردھ آشرم میں ڈال دیں گے۔ وہاں کہن سال لوگوں کی بہت ہی سلیقے سے دیکھ بھال کی جاتی ہے۔''

اور پھر وہ مجھے 'سپیشل کیئر اولڈ ایج ہوم' میں چھوڑ کر بنگلور چلے گئے۔

میں جتنے بھی دن اس وردھ آشرم میں رہا ہر پل ٹائیگر کو یاد کرتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ اس بے زبان نے اپنوں کے بغیر کیسے اس انجانے ڈاگ ہاؤس میں اتنے سارے دن کاٹ لیے ہوں گے؟

☆☆☆☆☆

برسوں پہلے

یہیں کہیں ان پتھروں کے درمیاں
اسی ٹوٹے پھوٹے مقبرے کے سامنے
ملے تھے پہلی بار
اور وعدے کیے تھے ساتھ جینے اور مرنے کے
یہیں کہیں اسی مقبرے کی دیوار پر
نقش کیے تھے ہم نے اپنے نام اس طرح
مٹا سکے گا نہ کوئی ہزار کوشش بھی کرے
پر آج نم آنکھوں سے جو دیکھتا ہوں میں
برسوں کی دھول مٹی اوڑھے ہوئے
یہ نام اب بھی ہیں محو گفتگو
وہی آشنائی، وہی دلربائی
انھیں شاید یہ معلوم بھی نہیں
ان ناموں کے پیچھے جو دل دھڑکتے تھے کبھی
دنیا کی بھیڑ میں کھو چکے ہیں کہیں
اور انھیں ایک دوسرے کی خبر بھی نہیں

☆☆☆

نظم

بابا سچ بولو تم آج

بابا سچ بولو تم آج
حکم عدولی کی تھی تم نے؟
باغِ عدن میں بیٹھ کے تم نے
شجرِ علم کا پھل کھایا تھا؟
اِک شاہمار کے بہکاوے پر
کیا ڈولی تھی نیت تیری
یا پھر حوا کا دل رکھنے کو
قہرِ خدا کو دعوت دی تھی؟
بابا سچ بولو تم آج

اس نافرمانی کے باعث
حکم ملا تھا سفر کا تم کو؟
وہ ہجرت، وہ پہلی ہجرت
اتنی مسافت کیسے طے کی؟
اس دن بھی کیا سورج یوں ہی
انگاروں سے کھیل رہا تھا؟
اس دن بھی مخلوق زمیں پر

گرم ہوا سے جو جھر رہے تھے؟

اس دن بھی قدموں کے نیچے

سانپ اور بچھو رینگ رہے تھے؟

اس دن تم بھی بے گھر ہو کر

کیا ہر لمحے جیتے مرتے؟

کیسے بیتی، کیسے کاٹی؟

دل کی گرہ تم کھولو آج

بابا سچ بولو تم آج

عرصہ بیتا، صدیاں گزریں

محوِ سفر، ہجرت کا مارا

بدقسمت تیرا یہ بیٹا

آج بھی در در بھٹک رہا ہے

شراپ خدا کا جھیل رہا ہے

نئے سہارے کھوج رہا ہے

نئے ٹھکانے ڈھونڈ رہا ہے

پھر تھک ہار کے خود سے کہتا

کیوں بے گھری ہے قسمت میری؟

کیوں مجھ کو آرام نہیں ہے؟

کیوں دنیا اجنبی سی لگتی؟

شیطانوں کا کیوں ہے راج؟

بابا سچ بولو تم آج

ذہن میں بس الفاظ ہیں اُگتے

بے ترتیب، بے ربط پھپھولے

نسل، ذات، رنگ اور مذہب کے

یا پھر دھوتی، دھان اور چھت کے

ان الفاظ پہ پردے ڈالے

تہذیبیں اب چیخ رہی ہیں

برسوں استحصال ہوا ہے

بگل یہ آزادی کا بجا ہے

امن کی خاطر جنگ لڑی ہے

پیٹ کی خاطر خون بہا ہے

ظالم کی تاویل یہ کیسی؟

قاتل کا یہ جواز کیسا؟

دنیا کو کرتے تاراج

بابا سچ بولو تم آج

پھر کچھ دور چلا جاتا ہوں

پھر تھک کر جو دم لیتا ہوں

پھر تصویریں بول اٹھتیں ہیں

ان کی جنھوں نے باری باری

تہذیبوں کا ریپ کیا ہے

تقریروں پر تالے ڈالے

خوابوں کا اسقاط کیا ہے
تاویلوں پر دھرم کی مہریں
تعبیروں کو مسخ کیا ہے
وہ جو کل تک خون کی ہولی
کھیل کے اٹھلایا کرتے تھے
لہو آستینوں پر ان کے
پھر بھی حق کی باتیں کرتے
امن کی دہائی دیتے ہیں آج
بابا سچ بولو تم آج

محافظ نام کے تیرے کتنے
تپتے صحرا میں پیاسے اکیلے
نعرہ حق کا لگاتے پھرتے
اپنی صلیبیں اٹھائے پھرتے
سر پر ہے کانٹوں کا تاج
بابا سچ بولو تم آج

☆☆☆☆☆

اے میرے بھیشم پتامہ!

اے میرے بھیشم پتامہ!
تم نے مجھ سے کیوں یہ پوچھا
میرا ارکشلے کہاں ہے؟
مجھ کو تب سے نیند نہ آئی
کروٹ کروٹ بدل رہا ہوں
دل بے چین ہے، آنکھیں پرنم
فضا بھی ہے بھاری بھاری
کہاں کہاں نا ڈھونڈا اس کو
گلیوں گلیوں بستی بستی
صحرا جنگل، مندر مسجد
گجرات کی بیکری میں بھی جھانکا
شاید جل کر راکھ ہوا ہو
یا پھر مسجد کے گنبد پر
بابر کو للکار رہا ہو
کابل اور قندھار میں پہنچا
ہو سکتا ہے یرغمال ہوا ہو
کرگل پہنچا، دراس میں پہنچا

تابوت میں شاید مرا پڑا ہو

پھر جا کر کشمیر میں ڈھونڈا

بے کتبہ قبروں میں دبا ہو؟

لاہور کی بس میں ڈھونڈا شاید

امن کا پرچم لیے کھڑا ہو

ہاتھ ابھی تک کچھ نہ آیا

آس مگر پھر بھی ہے باقی

پھر اک دن یوں سوچ رہا تھا

کرسی پر تم بھی تھے بیٹھے

پانچ سال کچھ کم نہیں ہوتے

کتنے رکشلے اپہرن ہوئے تھے

کتنوں کی لی گئی سپاری

کتنوں کا یوں لہو بہا تھا

تم اس وقت بس دیکھ رہے تھے

بے بس اور لاچار کھڑے تھے

بھیشم پتامہ کھڑا ہو جیسے

وہی تھا منظر، لوگ وہی تھے

چیر ہرن ہو رہا تھا جس کا

اس کو غور سے دیکھا میں نے

شاید دروپدی نام تھا اس کا

☆☆☆

☆نوٹ۔ رکشلے نام تھا اس لڑکے کا جس کا اغوا بہار میں ہوا تھا اور واجپئی دہلی سے اس کو ڈھونڈنے گئے تھے

پیرس کے نام

مجھے یہ نہیں معلوم کون تھا مارنے والا
اور کون تھا جو مر گیا
میں نے نہ گولیوں کی آوازیں سنی تھیں
اور نہ بم پھٹنے کا منظر دیکھا تھا
پھر بھی نہ جانے کیوں میری روح کانپ رہی ہے
کیوں مجھے شدید گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے
کیوں بارود کی بو میرے سانسوں میں سما گئی ہے
کیوں میرے وجود پر دہشت کے بادل چھا گئے ہیں
جسے دیکھو وہ صحیفہ ہاتھ میں اٹھائے ہوئے پھر رہا ہے
کوئی اپنی سلامتی کی دعائیں کر رہا ہے
کوئی بچھڑوں کی مغفرت چاہتا ہے
اور کوئی جنت کے خواب دیکھ رہا ہے
مگر میں
نہ جنت کا متقاضی اور نہ امارت کا طلبگار
بس کچھ دن اور جی لینا چاہتا ہوں
اس ارض خاک پر
جو نہ جنت ہے اور نہ جہنم ☆☆☆

راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ 'لمبی لڑکی' - تجزیاتی مطالعہ

افسانہ 'لمبی لڑکی' راجندر سنگھ بیدی کے چوتھے افسانوں کے مجموعے 'اپنے دُکھ مجھے دے دو' (سن اشاعت: اگست ۱۹۶۵ء) میں شامل ہے۔ ان کے افسانے اپنی تہذیب میں رچے بسے، مذہب کے خمیر سے نمو پائے اور رسومات و توہمات سے جوجھتے ہوئے ملتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے چار ستونوں ،کرشن، بیدی، منٹو اور عصمت میں وہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور کئی ناقدوں نے انھیں کرشن اور منٹو پر فوقیت دی ہے۔ غالبؔ کی طرح انھوں نے بہت کم لکھا مگر جو لکھا سوچ سمجھ کر لکھا۔ کلیات راجندر سنگھ بیدی میں خاکوں اور مضامین کے علاوہ ان کے صرف ۷۴ افسانے درج ہیں۔ وہ دیہاتی زندگی کو مدنی زندگی پر اور انفرادیت کو اجتماعیت پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کے افسانے زندگی کے دکھ سکھ اور اتار چڑھاؤ کو منعکس کرتے ہیں۔ بیدی کے یہاں منجھا ہوا سماجی شعور ملتا ہے اور وہ معاشرے کی بدعنوانیوں پر طنز کے نشتر چلانے سے دریغ نہیں کرتے۔ حالانکہ کرشن چندر کی طرح وہ رومانی نثر نہیں لکھتے مگر ان کے یہاں سوچ و فکر، استعاروں، تشبیہوں اور لفظی پیکروں کی بہتات ملتی ہے۔ بیدی روسی رائٹر چیخوف کی طرح 'خاموش اور شانت جذبات' کا افسانہ نگار ہے۔ بقول وارث علوی:

> ''راجندر سنگھ بیدی تخیل کی آنکھ سے ظواہر کے پیچھے پنہاں ان المیوں اور طربیوں، آرزوؤں اور محرومیوں کا سراغ لگاتے ہیں جن کی تفہیم کے بغیر نہ تو ہم زندگی کو سمجھ سکتے ہیں، نہ انسان کو۔'' (وارث علوی، 'راجندر سنگھ بیدی کے افسانے - ایک تعارف'، کلیات راجندر سنگھ بیدی جلد اول، ناشر قومی کونسل ۲۰۰۸، ص ۱۶)

عورت بیدی کا غالب موضوع رہا ہے۔ وہ منٹو کی مانند عورتوں کو ڈھونڈنے اندھیری گلیوں اور بالا خانوں میں نہیں جاتے ہیں بلکہ ان کی عورت عام گرہستن اور سماج کی اہم رکن ہے۔ وہ عورت کے حسن، محبت، ممتا، ایثار نفسی اور ریتا کو اجاگر کرتے ہیں اور اس کی مثبت قوتوں پر فوکس کرتے ہیں۔ اس کا

یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انھوں نے نسوانی مسئلوں سے روگردانی کی ۔اس کے برعکس وہ خواتین پر ہو رہے ظلم و ستم ،استحصال اور حق تلفی کو بار بار اپنے افسانوں کی زینت بناتے ہیں ۔افسانہ 'لمبی لڑکی' ایک ایسی لاچار لڑکی کی کہانی ہے جس کا قد اس کے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے حالانکہ یہ قدرت کی دین ہے اور لڑکی کا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے ۔اس افسانے میں بیدی نے کئی اور مسئلوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جیسے ازدواجی چپقلش جس سے سارا گھر پراگندہ ہوتا ہے اور مرد گھر کے باہر کوٹھوں کا سہارا لیتا ہے، شرابی اور اوباش خاوند کی وجہ سے گھریلو تشدد، فراریت پسند مردوں کا مذہب اور روحانیت کے تحت پناہ لینا اور بانجھ عورتوں کی نفسیاتی کشمکش کہ وہ ہمیشہ خود کو غیر محفوظ اور حاشیے پر سمجھتی ہیں اور اس کا ردِ عمل ہمیشہ خلاف معمول ہوتا ہے ۔

افسانہ 'لمبی لڑکی' ایک دراز قد لڑکی، مُنّی سوہی کے گرد گھومتا ہے جو انچ انچ کر کے "٥'٨ سے بھی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے ۔گو اس نے جینیاتی وراثت کے سبب یہ قد پایا ہے اور اس کے دادا وغیرہ نے اس کے تدارک کے لیے پست قد لڑکیوں سے شادیاں کی تھیں پھر بھی کہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ماہر جینیات مینڈل کے اصولوں کے مطابق غالب جین اکثر ظاہر ہوتا ہے اور بہت کم صورتوں میں اس کا اظہار نہیں ہوتا ۔افسانہ نگار نے مُنّی سوہی کے کردار کو یوں بیان کیا ہے:

> "مُنّی سوہی، خالی خولی لمبی ہی نہ تھی ،بدن بھی بھرا ہوا تھا اور اس کا رنگ اپنے ہی لہو کی آگ میں جلتے رہنے سے تانبے کا سا ہو گیا تھا۔ کبھی تو وہ کونارک کے مندر کی، تانترک شلپیوں کے ہاتھ سے بنی ہوئی، بڑی سی یکشی معلوم ہونے لگتی اور کبھی ایک بڑی سی دیگ، بیاہ شادیوں میں جس میں حلوہ یا اُڑد پکائے جاتے ہیں اور جس کے نیچے برابر کی آنچ کے لیے منوں ہی لکڑیاں ڈالنی پڑتی ہیں اور پھر کیا حلوہ بنتا ہے، کیا اُڑد ہوتے ہیں.....گلی بازار میں نکلتی سوہی تو اپنے آپ سے بھی ایک فٹ آگے چلتی، جیسے کہہ رہی ہو- ہٹ جاؤ، میں آ رہی ہوں ۔لوگ راستہ دے دیتے ،پچھاڑیں کھا کھا کر پیچھے گرتے جیسے ڈپٹی جگن ناتھ کی نہیں، کسی راجا کی بیٹی ہو!
>
> (افسانہ 'لمبی لڑکی' مصنف: راجندر سنگھ بیدی)

مُنّی سوہی کی بیاسی سالہ دادی رُکمن اس کے دراز قد سے متفکر ہے ۔والدین کی غیر موجودگی میں دادی اپنی پوتی مُنّی کو پالتی ہے ۔رُکمن کو اس بات کا احساس ہے کہ اس بیچاری لڑکی کے لیے بَر ملنا ناممکن

ہے۔ بقول رقمن ''پھر اتنا لمبا لڑکا ملے گا بھی کہاں سے؟ چھوٹے قد کا کوئی بیاہے گا نہیں۔ بیاہے گا تو بسائے گا نہیں۔'' اس لیے ''وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی کچھ کام تھے جو ادھورے رہ گئے تھے جنھیں وہ نپٹانا چاہتی تھی۔'' رقمن دادی عزم کرتی ہے کہ تب تک نہیں مرے گی جب تک سوہی کے ہاتھ پیلے نہیں کرے گی۔ اِدھر ہر کوئی عمر رسیدہ بیمار دادی کی موت کا طلبگار ہے ماسوائے اس کی پوتی کے جس کی وہ نگہبان ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھیا بستر کو بھی پلید کرنے لگتی ہے۔ بہو شیلا تو ناک پر ڈوپٹہ رکھ کر نظریں پھیر لیتی ہے مگر مُنّی دادی کے پلید کیے ہوئے کپڑے دھوتی ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر شیلا بپھر کر کہتی ہے کہ ''دونوں کے لیے جم راج کیا مجھے ڈھونڈنے ہیں۔'' کئی بار ایسا ہوا کہ دادی کی موت کی خبر پڑوسیوں تک پہنچا دی گئی اور وہ فوراً حاضر ہو گئے، دادی کو ہندو رسم و رواج کے تحت کھاٹ سے اتار کر زمیں پر لٹایا گیا اور آٹے کا دیا جلا کر دیگر رسومات ادا کیے گئے یہاں تک کہ گیتا کا سترہواں ادھیائے بھی پڑھا گیا تا کہ دادی کی جان آسانی سے نکل سکے۔ مگر دادی کو مرنا تھا اور نہ وہ مری۔ اس کا عزم اتنا بلند تھا کہ وہ موت کو بھی ٹالتی رہی تا کہ اپنی پوتی کے ہاتھوں پر مہندی لگا کر اسے خوشی خوشی سسرال روانہ کر سکے اور اس طرح اپنا فرض نبھا سکے۔ بڑھیا جب آنکھیں بند کر کے پھر سے ہوش میں آ جاتی تو اکثر اس سندرواٹکا (چمن) کی باتیں کرتی جس کی وہ سیر کر کے آتی تھی اور جہاں اس کی ملاقات اپنے پتی سے ہو جاتی جو بہت پہلے مر چکا تھا مگر ابھی بھی دادی کے انتظار میں آنکھیں بچھائے تھا۔ اس پر مُنّی سوہی خوب ہنستی اور دادی کا مذاق اڑانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑتی۔ ماں فوت ہو چکی تھی اور باپ نے فرار اختیار کیا تھا جب کہ بھائی دیویندر کاہل، شرابی و اوباش تھا اور اپنی بیوی شیلا سے ہمیشہ لڑتا جھگڑتا تھا جس کی وجہ سے گھر میں ہمیشہ ہنگامہ برپا رہتا۔ شیلا بھی ردِعمل کے طور پر جھنجھلاتی اور نہ صرف دادی بلکہ مُنّی سوہی کی موت کے لیے دعائیں کرتی۔

دریں اثنا مُنّی کے بھائی دیویندر نے سائیکل کی دکان کھول دی مگر وہ ایک نرس کے چکر میں بند ہو گئی۔ کئی برس یوں ہی بیت گئے۔ مُنّی سوہی کی سہیلیاں بیاہ کر کے سسرال چلی گئیں مگر سوہی کے لیے شوہر نہ ملا۔ اتفاقاً ایک روز دیویندر کا ایک دوست، گوتم، کولکتہ سے ان کے گاؤں دینا پور آ دھمکا تا کہ ہند سائیکل کی سب ایجنسی کھول دے۔ افسانہ نگار نے گوتم کا حلیہ یوں بیان کیا ہے:

''گوتم قد کے اعتبار سے مشکل سے پانچ فٹ دوانچ کا ہوگا۔لیکن تن وتوش کے اعتبار سے اچھا تھا۔آکابا کا سا چہرہ۔ لال رنگ۔معلوم ہوتا تھا گالوں میں دوٹماٹر دبا کے رکھے ہیں۔بات بات پر اچھلتا، جیسے نہ جانتا ہو اس صحت کا کیا کرنا ہے؟''

(افسانہ 'لمبی لڑکی'، مصنف: راجندر سنگھ بیدی)

دیویندرا سے اپنے گھر چائے پر بلاتا ہے جہاں وہ شیلا بھابھی کے ساتھ بے تکلفی سے ہمکلام ہوتا ہے۔وہ شیلا کو جلدی سے بچہ جننے کی صلاح دیتا ہے تاکہ اس کے بانجھ پن کا بہانہ بنا کر دیویندر دوسری شادی نہ کر لے۔اس بات کا شیلا کے ذہن پر بڑی دیر تک اثر رہتا ہے۔اُدھر شیلا نے مُنّی کو تنبیہ کی ہوتی ہے کہ وہ بیٹھک میں نہ جائے تاہم اس کا تجسس اس کو نیم چھتے پر لے جا کر کھلی کھڑکی سے گوتم کو دیکھنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔اس دوران وہ ہسٹیریا کے دورے سے گر جاتی ہے اور بہت دیر کے بعد ہوش میں آجاتی ہے۔اسے آئے دن غش کھا کر گرنے سے کافی ندامت ہوتی ہے۔

یہاں پر یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ افسانہ نگار نے نسوانی مصائب کو بڑی فنکاری کے ساتھ زیریں لہر کے طور پر پیش کیا ہے۔ایک تو سن بلوغ کو پہنچ رہی لڑکیوں یا شادی نہ کر پا رہی جوان لڑکیوں کی ذہنی حالت کو منعکس کیا ہے کہ انھیں اکثر اختناق کے دورے پڑ جاتے ہیں۔دوسرے بانجھ عورتوں کی نفسیات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ ان میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی طبیعت میں چڑچڑا پن عود کر آتا ہے۔اعلیٰ فن کاری کی یہی تو خاصیت ہے کہ کسی میلوڈرامہ کے بغیر ہی افسانہ نگار ان مسئلوں پر غور کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

گوتم دور ہی سے سہی مگر مُنّی سوہی کو دیکھتا ہے اور پسند کرتا ہے۔وہ باضابطہ طور پر مُنّی کو بیاہ کر لے جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔پھر بھی دادی کو یقین نہیں آتا اور اس کے دل میں وسوسے گھر کر جاتے ہیں۔رُمن پوتی کو اپنا وتیرہ ٹھیک کرنے اور جھک کر چلنے کی تربیت دیتی ہے اور کئی بار سرزنش بھی کرتی ہے۔شادی سے کچھ دن پہلے گوتم سائیکل ایجنسی چھوڑ کر دیما پور کے نزدیک جنگلوں کا ٹھیکہ لینے میں کامیاب ہوتا ہے جس وجہ سے شادی التوا میں پڑ جاتی ہے۔سن کر دادی بوکھلا جاتی ہے اور لڑکی کو منحوس سمجھتی ہے۔خود مُنّی بھی اپنی قسمت پر روتی ہے۔چنانچہ دوری کے سبب خط آنے جانے میں مہینوں لگ جاتے ہیں اس لیے ان کی

تشویش کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ بہر حال بہت عرصہ کے بعد گوتم کا خط ملتا ہے جس میں شادی کی مہورت ایک سال کے بعد طے ہونے کی اطلاع دی جاتی ہے۔ دادی کی جان میں جان آتی ہے مگر اندیشے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ دن گننے لگتی ہے۔ آخر کار جیسے تیسے کر کے مُنّی سوہی کی ڈولی اٹھ جاتی ہے۔ سبھی لوگ یہ احتیاط کرتے ہیں کہ سوہی کا قد مقابلتاً زیادہ نہ لگے اور شادی اچھی طرح پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔ اس دوران بھی شیلا یہی دعائیں کرتی رہتی ہے کہ دادی کی ڈولی بھی جلدی اٹھ جائے۔ مُنّی کے جانے کے بعد پاس پڑوس میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ دادی رُقمن اب بھی ڈرتی ہے کہ کہیں گوتم مُنّی کو دور لے جا کر چھوڑ نہ دے اور اسے پتہ بھی نہ لگے۔ اس کا واہمہ روز بروز بڑھتا رہتا ہے کہ ان دور دراز جنگلوں میں جہاں سانپوں اور جنگلی جانوروں کی کثرت ہوتی ہے، نہ جانے مُنّی کا کیا حال ہوگا؟ ضرور وہاں کچھ گڑبڑ ہوگی۔ رُقمن اب بھی ماننے کو تیار نہ تھی کہ ۵ فٹ کا لڑکا ۶ فٹ کی لڑکی سے شادی کر کے خوش ہوگا۔ وہ بھگوان سے پرارتھنا کرتی ہے کہ گوتم پر کچھ ایسا سحر ہو کہ اسے اپنی بیوی چھوٹی دکھائی دے۔ دریں اثنا مُنّی کا باپو جگن ناتھ بھی کوچ کر جاتا ہے۔ دادی مُنّی کے خط کا شدّت سے انتظار کرتی رہتی ہے مگر اسے کیا معلوم کہ خط اک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ دادی کے خدشات روز بروز بڑھ جاتے ہیں کہ نہ جانے مُنّی کبھی لوٹے گی بھی یا نہیں، اگر لوٹے گی تو کب لوٹے گی اور کس حال میں لوٹے گی۔

بہر کیف ایک روز مُنّی سوہی سچ مچ چلی آتی ہے اور دادی دیکھتی ہے کہ وہ بہت خوش ہے اور اس کی کوکھ میں سات مہینے کا بچہ پل رہا ہے۔ گوتم زچگی کے لیے مُنّی کو میکے میں چھوڑ کر کچھ دنوں بعد چلا جاتا ہے۔ البتہ اس بار دادی مطمئن اور بشاش نظر آتی ہے۔ وہ اب ملک عدم کا سفر کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کی بیماری لوٹ آتی ہے اور وہی کارروائی کی جاتی ہے جو ہر بار کی جاتی ہے۔ مرتے دم اس کا بچپنا اور چلبلا پن لوٹ آتا ہے۔ اس لیے وہ مُنّی سوہی سے کان میں پوچھتی ہے: ''وہ تجھ سے پیار کیسے کرتا ہوگا''۔ اسی کے ساتھ دادی اپنے پران تیاگ دیتی ہے اور گیتا کا جاپ بھی اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی اور موت ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ 'موت' اکثر بیدی کے افسانوں میں استعارہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان کے کچھ افسانوں جیسے موت کا راز، لمبی لڑکی، ہم دوش، کشمکش، نامراد اور رحمان کے جوتے میں موت کو بلاواسطہ برتا گیا ہے جب کہ کئی دوسرے افسانوں

میں 'موت' کی طرف بالواسطہ اشارہ کیا گیا ہے۔موت بیدی کے لیے ایک ایسی حقیقت ہے جس سے چھٹکارا نہیں مل سکتا مگر ان کی کہانیوں میں موت کے ڈر کے خلاف مختلف آدمیوں کا نفسیاتی ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔کوئی اس کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے،کوئی اس سے ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتا اور کوئی فرار کا راستہ ڈھونڈ لیتا ہے بقول وارث علوی:

"'لمبی لڑکی' اچھا افسانہ ہے، بیدی کو بھی پسند تھا، مجھے بھی پسند ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں کو یقیناً پسند آیا ہوگا۔ یہ نہ دادی کا افسانہ ہے، نہ پوتی کا نہ شادی بیاہ کا، نہ گھریلو نا چاقیوں کا، یہ افسانہ بھی موت کا ہی ہے۔موت آتی ہے پر نہیں آتی اور جتنی بار موت ٹلتی ہے،زندگی اپنی تمام خرافات کے ساتھ در آتی ہے ۔"(وارث علوی، 'راجندر سنگھ بیدی کے افسانے-ایک تعارف'؛کلیات راجندر سنگھ بیدی، ناشر قومی کونسل ۲۰۰۸ء)

موت کے حوالے سے بیدی ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"سب سے اچھی موت 'لمبی لڑکی' میں رُقمن دادی کی ہے جو اس وقت تک نہیں مرتی جب تک اپنی بن باپ کی پوتی، جو لمبی ہوئی جاتی ہے، کی شادی طے نہیں کرتی ۔ایک معنی میں رُقمن دادی نے افسانہ کو مر مر کر چلایا ہے اور جب پوتی کے ہاتھ پیلے ہو جاتے ہیں اور وہ گود میں منا سا بچہ لے کر آتی ہے تو دادی کی موت بھی آتی ہے ہوا کے کے جھونکے کی طرح، جس سے تپائی پر پڑی ہوئی گیتا کے پنے اڑنے لگتے ہیں اور وہاں آ کر رک جاتے ہیں جہاں شبد 'ساپت' لکھا ہوتا ہے۔ (وارث علوی، 'راجندر سنگھ بیدی کے افسانے-ایک تعارف'؛کلیات راجندر سنگھ بیدی حصہ اول، ناشر قومی کونسل ۲۰۰۸ء ص ۲۳)

'لمبی لڑکی' کے حوالے سے بیدی کے اسلوب پر ایک نظر ڈالنا ضروری بنتا ہے۔ظاہر ہے کہ 'لمبی لڑکی' بہت ہی طویل افسانہ ہے اور اس خامی کو نقادوں نے اپنے حدف کا نشانہ بنایا ہے۔ بہت سوں کا ماننا ہے کہ اس افسانے میں غیر ضروری تفصیلات اور فالتو کی جھاڑ جھنکاڑ شامل ہے۔اس بارے میں وارث علوی فرماتے ہیں:

''بیدی کے لگ بھگ تمام افسانے لفظوں کی کفایت شعاری کا عمدہ نمونہ ہیں۔ 'لمبی لڑکی' میں بھی اسراف زبان کا نہیں۔ 'لمبی لڑکی' میں جسے رطب و یابس کہا گیا ہے، وہ عبارت ہے واقعات، کردار، جزئیات اور مناظر کی افراط سے۔ لیکن اگر 'لمبی لڑکی' میں یہ افراط نہ ہوتی تو کہانی مرجاتی۔ اگر بالفرض اشکؔ کا یہ خیال درست ہے کہ 'لمبی لڑکی' میں تھیم کے انتخاب میں تھیم کی خامی رہ گئی ہے تو جو چیز اس خامی کو نباہ جاتی ہے وہ واقعات اور کرداروں کی وہی بھرمار ہے جسے حشو و زائد کہا جاتا ہے۔ اس جھاڑ جھنکاڑ کو نکال دیجیے تو لمبی لڑکی کی تھیم میں ایک اچھی کہانی بننے کی طاقت نہیں رہتی۔ گویا تھیم وہ بیج ہے جو کائی اور گھاس سے بھرے تالاب ہی میں کنول کی صورت کھلتا ہے۔.......عجیب بات یہ ہے کہ اتنے حشو و زائد کے باوجود لمبی لڑکی کی مرکزی تھیم نہ صرف برقرار اور نمایاں رہتی ہے بلکہ افسانہ کے مرکز ہی میں رہتی ہے۔''

(وارث علوی، 'راجندر سنگھ بیدی کے افسانے - ایک تعارف'؛ کلیات راجندر سنگھ بیدی حصہ اول، ناشر قومی کونسل دہلی ۲۰۰۸ء؛ ص ۳۱)

آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ممکن ہے کہ افسانہ 'لمبی لڑکی' میں طوالت کا احساس ہو مگر جس وقت اسے لکھا گیا تھا طویل افسانوں کا رواج عام تھا اور افسانہ نگار کی یہ کوشش رہتی تھی کہ افسانے کے ماحول اور اس میں پنپتے کرداروں کے ہر گوشے پر نظر رکھی جائے تاکہ افسانے میں کلیت کا احساس ہو ادھورے پن کا نہیں۔ اس دور میں کئی ایسے افسانے ملیں گے جن پر افسانے کے بدلے ناولٹ کا شبہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ افسانہ 'لمبی لڑکی' میں غیر ضروری واقعات کو جگہ دی گئی ہے، صحیح نہیں لگتا۔

راجندر سنگھ بیدی کے یہاں افسانہ فکر و تردد کا آئینہ بن جاتا ہے۔ وہ ہمیں زندگی کے مختلف شعبوں پر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور کہیں کہیں طنز کے تیر بھی ہمارے دماغ میں چبھوتے ہیں تاکہ وہ بیدار ہو۔ یہاں پر بیدی کی فکر و سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے چند قول درج کرتا ہوں:

☆''ہم عورتیں سبھی راج کی اچھا کیا کرتی ہیں پر جب مل جاتا ہے تو سر پیٹ لیتی ہیں۔''

☆''نصیبوں جلی عورت نہ جھکے تو اس دنیا کا چکر نہیں چلتا۔ نو یں سو گورا ہوئے۔ جو نیچا ہوتا ہے آخر وہی اونچا ہوتا ہے۔''

راجندر سنگھ بیدی اس کہانی میں بشر کی حماقتوں پر خوب خندہ زن ہیں۔ چھوٹے چھوٹے طمع، چھوٹی چھوٹی خودغرضیاں اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں ایک عام زندگی میں اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ حتمی موت کو بھی ٹالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دراصل وہ ہمیں پاس پڑوس سے آشنا کرنے کے متمنی ہیں جہاں عام سی زندگی ایک ندی کی طرح مدھم رفتار سے بہتی چلی جاتی ہے۔ وہ نہ ہمیں بسا ند بھرے کوٹھوں کی سیر کراتے ہیں اور نہ ہی مافوق الفطرت کرداروں سے تعارف کراتے ہیں۔ وہ نہ ہمیں اپنی تبحر علمی سے مرعوب کرتے ہیں اور نہ ہی نظریاتی الجھنوں میں ڈال دیتے ہیں۔ ان کا فن ادائیگی اتنا سیدھا سادا ہے کہ عام قارئین ان کی باتیں آسانی سے سمجھ جاتا ہے اور خود ان کی کہانی کا کردار بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'لمبی لڑکی' کی دادی بھی ہمیں اپنی زندگی میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موڑ پر مل ہی جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

==

کرشن چندر کی ذہنی تشکیل

--محمد اویس قرنی

محمد اویس قرنی کی تحقیقی کتاب بعنوان 'کرشن چندر کی ذہنی تشکیل' اردو کے مشہور و مقبول افسانہ نگار کرشن چندر کو ان کی صد سالہ سالگرہ پر بطور خراج عقیدت پیش کی گئی ہے اور وہ بھی پاکستان سے جہاں ان کے لاکھوں چاہنے والے اب بھی موجود ہیں۔ کتاب کی ضخامت اور مواد کو دیکھ کر یہ ظاہر ہے کہ یہ بہت محنت طلب کام رہا ہوگا۔ کرشن چندر، جن کی تقریباً ۱۰۰ رکتابیں، ۵۰۰ ر سے زائد افسانے، متعدد ڈرامے اور انشائیے شائع ہو چکے ہیں، کے فن اور شخصیت کو اپنے حصار میں لینا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ اس کے لیے قرنی مبارکباد کے حق دار ہیں۔ البتہ یہ ایک خوش آئند بات ہوتی اگر ان کی یہ کوشش دو ملکوں کے درمیان کی رسہ کشی سے قطع نظر ہماری مشترکہ میراث کا گن گان کرتی مگر کتاب کو پڑھ کر تاسف کے بغیر اور کچھ ہاتھ نہ لگا کہ ایسے مشہور ترقی پسند، مذہبی و مسلکی تعصبات سے حاجز، آفاقی سوچ اور انسانیت کے علم بردار فکشن نگار کی شخصیت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ 'کٹ اینڈ پیسٹ' کے اس دور میں کرشن چندر کی تحریروں سے صرف ایسے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں جن سے مصنف کا مدعا اور مخفی پیش نامہ پورا ہو جاتا ہے جبکہ اردو ادب کی اعلیٰ قدریں اور انسانیت کے مطالبات فوت ہوتے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس میں یا تو اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کی کوئی سیاسی مصلحت ہے یا پھر خود اپنے ذہنی تشخص، جو مصنف کو اندھیاری کی مانند اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتا، کا اظہاریہ ہے۔ پوری کتاب کرشن چندر کی شخصیت پر کم بلکہ محمد اویس قرنی کی شخصیت کا آئینہ بن کر سامنے آتی ہے۔ طوالت کے مدنظر میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ یہاں اس کتاب کے ہر مفروضے کا تجزیہ کرسکوں البتہ اس میں اٹھائے گئے چند اہم سوالات کا جواب دینا ضروری ہے۔

کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے: فکری جہتیں، سیاسی رجحانات، ذہنی میلانات، تقسیم

ہند، اورحرف آخر۔ پہلے باب میں کرشن چندر کی فکر کواشتراکیت سے زیادہ روحانیت کی طرف مائل دکھایا گیا ہے۔دوسرے باب میں ان کے سیاسی نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔تیسرے باب میں کرشن چندر کے مذہبی کردار کواجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ چوتھے باب میں تقسیم ہند کے وقت ہوئے قتل عام پر پاکستان کے تئیں ان کی ہمدردی کواجاگر کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے اس بات کی جانب اشارہ کرنا چاہتاہوں کہ محمد اویس قرنی نے اکثر کرشن چندر کو 'کرشن دا' لکھا ہے جس کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔لفظ 'دا' بنگال میں 'دادا' یعنی 'بڑے بھائی' کی تخفیف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور ممبئ میں کئی فلمی شخصیات کے ناموں کے ساتھ لگانے کا چلن ہے جیسے اشوک دا، بمل دا وغیرہ مگر یہ لاحقہ ہندستان میں خاص کر کرشن چندر کے پنجاب میں مستعمل نہیں ہے۔ممکن ہے گلزار کی کتابوں کا اثر ہو کیونکہ انھوں نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ بمل دا کا نام لیا ہے۔دوسرے یہ کہ مصنف نے اردو کے جانے پہچانے سرقہ باز جگدیش چندرودھاوان کی کتاب کے حوالے بار بار دیے ہیں جبکہ اس کی اوریجنلٹی مشکوک ہے۔منٹو پر لکھی گئی ان کی کتاب میں پیراگراف کے پیراگراف ڈاکٹر برج پریمی کی کتاب 'سعادت حسن منٹو-حیات اور کارنامے' سے نقل کیے گئے ہیں جس پر اخباروں اور رسالوں میں اس وقت کافی لے دے ہوئی تھی اور مناظر عاشق ہرگانوی اور دیگر نقادوں نے جگدیش چندر کی زبردست ملامت کی تھی۔اس کتاب کے سہارے مکالمہ کھڑا کرنا کوئی دانشمندی نہیں لگتی۔

حیرت اس بات کی ہے کہ کرشن چندر کے جنم اور جنم استھان پر اتنا بڑا تنازعہ کھڑا ہو گیا جب کہ ہندوؤں میں زائچہ بنانے کا رواج ہے اور بقول مصنف ان کی ماں کٹر ہندوعورت تھیں۔کرشن چندر خود لاہور کہتا ہے، بھائی بھرت پور کہتا ہے اور کوئی وزیرآباد کہتا ہے۔جنم دن ۲۳ رنومبر پر بھی سوال اٹھائے گئے ہیں۔اس سے بھی بڑی بات یہ کہ کرشن چندر کا یہ کہنا کہ ان کا بچپن کشمیر میں گزرا ہے، جس کی تائید ان کے بھائی اور دوست احباب کرتے آئے ہیں، سراسر غلط ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کا بچپن وادی کشمیر سے دور جموں کے علاقے پونچھ میں گزرا جس کو بقول ڈاکٹر گیان چند جین، سابقہ پروفیسر جموں یونیورسٹی، 'چھوٹا کشمیر' سے جانا جاتا ہے۔مطلب یہ کہ کشمیر کے بارے میں کرشن چندر نے جو بھی افسانے رقم کیے ہیں وہ دراصل پونچھ کے بارے میں ہیں، ان میں پونچھ کا سماجی، سیاسی اور معاشرتی منظرنامہ ملتا ہے نہ کہ کشمیر کی

وادی کا۔ ہاں کبھی کبھار وہ وادی کشمیر میں بحیثیت سیاح وارد ہوئے، سیاحوں کی طرح کشمیر اور کشمیریوں کی کسمپرسی کا اندازہ لگاتے رہے جبکہ صحیح معنوں میں وہ وہاں کے حالات سے بالکل واقف نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر برج پریمی اپنے مضمون 'پریم ناتھ پردیسی' (مشمولہ کشمیر کے مضامین، ص ۱۰۰) میں لکھتے ہیں کہ ''کرشن چندر کے وہ (پردیسی) مداح تھے لیکن کرشن چندر اور عزیز احمد نے جس طرح کشمیر کی زندگی کی غلط ترجمانی کی اور فرضی رومان تراش کر یہاں کی معصومیت کا مذاق اڑایا، پردیسی اس سے متنفر تھے۔ پردیسی کو ملال تھا کہ ان لوگوں نے اس قوم سے درد کا رشتہ پیدا نہیں کیا اور اس کا غم ٹٹول کر نہیں دیکھا جس نے اس کے انگ انگ کا رس چوس لیا تھا۔'' کرشن چندر کے اسلوب کو 'رومانی حقیقت نگاری' کہا گیا ہے۔ دراصل ان کے یہاں رومانس اس ماحول کی دین ہے جس میں وہ بچپن میں پلے بڑھے۔ جہاں برف سے ڈھکے پہاڑ تھے، قل قل کرتے جھرنے تھے، میوہ باغات تھے اور پرند و چرند تھے۔ ان کے اسلوب میں یہی سب کچھ رچ بس چکا تھا اور یہ اسلوب ان کے قارئین کو نشہ آور بنانے میں کامیاب ہوگیا۔

پونچھ میں، جہاں کرشن چندر کا بچپن بیتا، مسلمان آبادی کی کثرت تھی اور ہندو بہت کم تھے۔ اس لیے بچپن میں کرشن چندر کا باہمی عمل زیادہ تر مسلمانوں سے رہتا تھا اور اکثر دوست بھی اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ کرشن چندر مسلم معاشرے کے مثبت طور طریق کے ہمیشہ مدح خواں رہے اور ایک ہمہ جہت اور آفاقی افسانہ نگار کے لیے ایسا ہونا بھی چاہیے۔ البتہ قرنی کی یہ دلیلیں کہ وہ ہندوؤں سے نفرت کرتے تھے اور مسلمانوں کے دوست تھے حقیقت سے بعید ہے۔ قرنی نے جہاں عبداللہ کی باتیں کی ہیں وہاں بچپن کی ہم جولی چندر مکھی کا کہیں ذکر بھی نہیں کیا ہے کہ کس طرح اس نے بلک بلک کر جان دی تھی اور کرشن چندر کو تڑپتا چھوڑ گئی تھی۔ تعویزوں اور کرشموں، فقیروں اور قلندروں، قبروں اور مجاوروں کی باتیں کرنا بچپن میں ان کی سائیکی کا حصہ بن چکا تھا جس سے چھٹکارا پانا مشکل تھا۔ قرنی جس ماحول میں پلے بڑھے ہیں وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہندستان میں آج بھی ہزاروں لوگ دوسرے مذہب کے فقیروں اور درگاہوں میں حاضری دیتے ہیں اور منتیں مانگتے ہیں۔ بقول آچاریہ جے کرشنا مورتی: ''پیدا ہوتے وقت بچے کو نہ صرف جینیاتی وراثت ملتی ہے بلکہ اسے ہزاروں سالوں کی سماجی میراث بھی حوالے کی جاتی ہے جس سے چھٹکارا پانا مشکل ہوتا ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ ہمارے ترقی پسند قلم

کار عمر بھر اپنی مذہبی کینچلی چھینکنے میں ناکام رہے۔ بقول ساحر لدھیانوی ''وہ (کرشن چندر) کسی ایک قوم، ایک نسل یا ایک فرقے کا ادیب نہیں ساری انسانیت کا ادیب ہے۔'' اگر وہ مذہبی ہوتے تو کہیں خطبہ پڑھتے، مذہب کی ترویج میں حصہ لیتے، اس کے بدلے وہ ہر ترقی پسند مصنفین کانفرنس میں حصہ لیتے رہے۔

اس بات پر بھی دھیان دینا ضروری ہے کہ کرشن چندر کی ماں عام ہندوؤں کی طرح سناتنی تھی جو مورتی پوجا اور ہندو رسم و رواج میں پکا یقین رکھتی تھی جبکہ پتا جی آریہ سماجی تھے اور ان رسموں کے برخلاف۔ شاید قرنی کو آریہ سماج سے زیادہ واقفیت نہ ہو۔ یہ وہ مسلک ہے جو سوامی دیانند نے شروع کیا تھا، جس میں مورتی پوجا، فضول کرم کانڈ اور ذات پات کو ختم کرنے پر زور دیا گیا اور جو ہندو مسلمان بن چکے تھے ان کا شدھی کرن کر کے واپس ہندو بنایا جانے لگا۔ اس مسلک کا زیادہ اثر شمالی ہند میں رہا۔ پریم چند اس کے حامی تھے۔ کرشن چندر اور ان کے بھائی بہن جو پڑھے لکھے نئی نسل کے افراد تھے اس مسلک سے کافی متاثر ہو گئے۔ ماں تو کٹر مذہبی، روایت پرست، ان پڑھ، سخت گیر اور نظم و ضبط کی قائل تھیں، اس کے برعکس ان کے پتا جی تعلیم یافتہ، روایت شکن اور نرم مزاج تھے اس لیے یہ بات فطری تھی کہ وہ اپنے پتا جی کے بہت قریب رہے۔ رہا میاں بیوی کے اختلافات کا سوال، وہ کس گھر میں نہیں ہوتے، صرف چوپڑہ خاندان مستثنیٰ نہیں تھا۔ اسی تربیت کے زیر اثر کرشن چندر نے ہندو سناتن دھرم کی غلط رسموں کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ کثیر التعداد معبودوں اور ذات پات کے خلاف لکھتے رہے اور ان کے اس رویے میں مزید تیزی تب آئی جب وہ اشتراکیت سے وابستہ ہو گئے۔ اس میں کسی اور مذہب کے اثر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کرشن چندر ہندو معاشرے کے اہم رکن تھے اور اس کی بھلائی چاہتے تھے اس لیے ان کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس کی بہبودی کے لیے پریم چند اور دیگر ترقی پسند ادیبوں کی طرح ہی ہندو رسم و رواج، راجے مہاراجوں اور ٹھاکروں کی استحصالی کارروائیوں، برہمنی استحصال، کٹر پرستی، مہاجنی تہذیب، زمینداروں، جاگیرداروں، سیٹھوں اور ساہوکاروں کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائیں۔ وہ شاید مسلم معاشرے کی بدعتوں کے بارے میں بھی لکھتے مگر وہ اس سماج کے رکن نہیں تھے اس لیے اس پر لکھنے سے گریز کر لیا۔ چنانچہ ساحر لدھیانوی کرشن چندر کے بارے میں رقم طراز ہیں۔ ''معمولی سے معمولی واقعہ

اس کے جذبات میں ہل چل پیدا کر دیتا ہے اور پھر وہ چیخ اٹھتا ہے، سماج کے خلاف، مذہب کے خلاف، حکومت کے خلاف، یہاں تک کہ خود اپنے خلاف۔''

دیکھنا یہ بھی ہے کہ کرشن چندر نے مسلم سماج پر نرم رویہ کیوں اختیار کیا تھا۔ وجہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ایک تو یہ کہ اردو کے قارئین اکثر و بیشتر مسلمان تھے اور ان کی خوشنودی کا خیال ہر اردو قلم کار کو رہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلم معاشرے کی تنقید تو مسلمان افسانہ نگار کسی حد تک کر سکتا ہے مگر غیر مسلم افسانہ نگار کی ایسی کوشش کو فرقہ واریت کا لیبل لگایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ سمجھنا اہم ہے کہ کرشن چندر کا ہر کردار اس کا یا اس کے نظریے کا ماؤتھ پیس نہیں ہے بلکہ وہ صرف اپنی ترجمانی کرتا ہے جو کرشن چندر کی سوچ کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ بہت کم ایسے کردار ہوتے ہیں جو مقصدی ادب کے تحت اپنے خالق کی زبان بن جاتے ہیں مگر ان کی پہچان کرنا دقیقہ شناسی کا کام ہے۔ کرشن چندر کا تعامل ہندو دھرم، آریہ سماج اور اسلام سے براہ راست رہا جبکہ بالغ ہو کر انھوں نے اشتراکی اور وجودی فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کی مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ عملی آدمی تھے جو انسان کی بہبودی کے خواہاں تھے، نہ فلسفی تھے اور نہ ہی مذہبی پیشوا۔ سائنسی طریقہ کار ان کی تربیت کا حصہ نہیں تھا نہیں تو وہ یہ نہیں کہتے کہ ''سائنس کی حد جہاں ختم ہوتی ہے، وہاں سے مذہب شروع ہوتا ہے۔'' سائنس کے تئیں ان کی تشکیک سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہ بات تو مانتے ہیں کہ مذہب کی برعکس سائنس کسی بھی نظریے کو حتمی نہیں مانتا ہے اور یہاں دریافت و ایجاد کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ اسی حرکی سوچ کے نتیجے میں کرشن چندر کہتے ہیں ''انسان اس فلسفے کو کوڑے کے ڈھیر پر ڈال دیتا ہے...... ممکن ہے مارکسزم کو بھی ایک دن یہی کرنا پڑے۔'' بہر حال انھوں نے طبقاتی نظام کو نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ ترقی پسندوں کے منشور پر عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ بھوپال ترقی پسندوں کی کانفرنس میں انھوں نے کہا کہ ہمارے افسانوں میں غریب مزدوروں اور عورتوں کی عکاسی نہیں ہوتی۔ اس حوالے سے خواجہ احمد عباس فرماتے ہیں کہ ''کرشن چندر بالکل معمولی آدمی تھا۔ ہمارے آپ جیسا انسان جس نے اپنی زندگی میں بہت سے پاپڑ بیلے تھے۔ جرنلسٹ رہا تھا۔ ایڈیٹری کی تھی۔ کالج کے لڑکوں کو پڑھایا تھا۔ ریڈیو کی نوکری کی تھی۔ فلم ڈائریکٹ اور پروڈیوس کیا تھا۔ فلم کمپنی کا دیوالہ نکالا تھا۔ دوسرے پروڈیوسروں کے لیے 'ہٹ' سلور جوبلی تصویریں لکھی تھیں۔ بیکاری اور غریبی کے مزے چکھے

تھے۔ پریم بھی کیا تھا۔ (یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پریم بھی کیے تھے)۔ شادی بھی، شادیاں بھی۔ دل لگایا بھی تھا۔ توڑا بھی تھا۔ جوڑا بھی تھا۔ انقلابیوں کا ساتھ بھی دیا تھا۔ اور شاعروں کی محفل میں بھی وقت گنوایا تھا۔ وقت پڑنے پر کانگریسیوں کا ساتھ بھی دیا تھا، کمیونسٹوں کا بھی۔ وہ ہر ترقی پسند اور انقلابی پارٹی کے ساتھ تھا۔ وہ دھرم مذہب ذات پات کے بندھنوں سے آزاد تھا۔ سامراج اور فرقہ پرستی کا دشمن تھا، عوام اور اشتراکیت کا ساتھی تھا۔''

زیرِ نظر کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کرشن چندر کو اسلام سے جنون کی حد تک محبت تھی اور وہ ہندو مذہب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ساتھ ہی ان کا ذہنی میلان روحانیت اور درگاہوں کی جانب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی ہندو بیوی کو چھوڑ کر سلمیٰ صدیقی سے شادی کر لی۔ اس لیے وہ اصل میں مسلمان تھے۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ کرشن چندر ترقی پسند اور اشتراکی ذہنیت کے ادیب تھے۔ مصنف کا ص ۱۲۱ ر پر نقل کیا ہوا اقتباس غور سے پڑھیں جس میں کرشن چندر اشتراکیت کی بازگشت کرتے ہیں کہ ''میں ایک ایسا سماج چاہتا ہوں جہاں کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے، اور یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب سب انسان برابر ہوں۔ مساوات کے حامی ہوں۔'' اشتراکیت کی بنیاد جدلیاتی مادیت اور مارکسی نظریے کی دین ہے جس کے اہم ستون دہریت اور لادینیت ہیں۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ برصغیر ہندو پاک میں اشتراکیت محض روزی روٹی کا نظریہ بن کر رہ گیا۔ ہندو اشتراکی جنیئو پہن کر مارکس کی باتیں کرتے رہے اور مسلمان اشتراکی ختنہ کروا کے داس کیپٹل کو تکیہ بناتے رہے۔ انجام تو خیر بعد میں جو ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ خود کرشن چندر 'آئینہ خانے میں' میں فرماتے ہیں کہ ''حالانکہ میرا خیال ہے کہ ایک ادیب اتنا ہی جھوٹا، لپاڑیا، دھوکے باز، خود غرض، کمینہ اور تنگ دل ہوتا ہے۔ جتنا کوئی دوسرا آدمی ہوسکتا ہے۔ اور مجھ میں یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں۔'' بات صرف عمل کی نہیں ہے بلکہ طینت کی ہے اور کرشن چندر کو کئی بار بد خیالات نے گھیرا تھا جس کا اعتراف انھوں نے خود کیا ہے۔ بہر حال یہ بات ظاہر ہے کہ کرشن چندر اشتراکی نظریے کے قائل تھے اس لیے عالمی جنگوں سے متاثر ہونا اور فاشسٹ قوتوں سے مقابلہ آرائی فطری تھا۔ جہاں تک امن کی باتیں ہیں ہر کوئی وہ چاہے کرسچن ہو، مسلم ہو یا کمیونسٹ ہو، دنیا میں امن قائم کرنے کا دعویٰ کرتا ہے مگر اپنی شرطوں پر۔ ہر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ اسی کے

پاس عصائے موسیٰ ہے جسے دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے حالانکہ لاشعوری طور پر ہر کوئی نفاق پیدا کر کے جلتی پر آگ چھڑکتا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگار بھی امن کی باتیں اس لیے کرتے رہے کیونکہ روس اور چین ایسی باتیں کرتے تھے جبکہ دونوں مما لک اسلحہ اور تنصیبات بنانے میں مشغول رہے۔ بٹوارے کا ذکر ہنگامی حالات کا ردعمل تھا جس میں انسانیت کا جنازہ اٹھ گیا تھا۔ اس بارے میں کرشن چندر نے وہی سب کچھ لکھا جوان کو پاکستان سے آئے مہاجروں، اخبارات اور ریڈیو سے معلوم ہوا۔ انہوں نے تصور کی دنیا میں کھوکر اس کی عکاسی کی کیونکہ وہ ممبئی میں تھے اور اس سانحہ کا راست ان پر یا ان کے خاندان پر، جو دہلی میں قیام پذیر تھا، کوئی اثر نہیں پڑا۔ سنی سنائی باتیں تھیں جن کو انھوں نے کانٹ چھانٹ کر کے جذبات کی سان پر چڑھا کر اور اپنی نظریاتی عینک سے دیکھ کر قرطاس پر انڈیلا۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں کافی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ 'ہم وحشی ہیں' کے حوالے سے ان پر الزام لگایا گیا کہ انھوں نے ان تحریروں میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

جہاں تک کرشن چندر کی ازدواجی زندگی کا سوال ہے، اس کا کامیاب اور ثمر آور ہونا کسی مذہب سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ ہر مذہب میں شادیاں ہوتی ہیں، ٹوٹتی ہیں، 'قبول ہے' کی رسمیں ہوتی ہیں اور طلاق کے بول بھی پڑھے جاتے ہیں۔ پہلی بیوی سے دوری اور پھر سلمیٰ صدیقی سے دوسری شادی کا قصہ محض دو دلوں کے ان میل اور میل کا قصہ ہے کسی دینی اشتراک کی حکایت نہیں۔ یہاں یہ کہنا اہم ہے کہ آزادی کے بعد نہرو نے ہندوؤں کے ساتھ جو ظلم کیا اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ کوئی بھی ہندو عدالت سے باقاعدہ طلاق لیے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا ہے۔ اور طلاق لینے میں اس کی آدھی عمر چلی جاتی ہے جب تک وہ ذہنی تلاطم کا شکار ہوتا ہے۔ اس کی عکاسی میں نے اپنی کئی کہانیوں خصوصاً بٹی ہوئی عورت میں کی ہے۔ مگر فلم نگری ممبئی میں اس قانون کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ جن ہندوؤں کو دوسری شادی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی خود یا دونوں مرد اور عورت مسلمان بن گئے اور اپنے نام بدل دیے۔ مثال کے طور پر دھرمیندر اور ہیما مالنی، بونی کپور اور سری دیوی۔ نہ جانے ایسی سیکڑوں مثالیں ہوں گی جن کی تشہیر نہیں ہوئی۔ اسلام قبول کرنا محض مصلحت تھی مگر کرشن چندر نے عملی طور پر اپنا عقیدہ نہیں بدلا۔ اس حوالے سے رام لعل نے 'کرشن چندر تیرے روپ انیک' میں ۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ اس دن عصمت چغتائی کو گھر پر رام

لعل نے چائے پر بلایا تھا۔ سجاد، رضیہ، ستیش بترا، مسز انستیسیا اور مس وسیم موجود تھیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''انھیں دنوں یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ کرشن چندر نے اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں اردو افسانہ نگار سلمیٰ صدیقی کے ساتھ شادی کر لی۔ عصمت چغتائی سے اس شادی کے بارے میں پوچھا تو عصمت نے اس خبر کی تائید کی اور کہا کہ وہ بھی اس موقع پر موجود تھیں۔ میں نے پوچھا سنا ہے کرشن چندر نے اس شادی سے پہلے اپنا مذہب بھی تبدیل کر لیا تھا۔'' اس بات کی بھی انھوں نے تائید کی۔ میں نے کہا۔'' ان کا نام کیا رکھا گیا'' تو وہ مسکرا کر بولیں'' نام بدلنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کرشن چندر، کرشن چندر ہی رہیں گے۔'' رام لعل نے اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بڑی بے مروتی سے کیا ہے کہ کرشن چندر نے جوانی میں بیڈ پارٹنر یا جسمانی تسکین کے لیے پہلی بیوی کو بیس برس تک ساتھ رکھا، اس کا ذہنی شعور ترقی کر گیا جبکہ بیوی وہیں رکی پڑی رہی۔ پھر ذہنی رفاقت کے لیے سلمیٰ سے شادی کر لی 'مگر وہ بھی کہیں پیچھے ہی رہ گئی''۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین، ایک بار کرشن چندر نے رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں کہا۔ ''رشید صاحب کبھی میرا نام لینے کے روادار نہیں۔ میرا نام 'بمبئی' رکھ چھوڑا ہے۔ سلمیٰ کو خطوط میں یہ لکھ کر پوچھتے ہیں 'بمبئی والوں کا کیا حال ہے۔ بمبئی کا مزاج کیسا ہے؟ وغیرہ''۔ مطلب یہ کہ ان کی دوسری شادی ان کے سسر کو بھی قبول نہ تھی۔ اور پھر سلمیٰ کا یہ خاکہ بھی پڑھ لیں۔'' اس عظیم اور شہرۂ آفاق مصنف کا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں نہیں، بلکہ صرف کھانسنے، تھوکنے، یا اپنی عینک تلاش کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ عام طور پر بیماری یا مجبوری کے موقع پر کھانسا جاتا ہے، مگر کرشن چندر اپنے دل کے بہلانے، ذوق کی تسکین، اطمینان بخش وقت گزارنے کے لیے کھانستے ہیں۔'' (قلم کارٹون)

یہاں پر ایک اور جانب دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اگر کرشن چندر نے اسلام قبول کیا تھا اور وہ ہندو نہیں تھے (حالانکہ میں سمجھتا ہوں نہ ہندو تھے نہ مسلمان) تو انھوں نے عصمت چغتائی کی طرح اپنا وصیت نامہ درج کرایا ہوتا کہ انھیں بعد از مرگ قبر میں دفنایا جائے۔ ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی کہیں سے کوئی ایسی دلیل سامنے آئی کہ وہ دوسری شادی کے بعد صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ بقول دھرم ویر بھارتی (مضمون 'کرشن چندر') ان کے آخری رسوم ہندو ریتی رواج کے تحت سمپن ہوا تھا لکھتے ہیں۔'' اس دن شانت اور ابدی نیند میں سوئے ہوئے ان کے جسد خاکی کو گھر میں لا کر رکھا گیا، ہلدی کی ایک لکیر فرش پر

کھینچی گئی اور جاوید، شکیل، کلّو اور راہی چاروں طرف گنگا جل کی تلاش میں دوڑے۔ نگم صاحب، اوم، ریوتی اور مجروح بھائی انھیں کندھوں پر لے کر چلے۔'' شاید یہ پڑھ کر محمد اویس قرنی اپنا ارادہ بدل دیں کہ کرشن کی ارتھی ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ساتھ اٹھائی تھی کہ وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ اس میں ہوا میں اتنی زہرناکی نہیں تھی جو اس کے بعد مذہب کے ٹھیکیداروں نے اس میں بھر دی۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ کرشن کی بانسری دنیا بھر کی گوپیوں کے لیے خواب جگاتی رہی۔ وہ سیتا پر ہو رہے اتیاچار کے خلاف آنسوؤں سے افسانے لکھتے رہے اور حق کے لیے ہزاروں ارجنوں کو اسلحہ اٹھانے کے لیے غیرت دلاتے رہے۔ کیونکہ وہ عظیم انسان تھے اور انسانیت ہی ان کا مذہب تھا۔

☆☆☆☆☆

☆ محمد اویس قرنی؛ مصنف 'کرشن چندر کی ذہنی تشکیل'؛ ناشر: ملاقات پبلکیشنز، گل بہار، پشاور (پاکستان)؛ اشاعت: جون ۲۰۱۲ء؛ ضخامت: ۴۶۵ صفحات؛ قیمت: -/۴۰۰ روپے [پاکستان]؛ تبصرہ نگار: دیپک بُدکی

سعادت حسن منٹو۔ایک نئی تعبیر

--پروفیسر فتح محمد ملک

تقسیم ہند سے پہلے سعادت حسن منٹو افسانوی افق پر ایک درخشاں ستارے کی مانند ابھر آئے۔ چنانچہ وہ ڈی ایچ لارنس کی طرح اپنے زمانے سے کہیں آگے سوچتے رہے اور مروّج قدروں سے بغاوت کرتے رہے اس لیے انھیں ادبی محازوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے فن کی پرکاری، صلابت اور جمالیاتی خوبیوں کا صحیح طور پر جائزہ نہیں لیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ ان کو تنقید نگاروں کی برأت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ گذشتہ برس برصغیر ہند و پاک میں ان کی صد سالہ برسی منائی گئی مگر نہ وہ اہتمام اور نہ ہی وہ جوش و جنون نظر آیا جو غالبؔ اور اقبالؔ سے منسوب ہے۔ پابند مشرقی معاشرے میں ان کا نام آج بھی حرف ممنوع ہے اور ان کے افسانے نصاب سے خارج ہیں۔ البتہ حال ہی میں منٹو پر کئی تنقیدی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی پروفیسر فتح محمد ملک کی مذکورہ کتاب 'سعادت حسن منٹو۔ایک نئی تعبیر' بھی ہے۔ جس میں منٹو کے فکر و فن کو ایک نئی جہت عطا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بقول ملک ''اپنی وفات سے نصف صدی بعد بھی منٹو اپنے نقاد کے انتظار میں ہے۔''

فتح محمد ملک نے زیرِ نظر کتاب میں جہاں خود چھ مضامین رقم کیے ہیں وہیں انھوں نے 'ضمیمہ جات' کے تحت منٹو اور دیگر قلم کاروں کے دس مضامین بھی شامل کیے ہیں تاکہ ان کے اپنے خیالات، جو طے شدہ عقیدوں سے ہٹ کر ہیں، کی پشت پناہی ہو سکے۔

کتاب کے پہلے مضمون کا عنوان ہے 'منٹو کی پاکستانیت'۔ مصنف نے اس مضمون میں حتی الامکان کوشش کی ہے کہ میرِ جنسیات منٹو کو اس مذہبی نظریے کا حامی ثابت کرلے جس کی بدولت پاکستان وجود میں آگیا۔ یہ سچ ہے کہ منٹو بٹوارے کے بعد پاکستان چلے گئے مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان جانا ان کی سوشل مجبوری تھی۔ وہ پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے رشتے دار

سب ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ ہر طرف نفرت ولا چاری کا عالم تھا جس میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو اور سکھ بھی برابر تہ تیغ ہو رہے تھے۔ پھر وہ ایسے عدم تحفظ کے ماحول میں کیوں کر اپنی دھرتی اور اپنے رشتے داروں سے دور ممبئی میں رہنا پسند کرتے۔شیام کے ساتھ ہوئی معمولی سی ظریفانہ چشمک کو فتح محمد ملک نے بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے جبکہ اس مکالمے میں چھپا ظریفانہ پہلو اجاگر نہیں ہوا ہے۔ اگر اس بات میں سچائی ہوتی تو شاید منٹو کراچی پہنچ ہی نہیں پاتے کیونکہ ان کے اکثر دوست ہندو تھے۔ علاوہ ازیں منٹو ہی کیا، ممبئی میں اور بھی سیکڑوں مسلمان ادیب تھے جو بٹوارے کے بعد بھی اپنی زمین سے جڑے رہے اور پھلتے پھولتے رہے۔ آج تک کسی نے ان کا بال بھی بیکا نہ کیا۔ اس ایک معمولی واقعے کو ہجرت کا سبب بتانا اور ہندو دوستوں کی سیکڑوں مہربانیوں کو بھلا دینا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ ان مہربانیوں کا ذکر کرنے کا یہاں پر محل نہیں ہے۔ البتہ یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس منٹو نے عمر بھر اسلامی قوائد کی پیروی نہیں کی، نہ کبھی نماز پڑھی اور نہ روزے رکھے، ساری زندگی سگریٹ نوشی اور شراب نوشی میں صرف کی، اس فرائیڈ کے چیلے کی سرشت مذہب پر استوار پاکستانی معاشرے میں کہاں کھپ جاتی۔ ان پر جتنے بھی مقدمے چلے سب کے سب پاکستانی شہروں میں چلائے گئے اور پھر اسی پاکستان میں وہ ایک شراب کی بوتل کے عوض اپنے فن کو بیچتا رہا، دس روپے یومیہ اُجرت پر کالم لکھتا رہا اور آخر کار ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ پاکستان کے حکمرانوں اور ادیبوں کو اس پر ذرا بھر بھی ترس نہ آیا نہیں تو ایسے نامور ادیب کو کوئی گورنمنٹ ملازمت دی جا سکتی تھی۔ میں اس مفروضے پر لبیک کہتا کہ منٹو کی روح پاکستانی تھی اگر منٹو نے ہجرت سے پہلے پاکستان کے حق میں افسانے یا مضامین لکھے ہوتے یا پھر محمد علی جناح کی کھل کر حمایت کی ہوتی۔ پاکستان جا کر ان پر تعریفی مضمون لکھنا اور نہرو اور ہندستان کے خلاف لکھنا فطری بات ہے جسے زمانہ سازی کہا جا سکتا ہے۔ خود مصنف صفحہ ۱۱ ار پر اس بات کا احیا کرتے ہیں کہ منٹو آفاقی طرز فکر اور سوچ کے ادیب تھے مگر اس وقت کے حالات نے انھیں پاکستان جانے کے لیے مجبور کیا۔ مصنف اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ آخر کار وہ پاکستان نہیں بن سکا جس کی آرزو لے کر مسلمان سر پر کفن باندھ کر چلے تھے۔

دوسرے مضمون کا عنوان ہے 'منٹو اور جنگِ آزادیِ کشمیر'۔ کشمیر سے متعلق منٹو کی نگارشات مثلاً یزید، ٹیٹوال کا کتا، دو قومیں وغیرہ بھی اسی مصلحت کا نتیجہ تھیں تا کہ وہ ایسی نگارشات سے مذہبی جنون میں

گھرے لوگوں کے بیچ اپنی ساکھ بنا سکے اور اپنی روزی روٹی کی سبیل کر سکے نہ کہ وہ منٹو کے ایقان کا انجام تھیں جیسا کہ ملک صاحب بتلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہاوت ''نیا مُلّا مسجد کو دوڑ دوڑ جائے'' اس دور کے منٹو پر صادق آتی ہے۔ منٹو کشمیری تھے اس بات میں کوئی شک نہیں مگر وہ جموں کے ضلع بٹوت سے آگے کبھی گئے ہی نہ تھے۔ انھوں نے کشمیر کے بارے میں اپنے اسلاف سے ماضی کی روداد سنی تھی جبکہ خود زمینی حقیقت سے نابلد تھے۔

ظاہر ہے کہ ملک صاحب کے یہاں عسکری کی طرح مذہب پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہے جس کا نتیجہ ان کا مضمون 'انقلاب پسند اور نام نہاد ترقی پسند' ہے۔ انھوں نے ترقی پسندوں پر برسوں کا جمع کیا ہوا غصہ اتارا ہے۔ پاکستان میں ترقی پسند قلم کاروں جیسے فیض کا کیا حشر ہوا کسی سے چھپا نہیں ہے۔ جوش ملیح آبادی نے بھی پاکستان کے بارے میں اپنی سوانح 'یادوں کی برات' میں کافی کچھ لکھا ہے۔ کئی ادیب تو پاکستان جا کر وہاں سے بیزار ہوئے اور ہندستان لوٹ آئے مگر منٹو گرتی صحت، مالی دشواریوں اور رشتے ناتوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے حالانکہ ان کے وہی دوست جن پر ان کو دھکا نے کی تہمت لگائی جاتی ہے انھیں واپس بلاتے رہے اور مالی امداد بھی کرتے رہے۔ دیکھا جائے تو منٹو نے ادبی زندگی کی ابتدا ترقی پسندی اور روسی قلم کاروں کے قصیدے لکھ کر کی تھی مگر بچپن ہی سے ان کا رجحان عیاشیوں اور خرافات کی جانب رہا جس کی وجہ سے وہ اپنے خاندان میں بھی معتوب ٹھہرے اور پھر ممبئی کی راہ لے کر قحبہ خانوں اور شراب نوشی کی طرف راغب ہو گئے۔ انھیں دنوں فرائیڈ کا نظریۂ حیات اپنے عروج پر تھا جس سے منٹو کافی متاثر ہوئے اور وہ اسی راہ پر گامزن ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ ترقی پسندوں نے اس سے دوری اختیار کر لی۔ دیکھا جائے تو منٹو مرتے دم تک غریب طبقے کے ہمنوا رہے اور اس حساب سے ترقی پسند رہے۔ کہیں پر بھی انھوں نے مذہب کی آڑ میں کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ جنسی کجرویوں پر لکھے ہوئے افسانے ان کی طبعیت کو ہمیشہ راس آئے اور ممبئی اس کے لیے زرخیز زمین ثابت ہوئی۔

مضمون 'منٹو کی فکری صلابت اور نظریاتی استقامت' میں رائٹر نے منٹو کے چند غیر افسانوی تحریروں کا حوالہ دے کر وہی راگ الاپنے کی کوشش کی ہے کہ منٹو کو پاکستان بننے کی بے انتہا خوشی ہوئی۔ بھلا ملک صاحب ہی یہ بتائے کہ پاکستان میں رہ کر جناح صاحب کا خاکہ لکھتے وقت ان کی تعریف نہ

کرتے تو اور کیا کر سکتے تھے۔ یہ خاکہ منٹو کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔ منٹو نہ گاندھی سے ذاتی طور پر ملے تھے، نہ نہرو سے اور نہ ہی جناح سے۔ انھیں ایسی سیاسی شخصیات سے کبھی قربت حاصل نہیں ہوئی۔ پھر وہ ان پر معروضی سوانحی خاکے کیسے لکھ پاتے؟ یہ خاکہ موقع پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہاں منٹو کو، جو فلم کمپنیوں میں منشی کا کام کرتے تھے، ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا..... طوائف جدن بھائی سے، ان کی بیٹی نرگس سے، اشوک کمار سے، ایکٹریس نسیم سے، کے کے (کلونت کور) سے اور ترقی پسند ادیبہ عصمت چغتائی سے۔ اس لیے ان پر لکھے ہوئے خاکوں میں معروضیت صاف عیاں ہے۔

'ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ایک نئی تعبیر' میں بھی مصنف نے اس افسانے کو ایک نئی خود ساختہ خورد بین سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور من گھڑت بات کو منوانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ وہ اس افسانے کی روح تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو فکری اور نظریاتی بیڑیوں میں جکڑتے ہیں۔ ایک قلم کار آفاقیت کا علمبردار ہوتا ہے۔ وہ اگر فرقہ وارانہ فسادات پر بھی لکھتا ہے یا کسی فرقے کے ظلم یا مظلومیت کی نشاندہی کرتا ہے تو اس میں بھی اسی آفاقی نظریے کی زیریں لہر ہوتی ہے۔ منٹو کا یہ افسانہ انسانی رواداری کا منشور ہے۔ اس میں دھرتی سے بچھڑنے کا کرب ہے، بے گھری کا نوحہ ہے۔ اس میں نہ اشتراکیت پسندی ہے اور نہ ہی وطن پرستی، نہ سیکولرازم ہے اور نہ ہی مذہب پرستی۔ البتہ مضمون 'منٹو کی مثالیت پسندی' میں تنقید نگار نے منٹو کے ان نظریات کی طرف اشارہ کیا ہے جن کو ہم نظر انداز کرتے آئے ہیں اور جن پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

کتاب میں جو ضمیمہ جات شامل کیے گئے ہیں وہ پروفیسر فتح محمد ملک نے اپنے نظریے کی تائید میں اکٹھا کر کے پیش کیے ہیں۔ یہ چنندہ مضامین منٹو کی مکمل شخصیت پر روشنی نہیں ڈالتے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر دیگر ادیبوں اور نقادوں کی آراء سے بھی استفادہ کیا گیا ہوتا۔

زیر نظر کتاب منٹو کے فکر و نظر پر کم بلکہ پروفیسر فتح محمد ملک کے فکر و نظر پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔ اس لیے اس کا مطالعہ کرنا ضروری بن جاتا ہے تاکہ سوچنے کا دوسرا رخ بھی سامنے آئے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو جاننا اور اس کی قدر کرنا ہر اچھے قاری کے لیے ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی اردو

حلقوں میں خوب پذیرائی ہوگی۔

☆☆☆☆☆

☆پروفیسر فتح محمد ملک؛ مصنف: 'سعادت حسن منٹو-ایک نئی تعبیر'؛ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶، اشاعت: ۲۰۱۳ء؛ ضخامت ۱۷۶ صفحات؛ قیمت ۲۰۰ روپے؛ مبصر: دیپک بُدکی